مولانا وحید الزماں کیرانوی
حیات و خدمات
ڈاکٹر مہ جبین اختر
عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا وحید الزماں کیرانوی

حیات و خدمات

ڈاکٹر مہہ جبین اختر

شعبہ عربی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا وحید الزماں کیرانوی

کتاب کا نام : مولانا وحیدالزماں کیرانوی - حیات وخدمات

MOULANA WAHEEDUZZAMA KEERANVI
HIS LIFE AND WORK

مصنفہ : ڈاکٹر مہہ جبین اختر

DR. MEHJABEEN AKTHER

Associate Professor
Department. of Arabic,
Osmania University, Hyd.
Cell : 9440736311

قیمت : 300روپے

زمانہ اشاعت : 2011-12

کتابت : جلال الدین اکبر اردو کمپیوٹر سنٹر

طباعت : عائشہ آفسیٹ پرنٹرس روبرو فائر اسٹیشن، جدید ملک پیٹ، حیدرآباد۔۳۶
فون:9346338145, 9391110835, 65871440

ملنے کے پتے

۱۔ شعبہ عربی : ویمنس کالج کوٹھی، حیدرآباد

۲۔ ہمالیہ بک ڈپو : نامپلی، حیدرآباد

۳۔ دارالکتاب : میور کنٹل کامپلکس، عابڈز، حیدرآباد

۴۔ ھدی بک ڈپو : پرانی حویلی، حیدرآباد

انتساب

بابا

الحاج سید نصیرالدین پاشاہ مرحوم

کے نام

جن کی یاد کسک بن گئی ہے۔

جن کی علمی سرپرستی نے مجھے لکھنا سکھایا۔

اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے

اور

جنت الفردوس عطا فرمائے۔

(آمین)

فہرس

پیش لفظ

قدرت کا دست فیاض جیسے نوع بہ نوع پیڑ، پودوں اور پھل پھول کو وجود میں لاتا رہتا ہے اور اس کارگاہ میں مسلسل یہ عمل جاری ہے، اسی طرح تاریخ میں باصلاحیت افراد اور عبقری شخصیتوں کا بھی تسلسل ہے، کچھ شخصیتیں تاریخ کا حصہ ہوتی ہیں اور کچھ شخصیتیں خود تاریخ کو وجود میں لاتی ہیں، کچھ لوگ بنے بنائے راستے پر چلنے کے خوگر ہوتے ہیں اور کچھ لوگ کوہ ونگ کو تراش کر خود راستہ بناتے ہیں، ایسی ہی کوہ کن شخصیتوں میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی تھے۔

وہ ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ کامیاب استاذ بھی تھے، اعلیٰ درجہ کے منتظم بھی، زبان وادب کے رمز شناس بھی، تعلیم وتربیت کے فن میں یکتائے روزگار بھی، سحر انگیز خطیب بھی، اور زبان وقلم کی آبرو بھی، اور کوچۂ سیاست سے بھی ناآشنا نہیں تھے، انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں اجلاس صد سالہ کے موقع سے تعمیر وتنظیم کے باب میں جس حسن انتظام کا مظاہرہ کیا وہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے، پھر مددگار مہتمم کی حیثیت سے جو اصطلاحات کیں اور جن کے لئے کوشاں رہے، وہ بھی ایک مثالی کام ہے، انہوں نے ملی جمعیت علماء کی بھی بنیاد رکھی، افسوس کہ اس وقت تک مولانا کی عمر کا آفتاب لب بام آچکا تھا، اس لئے وہ اسے اپنی منشاء کے مطابق پروان نہیں چڑھا سکے۔

لیکن ان کا اصل ذوق علم وتحقیق اور تالیف وتدریس کا تھا، انہوں نے ''القاموس الجدید'' لکھ کر عربی وادب کے اساتذہ وطلبہ کے ہاتھ میں گویا کلید علم تھمادی، نہ جانے کتنے ایڈیشن اس

کے شائع ہوئے اور دنیا میں کہاں کہاں تک علم و زبان کی یہ سوغات پہنچی پھر اپنی عمر کے اخیر حصہ میں "القاموس الوحید" (دو جلدیں) تالیف فرما کر انہوں نے اردو پر ایسا احسان کیا جس سے عربی زبان کا کوئی طالب علم سبک بار نہیں ہو سکتا۔

مولانا کا سب سے بڑا امتیاز افراد سازی اور مردم گری کی صلاحیت تھی، وہ جس مٹی کو ہاتھ لگاتے سونا بن جاتی، اور جس پتھر پر انگلی رکھتے وہ ہیروں کو شرمندہ کرتا، مولانا کی سبکدوشی سے پہلے کے پچیس سال کے عرصہ میں جو طلبا دار العلوم سے فارغ ہوئے ہیں اور انہوں نے علم تحقیق اور دعوت و تعلیم کے میدان میں کوئی نمایاں کام کیا ہے تو وہ زیادہ تر آپ ہی کے تربیت یافتہ اور آپ کے فیض صحبت سے ہمکنار لوگ ہیں، وہ ہمہ جہتی تربیت کرتے تھے، تعلیمی بھی، اخلاقی بھی، زبان کی بھی اور تہذیب و ثقافت کی بھی، انہیں ہونہار طلبا اور کارکرد فضلاء سے ایسی محبت تھی جیسے ایک شفیق باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، وہ اپنے شاگردوں کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ اور اثاثہ سمجھتے تھے، اور میرے خیال میں یہی کامیاب اور مخلص استاذ کا سب سے بڑا وصف ہے۔

اس حقیر کو ان سے باضابطہ تلمیذ کا شرف حاصل نہیں رہا، لیکن ان کی صحبت میں بیٹھنے، ان کے طریقۂ تربیت کو سمجھنے اور استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، طالب علمی کے آغاز ہی سے مولانا کیرانوی کا نام ذہن کے افق پر ثابت تھا اور ان کی کتابوں کے واسطہ دیدار کا آرزومند بھی تھا، انہیں دیکھ کر طبیعت کھنچتی تھی، پتلا دبلا چھریرا بدن، قد و قامت بلند، کھلا ہوا رنگ اور اس پر چیچک کے چند داغ، ہلکی داڑھی، سفید اور صاف و شفاف کرتا پاجامہ زیب تن، بٹن ہمیشہ لگے ہوئے، اور کالر ایک دوسرے سے پیوستہ، گاہے کشتی نما اور گاہے دو پلی ٹوپی، ایسے وقار اور سکون سے چلتے گویا باد نسیم کا قافلہ آگے بڑھ رہا ہے، گفتگو میں سلیقہ اور مخاطب کا لحاظ، ہنسنا ہوتا تو مسکراتے، تقریر ایسے کرتے گویا ذہن سے غنچہ گل نکل رہے ہوں، اردو میں خوب کہتے اور عربی میں خوب تر، اور اگر کسی بات پر غصہ آگیا تو تقریر کا لطف دوبالا ہو جاتا گویا الفاظ

کے شہاب ثاقب کی بارش ہو رہی ہو۔

مزاج میں بے حد شفقت، محبت اور رحم دلی تھی، اور اسی انفعالی کیفیت کی وجہ سے ایک گونہ زود رنجی بھی تھی، جس بات کو حق سمجھتے اسے پوری قوت سے کہتے، نہ ملامت کا خوف کرتے نہ جبر و دباؤ سے گھبراتے، انہیں محبت سے تو جھکایا جاسکتا تھا لیکن وہ ایسے موم تھے جسے ظلم و جور کی آگ پگھلا نہیں سکتی تھی، اس انفعالی کیفیت کی وجہ سے بہت دنوں ایک گروہ انہیں اپنے مفاد کیلئے استعمال کرتا رہا، لیکن وہ اپنی ذات سے مخلص تھے، انہوں نے طوفان میں ساتھ دیا جب کوئی بھنور آیا تو اپنے آپ کو آگے رکھا لیکن جب کاروان ساحل مراد پر پہنچا تو انہوں نے اس نیا س کاروان کو خیر آباد کہا، اور زبان و دل کی رفاقت کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔

مولانا کیرانوی پر ترجمان دارالعلوم نے بہت ہی اچھا نمبر نکالا، اور واقعی یہ ایک دستاویزی شمارہ ہے، پھر مولانا کی شخصیت سازی اور تربیت کے پہلو پر ان کے شاگرد رشید اور تلمیذ وفا شعار مولانا نور عالم خلیل امینی نے "وہ کوہ کن کی بات" کے نام سے مستقل کتاب تالیف کی، جسے اہل علم کے درمیان اور خاص کر مولانا کے تلامذہ میں بڑا قبول حاصل ہوا، لیکن اب بھی مولانا کے تذکرہ پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت باقی تھی جو سوانحی تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے میری دینی بہن محترمہ ڈاکٹر مہہ جبین اختر صاحبہ (پروفیسر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) کو کہ یہ فرض جو ہم لوگوں پر عاید ہوتا تھا اس کو انہوں نے ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، انہوں نے اپنی اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں سماجی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کا تذکرہ ہے، دوسرے باب میں مولانا کی انفرادی زندگی پر روشنی ڈالی گئی، تیسرا باب مولانا کے مدرسانہ مرتبہ و مقام اور طریقۂ تدریس پر ہے، جو ان کی زندگی کا سب سے امتیازی پہلو تھا، چوتھے باب میں منتظم کی حیثیت سے آپ کا ذکر ہے، چھٹے باب میں تدوین لغت کے سلسلہ میں آپ کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس پہلو کا تفصیلی تعارف کرایا گیا، ساتواں باب شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ذاتی حالات

پر مشتمل ہے، آٹھویں باب میں مولانا کے معاصرین کا ذکر ہے جس میں مولانا کے بزرگ بھی ہیں، رفقاء بھی اور خاص طور پر مولانا کیرانوی کی دار العلوم سے علیحدگی اور اس سلسلہ میں معاصرین کے رویہ پر بات کی گئی ہے اور دسواں باب اختتامیہ ہے، جس میں مولانا کی شخصیت کا اجمالی جائزہ اور پوری کتاب کا خلاصہ ہے۔

بحمد للہ کتاب مولانا کیرانوی کی مکمل سوانح ہے، جس میں ان کی زندگی کے تمام پہلو آگئے ہیں، نہ اتنا طول کلام ہے کہ اکتاہٹ پیدا ہو جائے اور نہ ایسا ایجاز و اختصار ہے کہ قاری کو تشنگی کا شکوہ ہو، زبان شستہ، شائستہ اور رواں ہے، اور تحریر سے اس بات کا بار بار احساس ہوتا ہے کہ سوانح نگار کو صاحب سوانح سے بے حد محبت اور عقیدت کا تعلق ہے لیکن اس کے باوجود کتاب غلو سے خالی ہے اور مدح و توصیف کے ساتھ امانت سمجھ کر قابل تنقید پہلوؤں پر بھی تنقید کی گئی ہے، اور اس گفتگو میں بھی وقار و متانت کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

میرے لئے اس کتاب پر پیش لفظ لکھنا بجائے خود بڑی سعادت ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول عطا فرمائے، اس کتاب کے ذریعہ ایک مرد غیور کی زندگی کے جو روشن نقوش ہیں ان سے نئی نسل کو روشنی حاصل کرنے کی توفیق ہو اور کتاب کی مصنفہ جن کے قلم سے کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، کو بہتر سے بہتر اجر مرحمت فرمائے، قلم کے اس مسافر کے پاؤں کبھی تھکنے نہ پائیں، اور ان کی تالیفی زندگی کی صبح ایسی ہو جس کی شام بہت دیر سے آئے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان.

خالد سیف اللہ رحمانی

(ناظم المعہد العالی اسلامی حیدرآباد، جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

2011

مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک نظر

نام : مولانا وحید الزماں ابن مولانا مسیح الزماں

نھیالی نام : قمر الزماں

ولادت : کیرانہ۔ ضلع مظفر نگر، یوپی، بتاریخ ۱۷ر فروری ۱۹۳۰ء

تعلیم : کیرانہ، حیدرآباد، اور دار العلوم دیوبند (فراغت: ۱۹۵۲)

۱۹۵۹ میں عربی اور انگریزی تعلیم کے لئے دیوبند میں دار الفکر قائم کیا۔ ۱۹۶۳ء میں دار العلوم میں بحیثیت استاذ عربی تقرر ہوا۔ دار العلوم سے ۲۷ سالہ وابستگی کے دوران مختلف النوع عظیم الشان کارنامے انجام دیئے جن میں عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت، اجلاس صد سالہ کیلئے بنائی گئی مختلف کمیٹیوں کی سربراہی، دار العلوم کی مختلف عمارتوں کی ترمیم وتزئین اور تعمیری جدید اور اجلاس کے بعد تحریک اصلاح وانقلاب کی کامیاب قیادت شامل ہے۔ انقلاب کے بعد ۱۹۸۳ء میں ناظم مجلس تعلیمی اور ۱۹۸۵ء میں معاون مہتمم کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ ۱۹۸۸ء میں دار المولفین کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا جس سے تقریبا دو درجن کتابیں شائع ہوئیں۔

صحافتی خدمات

اردو ماہنامہ القاسم سہ ماہی عربی مجلہ دعوۃ الحق، پندرہ روزہ عربی الداعی اور پندرہ روزہ

عربی الکفاح کا اِجرا و اِدارت۔

تصنیفات مطبوعہ

تقسیم ہند اور مسلمان (اردو سے عربی ترجمہ) خدا کا انعام، اسلامی آداب، انسانیت کا پیغام، آخرت کا سفر نامہ، شرعی نماز، اچھا خاوند، اچھی بیوی، القراۃ الواضحہ تین حصے مع شرح، القاموس الجدید اردو عربی، القاموس الجدید عربی اردو، القاموس الاصطلاحی عربی اردو، القاموس الاصطلاحی اردو عربی، نفحۃ الادب، مع شرح، جواہر المعارف، القاموس الوحید (دو جلد)۔

تصنیفات غیر مطبوعہ

القاموس الموضوعی، نخبۃ الاحادیث، جواہر المعارف جلد دوم۔

عہدے اور مناصب

رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند، شدر ملی جمعیۃ علماء ہند، صدر مرکزی جمعیۃ علماء ہند، رکن عاملہ تنظیم ابنائے قدیم، معتمد دار المولفین، ڈائرکٹر مرکز دعوت اسلام، ممبر کورٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

بیرونی اسفار

سعودی عرب، کویت، قطر، بحرین، متحدہ عرب امارات، مصر، ری یونین، انگلینڈ، فرانس، ماریشیس، بنگلادیش۔

وفات: ۱۵/اپریل ۱۹۹۵ء

حرفِ آغاز

سیرت نگاری اور شخصیت نگاری میں فرق ہے حالانکہ انگریزی میں Biography (بایوگرافی) اور Personal-Sketch میں کوئی فرق نہیں ہے اور Biography میں Personal Sketch شامل ہو جاتا ہے' سیرت نگار کسی شخصیت کو اس کے پورے پس منظر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ ایک انسان میں نجانے کتنے انسان چھپے رہتے ہیں۔ ان کے چہرے کبھی کبھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آسکتے ہیں' ان کا سماجی چہرہ' زندگی کا معاشی رخ' انکے علمی خدوخال، انکے نقائص' ان کے عیوب سب اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں مگر ایک زیریں پرت ہوتی ہے جو ان تمام گوشوں کو ایک ہی لڑی میں پروتی ہے اور اسی سے سیرت یا شخصیت بنتی ہے کوئی شخصیت ایک دم سے اچھل کر ربر کے گیند کی طرح سامنے نہیں آجاتی ہے بلکہ وہ ایک ایسا سانچہ ہے جسے زمان ومکان کی آگ تپا کر خدوخال دیتی ہے:

شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے معروضیت کو ذہن نشین رکھنا چاہئے ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تعصبات' تعلقات تاثرات اس شخصیت کو اس طرح سامنے نہ لائیں جیسی وہ تھی بلکہ بالکل نئی شخصیت وجود میں آجائے۔ عموماً کسی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہوئے ہیرو پرستی کا جذبہ ابھر آتا ہے اور اس میں ایسے صفات بھی تلاش کر لئے جاتے ہیں جو اس میں نہیں تھے۔ اس کے نقائص کی پردہ پوشی کی جاتی ہے اور اپنی دانست میں ایک خوبیوں کا پیکر تلاش کر کے قاری کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝"

لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ خالق کائنات کی تخلیق میں اپنے انداز سے ترمیم کر کے خالقیت کا دعویٰ کریں گے۔ مگر یہ ممکن نہیں ہے انسان میں دونوں رخ ہیں اس کے مکرم و متقی ہونے کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ کون سا امر اس کی شخصیت میں غالب عنصر رکھتا ہے خیر...... یا شر' نیکی یا بدی' اچھائی یا برائی۔ پس جو عنصر غالب ہوتا ہے وہی انسان کی شناخت و پہچان بن جاتا ہے اور یہی معروضیت ہے۔ اور شخصیت نگار کو اسی کا خیال رکھنا چاہئے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کسی کے معائب بیان کرنے سے فائدہ کیا اگر کمزوریاں و معائب تھے تو پھر قلم اٹھانے کی ہی کیا ضرورت تھی......؟

دراصل سیرت نگار کا مقصد ہوتا ہے آئینہ سازی...... وہ دوسروں کے کردار کا آئینہ اس طرح بناتا ہے کہ تاریخ اور تاریخ کے ذریعہ افراد اس آئینہ میں اپنی شکل و صورت دیکھ سکیں۔ اپنے حال کو سنوار سکیں اور اپنے مستقبل کے لیے راہیں ہموار کر کے متعین کر سکیں۔

لیکن سیرت نگار کے لیے یہ ہے بہت مشکل کام......!

اگر وہ قصیدہ پڑھتا چلا گیا تو اس کے بھانڈ بن پر نقاد کی ہجو سامنے آ گئی اور اس طرح کی قیاس آرائی ہونے لگی کہ اس نے ضرور کچھ نہ کچھ مالی فائدہ حاصل کیا ہے یا اسے عہدہ یا منصب ملا ہے یا پھر اسے مذہبی عصبیت نے اندھا کر دیا ہے۔

ظاہر ہے جس شخصیت پر قلم اٹھایا گیا یقینی طور پر اس کے کچھ مخالف بھی رہے ہوں گے، اس قصیدہ نگاری پر ان کی تیوریاں چڑھیں گی' اور دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر اس نے مذاق عام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حق کی خاطر سچ لکھ دیا تو پھر ادھر حرف حق بلند ہوا اور ادھر لکھنے والے کے لیے دار و رسن کے مرحلے تیار ہو گئے کمانیں سنبھالی گئیں۔ تیر جوڑے گئے۔ ہدف تیار ہوا اور تیر بارانی شروع ہو گئی۔ لیکن وہ جو سچ لکھتے ہیں' جو صداقت کے پرستار ہیں ان کی

تحریر کے آفتاب کو کبھی گہن نہیں لگ سکتا اور کچھ بھی ہوا نہیں یہ سکون تو رہتا ہی ہے کہ انہوں نے اپنے علم و یقین کی بنیاد پر قلم کی طہارت کو برقرار رکھتے ہوئے اخفاء حق نہیں کیا۔

اردو میں سیرت نگاری کے بعض بہت اچھے نمونے بزرگوں کے یہاں ملتے ہیں، وہ جو شعراء کے تذکرے لکھے گئے ان میں کہیں کہیں تو ایک سطر سے کام چلا لیا گیا ہے مگر جہاں کہیں طبیعت نے جولانی دکھلائی ہے وہاں سیرت کے مدھم ہی سہی نقوش ضرور ملتے ہیں اس سلسلہ میں آب حیات میں مولینا محمد حسین آزاد کا مختلف شعراء کے سلسلہ میں بیان سیرت نگاری کی ہلکی سی جھلک دکھاتا ہے، البتہ حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں یقیناً اسکی کوشش کی ہے کہ معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، حیات سعدی اور حیات جاوید میں اس کا امکان نہ تھا کہ معروضیت برتی جاتی۔ مولانا شبلی نے ''النعمان'' اور ''المامون'' میں ضرور کہیں کہیں معروضیت سے کام لیا ہے خصوصاً المامون میں ہیرو پرستی سے بچنے کی کوشش کی ہے لیکن الفاروق اور سیرت النبی میں اس کا امکان نہ تھا خصوصاً سیرت النبی میں۔ اس لیے کہ اول تو جو شخصیت منتخب کی گئی تھی وہ قدرت کا شاہکار تھی خیر البشر تھی اسی کے طفیل میں آدم، ملک، زمین، فلک وجود میں آئے تھے۔

اب جو دوسری سوانحی کتابیں لکھی گئیں ان میں معاصر مصنفین نے اپنے عہد کی سیاسی شخصیتوں کو محور فکر و قلم بنایا خاص طور سے رئیس محمد جعفری صاحب نے مولینا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح کی سوانح لکھی۔ حضرت مولینا قاسم نانوتوی کی ''سوانح قاسمی'' مولینا مناظر حسن گیلانی نے تحریر فرمائی اور بڑی حد تک معروضیت کا خیال رکھا۔

بیسویں صدی میں اصل میں یہ ہوا ''کہ جب میں خود اپنی تعریف کر سکتا ہوں تو دوسروں کو اس کا موقع کیوں دوں'' چنانچہ برنارڈ شاہ کے اس قول کے مطابق خود نوشت سوانح عمریاں بہت لکھی گئیں۔ اردو میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کی سوانح عمریوں کے ترجمے،

مولینا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ وغیرہ سامنے آیا۔

راقم الحروف کو اس طرح کی تحریریں پڑھنے کا شوق رہا اور جب پڑھا تو لکھنے کا بھی شوق ہوا۔ فطری طور پر مجھے ایسی شخصیت کی تلاش ہوئی جو میرے محدود دائرۂ فکر سے ہم آہنگ ہو یعنی عربی ادبیات کا آدمی ہو اور مدرس ہو' حسن اتفاق سے میرے ایک محترم بزرگ نے حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی کے اسم گرامی کی نشاندہی فرمائی۔ میں نے ان کی ایک لغت دیکھی تھی۔ حیدرآباد کے مقبول ترین اخبار "سیاست" میں ان کی کتاب پر تبصرہ اور قارئین کے اس سلسلہ کے تاثرات دیکھے تھے۔ ان کی "**القرأة الواضحه**" بھی پڑھی تھی ان سب سے بالاتر پہلو یہ تھا کہ حضرت مولینا کو میرے حیدرآباد سے ایک ربط خاص تھا۔ عربی سے شدید وابستگی کی شمع یہیں مولینا دمشقی کی وجہ سے ان کے ذہن میں روشن ہوئی تھی اور جو روشنی انہیں حیدرآباد میں ملی تھی اس روشنی کو وہ زندگی کی آخری سانس تک اس طرح بکھیرتے رہے کہ مجھے دیوبند میں بھی حیدرآباد نظر آتا رہا۔

میں نے حضرت مولینا کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زبان وادب کے شعور نے جب باقاعدہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا تو جن شخصیتوں نے متاثر کیا ان میں حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی کی شخصیت نمایاں نظر آئی۔ طالب علموں پر ان کا غیر معمولی اثر تدریس سے ان کی والہانہ وابستگی' عربی زبان وادب سے شیفتگی کی حد تک لگاؤ اور جیسا کہ عرض کیا کہ حیدرآباد سے انکا رشتہ......میں نے انکی حیات کے سلسلہ میں سب سے پہلے تو حضرت مولینا نور عالم خلیل امینی کی کتاب 'وہ کوہ کن کی بات' پڑھی بہت متاثر ہوئی لیکن بعد ادب یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ مولینا کی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا' ان کی معروضی تصویر سامنے نہیں آتی تھی۔ پھر ترجمان دارالعلوم کا "**وحید الزماں کیرانوی نمبر**" نظر سے گذرا۔ بڑے بڑے اہل قلم نے انکی شخصیت کے نقوش ابھارے تھے۔ لیکن ایک احساس تھا کہ اتنا سب کہنے کے بعد

پھر بھی کہنے کو بات باقی ہے

دراصل کسی شخصیت کا مطالعہ ایک پورے عہد اور پورے دور کا مطالعہ ہوتا ہے اور اس دور کی ساری حیثیت سماجی تمدنی' تہذیبی' خصوصیت اور معنویت ایک فرد کے ذریعہ سے خود کو آشکار کرتی ہیں چنانچہ حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی کی حیات اور ان کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہوئے پہلے باب میں راقمۃ الحروف نے جہاں سہارنپور' مظفر نگر' کیرانہ' نانوتہ' اور دیوبند کی تاریخیت پر روشنی ڈالی ہے' وہیں پر یہ پہلو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ جس زبان کی خدمت کا بیڑا حضرت مولینا نے اٹھایا تھا ہندوستان میں اس کا منظر نامہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلے باب میں ۱۷۰۰ء تک سیاسی اقتدار کی مرکزیت اور اس عہد تک عربی زبان و ادب کا ہندوستان میں ارتقاء پھر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے کے بعد سے نئے ڈھانچے میں عربی مدارس کا سیاسی کردار' ولی اللہی تحریک ۱۸۵۷ء میں علماء کا مجاہدانہ رویہ فرنگی اقتدار سے تصادم اور پھر اس کے بعد فرنگی تہذیب کے خلاف مہم! اس سلسلے میں ۱۹۴۷ء تک کا پس منظر پیش کیا گیا ہے تا کہ یہ پہلو واضح طور پر سامنے آسکے کہ وحید الزماں اسی تسبیح کا ایک دانہ تھے جس کے امام حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ اسی کے ساتھ اس عہد کے ہندوستان کی شورشوں اور ان تاریخی عوامل پر بھی روشنی پڑتی ہے جو مل جل کر ایک خاص طرح کی فکر اور ذہن کی تعمیر کر رہے تھے۔

مولینا وحید الزماں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے تھوڑے وقفہ کے لیے حیدر آباد آئے اور اس زمانہ میں آئے جو ہندوستانی تاریخ کا سب سے شورش انگیز وقت تھا۔ ان کی زندگی کے ابتدائی نقوش اسی دوسرے باب میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہاں وہ انسانی شخصیت کی مختلف تصویروں میں نظر آتے ہیں کہیں سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے کہیں محبت کرنے والے بھائی کے روپ میں کہیں شفیق باپ کی حیثیت سے کہیں فرض شناس شوہر فرائض اور ذمہ داریوں میں گھرے ہوئے حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے اور اسی کے ساتھ اقبال کے لفظوں میں حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم نظر آتے ہیں۔

تیسرے باب میں انکے طرز تدریس اور چوتھے و پانچویں باب میں منتظم اور مصنف کی

حیثیت سے ان کی شخصیت کے مختلف جہات کا جائزہ لیا گیا ہے چھٹے باب میں انکی لغات کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنیکی کوشش کی گئی ہے اور مدون لغات کی دشواریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اسکے بعد ان کی شخصیت کے دوسرے Dimensions (ابعاد) کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سیاسیات سے دلچسپی ان کے معاصرین۔ ان کے اپنے بزرگوں سے تعلقات' خوردوں سے روابط' معاصرین کی نظر میں ان کا مرتبہ وغیرہ پر سارے پہلو پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی علالت بھی ایک اختلافی موضوع تھی اس لیے اس کے لیے الگ ایک باب مختص کیا گیا ہے۔ اور پھر آخر میں ان کی شخصیت کے بارے میں تاثرات پیش کئے گئے ہیں جسے اختتامیہ سمجھنا چاہیئے۔

کسی بھی علمی کاوش کے لیے براہ راست ماخذ ہی اہم ہوتے ہیں۔ براہ راست ماخذ تک میری دسترس ناممکن تھی۔ ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ مولینا وحید الزماں کے بارے میں ماخذ سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے کہ اگر میں نے زانوئے تلمذ طے کیا ہوتا؟ ان سے درس لیا ہوتا تو شاید میں یہ لکھتی کہ دورۂ حدیث میں ان کا انداز درس کیا تھا اور مقامات حریری سے گذرتے ہوئے وہ کس طرح علم بدیع کے نکات پر روشنی ڈالتے تھے یا معلقات کو کس طرح پڑھاتے تھے۔ میں نے ان سے نہ پڑھا نہ انہیں دیکھا۔ اس لیے جو کچھ ہے وہ ثانوی ماخذ ہے لیکن ثانوی ماخذ سے استخراج نتائج میں کوئی دشواری نہ تھی۔ جو باتیں تواتر اور تسلسل کے ساتھ دوسروں کے بیانات میں ملیں میں نے انہیں مربوط کیا ہے۔

حتی الامکان اس کی کوشش کی ہے کہ اختلافی مسائل سے دامن کشیدہ رہوں اور یہ ایک بات کتاب کے بین السطور میں ہے کہ بڑی معاصر شخصیتوں میں شخصیت کا تصادم ہوتا رہتا ہے جسے Clash of Personality کہتے ہیں۔

اب نہ حضرت مولینا قاری طیب صاحب قدس سرہ رہے اور نہ ہی مولینا وحید الزماں' اور نہ ہی وہ لوگ جو عمل کے ردعمل سے بے خبر تھے اس لیے ان مباحث کو اٹھانے کی ضرورت

نہیں محسوس کی گئی اور نہ ہی وہ محاکمہ کیا گیا کہ دارالعلوم میں جو انقلاب آیا اس کی کیا ضرورت تھی یا اس کی کیا اہمیت تھی وغیرہ۔

ہاں جہاں کوئی علمی پہلو آگیا ہے تو وہاں طالب علم کا قلم نہیں رک سکا ہے۔ حضرت مولینا وحید الزماں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت پر قلم اٹھانے والے اور مجھ سے کہیں بہتر لوگ موجود ہیں۔ ان پر مضامین بھی ترجمان دارالعلوم میں شائع ہوئے۔ سچ پوچھئے تو ماخذ کے اعتبار سے میرے سامنے۔ ''وحید الزماں کیرانوی نمبر'' - اور - ''وہ کوہ کن کی بات'' - تھی۔ جہاں ایسے واقعات کا بیان تھا جسے جوں کا توں عوام کے سامنے آنا چاہئے تھا وہاں طویل اقتباسات ملیں گے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سچائی کا مطالبہ تھا کہ واقعات کو بلاکم وکاست ان کے حقیقی تناظر میں پیش کر دیا جائے۔

بہت سارے پہلو ایسے بھی تھے جہاں جرح وتعدیل کی گنجائش ہے لیکن سب کچھ خود کرنے کے بجائے اسے قارئین پر چھوڑا جاتا ہے کہ آپ فیصلہ کریں۔

میں نے ایمان داری سے یہ سوچا کہ زبان وادبیات کی تعلیم وتدریس سیکولر خطوط پر بھی ہونی چاہئے اور عربی کو یونیورسٹیوں میں اسی طرح پڑھایا جانا چاہئے جس طرح مثلاً فرانسیسی یا اردو پڑھائی جاتی ہے۔ مذہب سے زبان کا رشتہ جوڑنا یا زبان کو مذہب سے جوڑنا ایک اتہام ہے۔ جسے اردو والے بھگت ہی رہے ہیں۔

بہر حال یہ بات ضمناً آگئی یہ عرض کرنا ہے کہ عبقری شخصیتوں کے لیے ان کے شایان شان کی یادگار ہونی چاہئے بلاشبہ ترجمان دارالعلوم کا نمبر یا مولینا خلیل امینی کی کتاب قابل قدر کام شیوہ ہے مگر مولینا کی شخصیت [illegible] القاب کہیں [illegible] کوئی ادارہ یا کوئی علمی مرکز وجود میں آنا چاہئے جہاں عربی زبان وادب کی باقاعدہ سہل تعلیم ہو۔ موجودہ تناظر میں عربی کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے اور یقیناً آنے والے دور میں یہ زبان ہر خطہ کی ضرورت بن جائیگی۔ کتنا اچھا ہو اگر حضرت مولینا کی یادگار میں ایک عربی کالج قائم کیا جائے۔

اس کتاب میں خامیاں بھی ہوسکتی ہیں مگر ایک خوبی ضرور ہے کہ جو کچھ تحریر کیا گیا وہ نہ کسی دباؤ اور نہ کسی لالچ کے زیر اثر لکھا گیا کوشش کی گئی کہ قلم کی طہارت وعصمت باقی رہے آخری بات جسے شکوہ نہ سمجھنا چاہئے اور نہ گلہ وہ یہ کہ بہت سارے بزرگوں کی خدمت میں عریضے لکھے گئے انہوں نے درخوائے اعتنانہ سمجھا میں ان کی بھی شکر گزار ہوں کہ اس سے حوصلہ بڑھا اور میں نے سوچا اچھا ہی ہوا۔اس طرح قلم کسی سے نہ مرعوب ہوا اور نہ ہی کبھی کوئی الزام لگا سکے گا کہ یہ کاوش کسی گروپ کی مرہونِ منت ہے۔نتیجہ میں میری کم علمی تو آشکار ہوتی ہے مگر میرا علمی خلوص اور دیانت بھی سامنے آتی ہے۔میں اپنے والدین اور گھر والوں کی بھی شکر گذار ہوں کہ جنہوں نے ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا۔

محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔انہوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کیلئے وقت نکالا اور ضروری ترمیمات کیں۔اللہ تعالیٰ انہیں اجر خیر سے نوازے۔ان کے فکری وعلمی توازن سے میں ہمیشہ متاثر رہی ہوں۔

شاید کسی خاتون کی عربی کے ایک عالم کے سلسلہ میں ایک پہلی تالیف ہے۔میں نے اس امید پر اک چراغ جلایا ہے کہ اس ایک چراغ کی روشنی سے صدہا چراغ جل اٹھیں گے اس موقع پر بے اختیار ایک شعر یاد آرہا ہے اسی پر اپنی بات کو ختم کرتی ہوں۔ ؎

جو چھپکے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقش کف پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

ڈاکٹر مہہ جبین اختر
اسوسیٹ پروفیسر،شعبہ عربی
عثمانیہ یونیورسٹی،حیدرآباد،انڈیا

❀❀❀❀❀

بابِ اوّل

سماجی، معاشرتی، تہذیبی وسیاسی پس منظر

سماجی‘ معاشرتی‘ تہذیبی و سیاسی پس منظر

عربی دنیا کی واحد زبان ہے جس میں زم زم کی بوندوں کی سی خنکی اور لطافت بھی ہے اور صحرا کے ذروں پر تمتماتے ہوئے سورج کی کرنوں کا جاہ و جلال بھی...... اس زبان کا آہنگ اس کی موسیقی‘ اس کا جوش اور ولولے عدیم المثال ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ گذرتے ہوئے کارواں کی مخملوں کے ریشمی پردوں سے حسن کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ میدان کارزار میں بجتے ہوئے دف تلواروں کی جھنکار سے ہم آہنگ ہیں اور پھر یہ مقدس اور منزہ زبان یہ وصف بھی رکھتی ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے صفوف ملایک آسمان کی بلندیوں سے اترتے ہوئے نظر آتے ہیں...... اور منبر سے جہاں اللہ کی عظمت کا اعلان ہوتا ہے وہیں اس زبان میں تقدیس‘ تحمید‘ تسبیح و تہلیل کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

یہ زبان ہر دوسری زبان کو گونگا سمجھتی ہے۔ اسی نے اپنی طہارت اور نجابت برقرار رکھی ہے مگر یہ صرف حجاز و یمن و مصر ایران تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ عرب و ہند کے تعلقات ہزاروں برس پرانے ہیں[1] اس سلسلہ میں وہ تہذیب جو کلدانی تہذیب کہلاتی ہے‘ اور جس کے خدوخال بابل اور نینوا کے کھنڈرات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور معر کے جو تہذیبی آثار تعمیرات میں دکھائی دیتے ہیں وہ اٹھ اٹھ کر اس کا اعلان کرتے ہیں کہ رود نیل کی موجیں گنگا کی لہروں سے ہم کنار تھیں۔

گذشتہ پندرہ سو برس کی تاریخ سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ عرب و ہند کے تعلقات گہرے

---

[1] Prof Childe: what Happened in History p:113-15

تھے اور ساحل مالابار پر اترنے والے عرب جہاز راں مقامی آبادی کے افراد سے گھل مل گئے تھے اور اسلام کی آمد کے ساتھ ساتھ آٹھویں صدی عیسوی ہی میں ساحل سمندر پر اذاں کی آوازوں کی گونج پھیلنے لگی تھی۔

تیرہویں صدی عیسوی ہندوستان کے لیے علمی بہار کا زمانہ تھا۔ ایک طرف خود مختار مسلم ریاستوں کی بنیادیں پڑ رہی تھیں تو دوسری طرف علمی وادبی زندگی عالم شباب میں داخل ہو رہی تھی۔ بغداد و بخارا کے ٹوٹے ہوئے ستارے ہندوستان کے علمی افق پر چاند اور سورج بن کر نمودار ہو رہے تھے بقول منہاج السراج:

"ہندوستان مرکز دائرہ اسلام و محمد اور مرد نواحی شریعت وجوزہ دین محمدی بیضۂ ملت احمدی حجتہ الاسلام بن گیا تھا" [۱]

ہندوستان میں علوم وفنون کو ترقی بخشنے میں سلاطین ہند کا بڑا اہم کردار ہے' ہندوستان کے پہلے مسلم سلطان قطب الدین ایبک نے جب وہ تخت نشین ہوا علم و علماء کا احترام کیا اور شمس الدین التمش کو تو علماء و مشائخ کی صحبت کا بے حد شوق تھا' اس کی قدر دانی نے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ قاضی حمید الدین ناگوری' شیخ جلال الدین تبریزی' شیخ احمد ترک نارنوی' مولانا مجید الدین' حاجی مولانا منہاج السراج مؤرخ جیسے جید علماء مشائخ کی کہکشاں چن دی تھیں۔ غیاث الدین بلبن کا زمانہ بھی اپنے میں منفرد اور امتیازی خصوصیاتوں کا حامل ہے۔ غیاث الدین تغلق نے ایسے وقت میں علماء و مشائخ کی پذیرائی اور سرپرستی کی جس وقت پوری دنیائے اسلام ایک انتشار و اضطراب سے گذر رہی تھی اور علماء کو ایک محفوظ جائے پناہ کی تلاش تھی۔ ایسے میں بلبن کی کوششیں اور علم نوازی' قابل صد ستائش ہیں۔ ضیاء الدین برنی اس دور کے علماء کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم در پادشاہی سلطان بلبن چندی علماء برآمد کہ از نوادر استاذاں بودند"۔ [۲]

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۶۶ عہد مغلیہ میں عربی ادب کا ارتقاء۔

[۲] تاریخ فیروز شاہی ۱۲۔ ۱۱۱ بحوالہ عربی وادب عہد مغلیہ میں ص: ۲۰ ڈاکٹر شبیر احمد قادر آبادی۔

ملتان ہندوستان کے قدیم علمی مراکز میں سے ایک اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری میں جب بشاری ملتان پہنچا تو اسنے یہاں فارسی زبان کو کافی مقبول پایا۔ یہاں کے مدارس اور علمی مراکز میں تعلیم کا انتظام بہت ہی مقبول تھا۔ بابافرید گنج شکر نے فقہ کی تعلیم یہیں پر ۱۱۹۳ء میں حاصل کی تھی۔ لیکن حوادث زمانہ نے وہاں کی علمی رونقیں ختم کردی تھیں۔ مگر بعد میں بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کے زمانہ میں ایک بار پھر سے پرانی محفلیں گرم ہوگئیں اور ملتان علماء وفضلاء کا مرکز بن گیا۔ اور ایسا بھی زمانہ آیا کہ یہاں کے لوگ باہم عربی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔

علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی وتمدنی، علمی وروحانی ادارے اپنے پورے عروج پر پہونچ چکے تھے۔ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"اس وقت دہلی میں ایسے ایسے ماہرین علوم وفنون اکٹھا ہوگئے تھے کہ سمرقند وبخارا، مصر وبغداد، دمشق وتبریز اور روم میں ان کا ثانی ملنا مشکل تھا۔ صحیح معنوں میں یہ دور ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے لیے عہد زریں تھا، کیونکہ سرزمین ہندوستان کی علمی فضاء اب اس لائق ہوگئی تھی کہ رازی وغزالی کے پایہ کے عالم پیدا کرسکے"۔ [1]

سلطان محمد بن تغلق کا دور بھی علمی سرگرمیوں کا دور تھا، وہ علماء کی صحبت کا بہت شائق تھا، عموماً اس کے دسترخوان پر دوسو فقہاء موجود رہا کرتے تھے جن سے وہ مسائل فقہ میں بحث کرتا رہتا تھا، مولانا ضیاء الدین بخشی، معین الدین عمرانی، عضیف الدین کاشانی، ناصر الدین واعظ ترمذی، عبدالعزیز اردبیلی شیخ ابوبکر خلال جیسی عظیم شخصیتیں اس دور کی علمی وفنی حیثیت کو چار چاند لگاتی تھیں۔ قلشقندی نے صبح الاعشیٰ میں لکھا ہے کہ:

"محمد بن تغلق کے وقت دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے"۔ [2]

عہد سکندری کی سعادت ونیک بختی کے لیے اخبارالاخیار کی عبارت ہی کافی ہے جس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ۵۳۔ ۳۵۲ بحوالہ عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص:۲۱ ڈاکٹر شبیر احمد

[2] صبح الاعشیٰ قلشقندی ص:۷۲

"از اکابر علماء از اطراف واکناف عالم از عرب وعجم درآں زماں تشریف آوردہ دریں دیار توطن فرمودند"۔[1]

مذکورہ بالا علمی جائزہ اس وقت تک ادھورا رہے گا جب تک کہ خود مختار مسلم ریاستوں کے علمی تعاون کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ ان میں جونپور، بہار بنگال، کشمیر اور دکن کی ریاستوں میں مالوہ مانڈو بیجاپور، گول کنڈہ اور احمد آباد گجرات وغیرہ بہت مشہور ہیں ان میں جونپور اوج ثریا پر پہونچ گیا تھا۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور کے علمی وقار کو مزید بلند کیا۔ دکنی ریاستوں میں مالوہ علوم وفنون کی ترقی میں ایک اہم ریاست شمار کی جاتی تھی بیجاپور کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ تو اس قدر باذوق تھا کہ فن خوش نویسی میں اس کے زمانہ میں اس کا کوئی حریف وثانی نہ تھا، بساتین السلاطین میں لکھا ہے کہ:

"بادشاہ تمام قلموں کا بادشاہ تھا"۔[2]

مشہور دانشور حکیم ملا فتح اللہ شیرازی مغلوں سے پہلے بیجاپوری ریاست سے ہی وابستہ تھے، اور احمد آباد گجرات تو علم وحکمت کا سرچشمہ تھا، محمود شاہ احمد شاہ، فیروز شاہ کے زمانے میں فکروفن کے بے شمار دریا بہائے گئے۔ شیخ العرب والعجم شیخ علی المتقی اور علامتہ الحدیث شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجرات کی مایہ ناز علمی شخصیتیں تھیں۔ دوسری مسلم ریاستوں یعنی کشمیر بنگال اور بہار کے علمی تعاون کے سلسلہ میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مغلوں کے زمانے میں علماء نے ہر طرح کی علمی، ادبی اور فنی خدمات پیش کیں جن کی خدمات کے ثمرہ میں آج بھی مغلیہ دور علمی اور فنی اعتبار سے تاباں ودرخشاں ہے ان میں سے کچھ علماء کا مختصر اعلمی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) شیخ الاسلام عبداللہ سلطان پوری خاندان سور (شیر شاہ سوری) وتیموریہ کے نزدیک یکساں محترم ہوتی تھی، مخدوم الملک آپ کا لقب ہے۔ شہنشاہ ہمایوں نے اپنے دور حکمرانی میں

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۷ بحوالہ عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص ۲۱ ڈاکٹر شبیر احمد

[2] بساتین السلاطین ص ۲۷۵ بحوالہ عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص ۲۲ ڈاکٹر شبیر احمد

انہیں شیخ الاسلام کا عہدہ دیا تھا' شیر شاہ سوری کے زمانے میں یہ صدر الاسلام ہو گئے تھے۔ عہد اکبری میں مخدوم الملک کے لقب سے سرفراز کئے گئے اور سالانہ ایک لاکھ روپے مشاہرہ مقرر ہوا' ان کی تصنیفات کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ مصنف گلزار ابرار کے بیان کے مطابق ملا عبداللہ کے قلم کی لکھی ہوئی تالیفات اور تعلیقات تو بہت ہیں لیکن عصمتہ الانبیاء' منہاج الاصول اور رسالہ تفصیل عقل برعلم بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ البتہ نزھتہ الخواطر جلد چہارم ص ۲۰۷ اور رود کوثر (ص ۸۹) کی روشنی میں ان کی تصنیفات کی حسب ذیل فہرست مرتب ہوتی ہے۔

۱۔ منهاج الدين يا منهاج الاصول

۲۔ شرح شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۳۔ كشف الغمه

۴۔ رسالة فی تفصيل العقل علی العلم

۵۔ عصمة الانبياء

۶۔ شرح عقيدة الحافظيه

(۲) ایسی ہی چند نامور ہستیوں میں سے ایک ممتاز شخصیت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے اور حضرت شیخ احمد کے لڑکے شیخ عبدالنبی کی تھی جو ہندوستان کے مایہ ناز علماء میں سے تھے' شیخ عبدالنبی نے چند ایسی کتابیں لکھی ہیں جن کے سامنے آج کا مصنف بھی حیران اور ششدر رہ جاتا ہے' ان کی تصنیفات میں "وظائف النبی صلعم فی الادعية الماثورة"۔ "رسالة فی حرمة السماع" رسالة فی رد طعن فقال المزوری علی الامام ابی حنيفة اور سنن الهدیٰ فی متابعة المصطفیٰ وغیرہ مشہور ہیں۔

(۳) عہد اکبری کا باکمال شاعر ممتاز عالم اور عربی' فارسی' سنسکرت زبانوں پر ملکہ رکھنے والا فیضی ہندوستان میں عربی ادب کے ارتقاء میں ایک اہم مقام رکھتا ہے سواطع الالہام فیضی کی

لکھی ہوئی تفسیر ہے اس کی بنیادی عبارت صنعت اہمال میں یعنی بغیر نقطے کے لکھی گئی ہے جو فیضی کی عربی انشاء پردازی کا حیرت انگیز نمونہ ہے پوری تفسیر ۷۸۰ صفحے کی ہے فیضی نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا ہے اور اس کے عربی اشعار اور عربی انشاء پردازی عربی ادب کے بے مثال نمونے ہیں۔

(۴) حضرت شیخ علاؤ الدین علی متقی بن حسام الدین کی ولادت باسعادت ۸۸۵ھ کو ہوئی۔ شیخ علی متقی اسم بامسمی تھے بڑے عابد و زاہد اور انتہائی متقی شخص تھے انہوں نے اتنی عظیم الشان تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جو رہتی دنیا تک زندہ جاوید رہیں گی۔ ان میں سے چند مشہور کتابوں کے نام درج ہیں۔

۱۔ کنز العمال

۲۔ ترتیب الجامع الصغیر

۳۔ البرهان فی علامات مهدی آخر الزمان

۴۔ جوامع الکلم فی المواعظ والحکم

۵۔ المنهج الاتم فی ترتیب الحکم

(۵) عہد اکبری کے مایہ ناز محدث اور نامور استاد کے نامور شاگرد علامہ محمد بن طاہر پٹنی جن کا فضل و کمال ساری دنیا میں مشہور ہے۔ محدث پٹنی صرف ایک گوشہ نشین، زاہد مرتاض اور باخدا صوفی ہی نہ تھے، بلکہ اقلیم تحریر و تصنیف کے بادشاہ بھی تھے انہوں نے گرانقدر تصنیفات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان میں مشہور کتابیں یہ ہیں۔

۱۔ مجمع بحار الانوار

۲۔ تذکرة الموضوعات

۳۔ قانون الموضوعات

۴۔ کفایۃ المفرطین

۵۔ المغنی اللبیب

۶۔ فی اسماء الرجال

۶۔ مقاصد جامع الاصول منہاج السالکین وغیرہ۔

(۶) سنہ ۹۰۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء کو دہلی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ولادت ہوئی۔ نام عبدالحق، کنیت ابوالمجد اور شیخ اولیاء تاریخ پیدائش قرار پائی۔ شیخ صوری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہوکر میدان عمل میں وارد ہوئے عمر عزیز کے چورانوے سال کا بیشتر حصہ تصنیف وتالیف میں گذار دیا، شیخ محدث نے اپنی تصانیف کی فہرست خود ایک رسالہ میں جس کا نام تالیف قلب الألیف بذکر فهرس التوالیف ہے دی ہے۔ یہ فہرست جس وقت مرتب کی گئی تھی اس وقت تصنیف وتالیف کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ چنانچہ اس وقت فہرست کے اختتام پر فرماتے ہیں:

"ہنوز سلسلہ سخن دراز است ودر فیض الٰہی بار تا بکجا رسد وبکجا ر رسانند"[1]

شیخ کی تصنیفات کی تعداد ۶۰ ہیں موضوع کا لحاظ رکھتے ہوئے اس موقعہ پر صرف کچھ عربی کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ لمحات التتفیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح

۲۔ ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ

۳۔ جمع الاحادیث الأربعین فی ابواب علوم الدین

۴۔ تعلیق الحاوی علی التفسیر البیضاوی

۵۔ درۃ الفرید فی قواعد التجرید وغیرہ

---

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۲۳۶ بحوالہ عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص ۱۶۰ ڈاکٹر شبیر احمد

انکے علاوہ بھی بہت سی نادر کتابیں ہیں جن سے شیخ کی جلالت علمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۷) شیراز ہند جونپور کو اپنے جن سپوتوں پر ناز رہے گا۔ ان میں سب سے نمایاں ہستی ملا محمود جونپوری کی ہے، مولوی رحمن علی لکھتے ہیں:

''اگر بوجودش سرزمین جون پور، بمرز بوم شیراز تفاخری جست روا بودے''[1]

ملا محمود ایک متکلم اور مناظر کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں، شاید اسی وجہ سے ان کو تصنیف وتالیف کا موقعہ کم ملا۔ لیکن جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اس موضوع پر سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''الفرائد فی شرح الفوائد'' علم معانی وبیان میں ایک شاندار کتاب ہے، ملا محمود کو جن کتابوں سے حیات جاوید ملی اور جو خود ملا کے زور قلم کا شاہکار ہیں وہ شمس بازغہ (الحکمۃ البالغۃ) اور اس پر خود انہیں کی لکھی ہوئی شرح شمسیہ ہے شرح شمس بازغہ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اگر اس کتاب سے قطع نظر کرلی جائے تو فلسفہ میں علماء ہند کا کارنامہ صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ بیرونی ممالک کی مشہور فلسفیانہ کتابوں کی شرحیں لکھتے رہے۔

اس طرح علماء کی بڑی تعداد صنم کدہ ہند میں عرفان ومنونٹ کے چراغ عربی زبان کے ذریعہ سے روشن کرتی رہی ظاہر ہے کہ فہرست سازی میں کچھ نام درج کیے گئے۔

اس سلسلہ میں حضرت مولینا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مندرجہ اقتباس قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے:

> ''ہندوستانی مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ عربی زبان کی اہمیت محسوس کی اور اس کو ہر دور میں سینے سے لگائے رکھا بلکہ اس کی خدمت واشاعت اور توسیع وترقی میں اپنا مخصوص کردار ادا کیا اور انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہمعصری اور رفاقت کی بلکہ کبھی کبھی ان کی رہنمائی اور رہبری کا فرض بھی انجام دیا، اور نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہم زبانی اور ہم نوائی کی جرأت کی جو ایک عجمی قوم کے لیے سرمایہ

---

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۲۳۶ بحوالہ عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص ۲۰۳ ڈاکٹر شبیر احمد

فخر ومباہات ہے بلکہ کبھی کبھی جدت واجتہاد سے بھی کام لیا' شاہ راہ عام سے ہٹ کر نئی روشیں پیدا کیں اور قصر ادب میں بعض نئے نئے دریچے اور نئے روزن بھی کھولے مثال کے طور پر اس جدت وجرأت کا سہرا ایک ہندوستانی عالم ہی کے سر ہے کہ اس نے ایک مستند ترین معجم (لغت) کی شرح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں زبان کی ایسی اداشناسی اور نکتہ سنجی کے نمونے پیش کئے کہ اہل زبان نے بھی اس کی زبان دانی اور دقیقہ اسی کا اعتراف کیا۔ میرا اشارہ علامہ مجدالدین فیروز آبادی کی شہرہ آفاق لغت ''القاموس المحیط'' کی عربی شرح ''تاج العروس'' کی طرف ہے جو تیرھویں صدی کے مشہور ہندوستانی فاضل علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی معروف بزبیدی (م ه۔ ۱۲ھ) کے قلم سے دس ضخیم جلدوں میں نکلی ہے اور پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ میرے علم میں نہ صرف عربی زبان بلکہ کسی دوسری زبان میں بھی کسی عظیم وضخیم لغت کی شرح کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات پر سب سے زیادہ مستند اور مفصل کتاب ایک ہندی عالم کے ہی قلم سے ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کے نام سے نکلی اور پوری علمی دنیا میں مقبول ہوئی۔ اس کے مصنف قاضی محمد اعلیٰ تھانوی بارھویں صدی کے علماء میں ہوئے ہیں۔ عربی لغت ومعاجم کے میدان میں اس خدمت کے ماسواہ ہندوستانی علماء نے اور میدانوں میں بھی اپنی ذہانت' قوت ایجاد واختراع سے کام لیا۔ مولانا سید عبدالجلیل بلگرامی اور ان کے نامور نواسے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے فن بلاغت وبدیع اور فن عروض میں نئے اضافے کئے اور عربی شاعری میں ہندوستانی موزونیت طبع اور ہندی وفارسی شاعری کے پیوند لگا کر ذہن وذوق میں نئی تحریک اور جمود وتقلید کی ساکن سطح میں نیا تموج پیدا کیا۔ جسٹس کرامت حسین لکھنوی اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری نے فقہ اللسان اور المبین کے ذریعہ عربی زبان کے فلسفۂ لغت اور نحو واشتقاق کے بہت سے اسرار کی نقاب کشائی کی اور اپنی سلامت ذوق اور جدت طبع کے نادر نمونے پیش کئے''۔ [1]

حضرت مولینا کے اس اقتباس کی روشنی میں اس عہد کے علمی مزاج کا ادراک کیا جاسکتا ہے اور یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اٹھارویں صدی تک کسی نہ کسی نہج سے علماء حق کی مساعی

[1] مقدمہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مشمولہ عربی ادب کی تاریخ ڈاکٹر عبدالحلیم

جمیلہ عربی زبان وادب کے ارتقاء میں ممد اور معاون رہیں۔

لیکن جب سیاسی بساط پر انتشار کے گھوڑے دوڑنے لگے اور شاہان شطرنج کی آمد و رفت شروع ہوگئی تو دھیرے دھیرے نقشہ بدلنے لگا۔ اس عہد میں یقیناً کچھ علماء تھے جنھوں نے آندھیوں میں بھی چراغ علم وادب روشن رکھا۔ اس سلسلہ میں دہلی کے اس خانوادہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جن کا تعلق محدث دہلوی اور شاہ عبدالعزیز سے تھا اور تاریخ نے جسے ولی اللہی تحریک کے نام سے یاد کیا۔ اس تحریک کے سلسلہ میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

> "اس تحریک کا آغاز دراصل ۱۹۲۰ء سے سمجھنا چاہئے۔ جب سید احمد بریلوی اپنے دونوں رفیقوں مولینا محمد اسمٰعیل اور مولینا عبدالحئی کے ساتھ مشرقی ہند اور جنوبی ہند کے دورے پر روانہ ہوئے جس میں وہ مسلمانوں کو احکام شریعت کی پابندی کرنے اور غیر اسلامی رسوم اور بدعتوں کو ترک کرنے کی تلقین کرتے اور اس طرح جہاد کی دعوت کے لیے زمین تیار کرتے۔ ۱۹۲۴ء میں جب سید صاحب معہ اپنے ہمراہیوں کے حج کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے باضابطہ جہاد کی تحریک شروع کرنے کے لیے دوبارہ ملک کا دورہ کیا اس جہاد کا رخ سردست پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا۔ جس کے مسلمانوں پر ظلم کرنے اور ان کی مذہبی آزادی میں خلل انداز ہونے کی خبریں سید صاحب کو پہنچتی تھیں۔ اس لیے انگریزی حکومت نے ان کی مہم میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی بلکہ ایک حد تک ہمت افزائی کی"۔ [1]

یہاں اس مہم کے کامیاب آغاز اور اس کے ناکام انجام کی کہانی جو بار بار لکھی جا چکی ہے نہیں دہرائیں گے بلکہ صرف اتنا کہیں گے کہ سید صاحب کا مقصد اصلی جس کے لیے انھوں نے پنجاب میں افغانوں کی مدد سے مسلمانوں کی ایک آزاد حکومت قائم کی یہ تھا کہ اسے صدر کیمپ بنا کر انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کریں اور ان کو ہندوستان سے نکال کر دم لیں۔ اس کے بعد وہ ہندوستان میں جو حکومت بنانا چاہتے تھے۔ اسکا کوئی واضح تصور ان کے ذہن میں تھا بھی تو انھوں نے ظاہر نہیں کیا ہے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان کے پیش نظر

---

[1] اقتباسات از ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ڈاکٹر عابد حسین ۶۳ تا ۶۸

ایک ایسا مرکزی نظام تھا جس کے اندر مسلمان صالح مذہبی زندگی بسر کر سکیں اور معاشی اور سماجی انصاف کا دور دورہ ہو اور اس کے ماتحت موجودہ ہندو مسلم والیان ریاست اپنے اپنے علاقے میں پہلے سے زیادہ آزادی اور سلامتی کے احساس کے ساتھ حکومت کرتے رہیں۔ ہمارے اس خیال کو اس خط وکتابت سے تقویت پہنچتی ہے جو سید صاحب نے ریاست گوالیار کے سرداروں سے کی تھی۔ راجہ ہندو راؤ کو جو مہاراجہ گوالیار کے مدار المہام اور برادر نسبتی تھے لکھتے ہیں:

''جس وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا... حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو اس کی طلب ہوگی اور ان ملکی حکام و اہلِ ریاست کی شوکت وقوت کی بنیاد مستحکم ہوگی۔ ہم کمزوروں کو والیان ریاست اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان و دل سے اسلام کی خدمت کریں اور اپنے مسند حکومت پر برقرار رہیں''۔[1]

گوالیار کے ایک اور عہدہ دار کو لکھتے ہیں:

''آپ سردار والا قدر ہندو راؤ کے یہ مضمون ذہن نشیں کر دیں کہ ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور انھوں نے ہر جگہ ظلم وزیادتی پر کمر باندھی ہے...... چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں اس لیے چند کمزور و بے حقیقت اشخاص نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ان سرداروں کے لیے مناسب یہی ہے جو سالہا سال سے اپنی مسند پر متمکن چلے آرہے ہیں کہ اس وقت ان کمزوروں کی ہر طرح مدد کریں اور اس بات کو اپنی حکومت کے استحکام کا سبب سمجھیں''۔[2]

اس انقلابی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد بھی ان علماء مجاہدین کی مذہبی قوم پروری کا جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ دبی ہوئی آگ کی طرح ان کے دلوں کے اندر سلگتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی

---

۱ نقش حیات جلد دوم صفحہ ۱۳ (بحوالہ ''مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا'' صفحہ ۲۷۴۔ ۲۷۶)

۲ مجموعہ قلمی خطوط ۱۴۔ نقش حیات صفحہ ۱۵

شورش میں بھی جو انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانی فوج نے برپا کی شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں اور پیروؤں نے سرگرمی سے حصہ لیا جن میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی مولینا محمد قاسم نانوتوی اور مولینا رشید احمد گنگوھی خاص طور پر ممتاز تھے۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریزی حکومت اس فوجی شورش کو دبا چکی تھی اور سارے ملک میں قہرمانی حکومت کا دور دورہ تھا۔ ان علماء نے بیٹھ کر ملک کی صورت حال کا جائزہ لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ انھیں اپنے مشن کا کام میدان جنگ سے مسند درس کی طرف منتقل کر دینا چاہیے۔ ایک گروہ حاجی امداد اللہ مکی کے ساتھ ہجرت کر کے مکے چلا گیا اور دوسرے نے جس کے سرگروہ مولانا قاسم نانوتوی تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ دہلی کی جگہ جو غدر کے ہنگامے میں بند ہو گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں دیوبند ضلع سہارن پور میں دینی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم کیا اور اسے اپنے مذہبی اور سیاسی خیالات کی تعلیم و تلقین کا ذریعہ بنایا۔

> ''اس طرح دارالعلوم دیوبند جس نے شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی انقلاب کے تخیل اور ایک حد تک ان کے مذہبی اصلاح کے تصور سے فیضان حاصل کیا تھا۔ انگریزی حکومت اور جدید مغربی تہذیب کی مخالفت کا جو مسلمان علماء اور عوام کے دل میں بسی ہوئی تھی ایک مضبوط گڑھ بن گیا اور اسی نمونے کے متعدد مدارس آس پاس کے اضلاع میں قائم ہو گئے''۔ [1]

ان علماء نے صرف جہاد قلم ہی کو نہیں اپنایا تھا بلکہ شمشیر کو بھی وسیلہ قرار دیا تھا۔ علماء کے اس گروہ میں سب سے درخشاں نام حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

> ''دیوبند کے بانی مولینا محمد قاسم اور سرسید احمد خاں بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ ایک ہی استاد کے شاگرد تھے لیکن ان دونوں قائدین کی سیرت و طبیعت میں بعد المشرقین

---

[1] ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں صفحات ۶۶۔ ۶۸

تھا۔سر سید مسلمانوں کے طبقہ امراء واشراف کی بہترین روایات کے وارث تھے۔تو مولانا محمد قاسم طبقہ علماء وزہاد کی بہترین صفات کے حامل تھے۔ایک کی وجیہہ دبنگ قوت آریں شخصیت کی شبیہہ آپ دیکھ چکے ہیں۔اب دوسرے کی بے نمود خاموش مگر گہری اور پُر تاثیر شخصیت کی تصویر بھی دیکھیے۔مولینا محمد قاسم نانوتوی غریب باپ کے بیٹے تھے اور انھوں نے طالب علمی کا زمانہ انتہائی عسرت اور شدید تنہائی کی حالت میں گزارا اور وہ فضل وکمال حاصل کرنے کے بعد بھی جس پر ان کے ہم سبق رشک اور ان کے استاد ناز کرتے تھے کبھی دولت دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور علم کی دولت کو جس سے وہ مالا مال تھے سادگی اور انکساری کے پردوں میں چھپائے رہے۔نوجوانی کے زمانے سے بہت قلیل معاوضے پر چھاپہ خانے میں کتابوں کی تصحیح کے کام کو کسب معاش کا ذریعہ بنایا اور آخر تک اس کو نبھاتے رہے شادی کھاتے پیتے خاندان میں ہونے کی وجہ سے رزق میں کشائش ہوئی مگر سخاوت ومہمان نوازی کا یہ عالم رہا کہ کبھی فراغت کی زندگی نصیب نہ ہوسکی۔۱۸۵۷ء کی شورش میں مولینا کے حب وطن اور جوش ایمانی نے انھیں مجبور کیا کہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیں۔چنانچہ حاجی امداد اللہ صاحب کی قیادت میں تھانہ بھون میں جو آزاد مقامی حکومت بنی اس کے سپہ سالار مولینا مقرر ہوئے۔اس چھوٹی سی فوج نے قصبہ شاملی پر حملہ کرکے انگریزی فوج کو شکست دی اور اس پر قبضہ کرلیا مگر اس کے بعد ہی دہلی پر انگریزوں کے قبضے کی خبر ملی اور اندازہ ہوگیا کہ لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا"۔[1]

چنانچہ انگریزوں کے انتقام سے بچنے کے لیے پہلے حاجی امداد اللہ صاحب اور پھر مولانا محمد قاسم صاحب جن کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے تھے۔چھپتے چھپاتے کراچی پہنچ کر حج کو روانہ ہوگئے اور جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کرنے والوں کے لیے عام معافی کا اعلان ہوگیا تو واپس آکر مطبع میں کتابوں کی تصحیح کا کام جو دہلی میں کرتے تھے میرٹھ کے ایک چھاپہ خانے میں کرنے لگے۔

چند سال بعد جب مدرسہ دیوبند قائم ہوا تو مولینا محمد قاسم صاحب نے اس کی رہنمائی کی

[1] نقش حیات صفحہ ۴۴۔۴۳ بحوالہ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں صفحہ ۶۹

ذمہ داری لی اور جب دیوبند آئے تو اونچے درجوں کے طلبہ کو درس بھی دیتے تھے لیکن انھوں نے اس خدمت کا معاوضہ قبول نہیں کیا بلکہ اپنے ذاتی مصارف کے لیے دس روپئے ماہوار کی رقم کو جو چھاپے خانے سے کتابوں کی تصحیح کے عوض ملتی تھی کافی سمجھا۔[1]

ایک تو یہ تنگی ترشی کی زندگی اور شدید جفاکشی اور عبادت وریاضت جس کی مولینا کو بچپن سے عادت رہی نتیجہ یہ ہوا کہ مشن...... کے شروع ہوتے ہی صحت خراب رہنے لگی اور آخر تیسرے سفرحج کی صعوبتوں نے بالکل توڑ دیا۔ ۱۸۸۰ء میں صرف (۴۸) اڑتالیس کی عمر میں دنیا سے رحلت کر گئے۔ سرسید نے جو مذہبی، تہذیبی، سیاسی خیالات میں مولینا سے گہرے اختلافات رکھتے تھے ایک تعزیتی نوٹ ان کی وفات پر لکھا[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مولینا کی ذاتی صفات کی کتنی قدر تھی۔

"لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحق کے کوئی شخص ان کے مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اسی دلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحق کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے........... ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز صاحب سے کچھ کم ہو الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا...... درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے......

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے۔ سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے۔"[3]

سرسید کی اس تحریر کو اس تناظر میں دیکھنا چاہئے کہ حضرت مولینا محمد قاسم کے زاویہ نظر سے سرسید کو اختلاف تھا مگر اس اختلاف کے باوصف بھرپور انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہ اعتبارِ عمر مولینا سرسید سے کافی چھوٹے تھے۔ اپنے سے خورد کو اس

---

[1] نقش حیات صفحہ ۴۴۔ ۴۳ بحوالہ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں صفحہ ۶۹

[2] انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۷ اپریل ۱۸۸۰ء بحوالہ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں

[3] ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ۶۸۔ ۷۰ سید عابد حسین

طرح خراجِ عقیدت پیش کرنا سرسید کے جرأتِ کردار کا مظہر تھا۔

مولینا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر جہاد کا وہ تصور تھا جہاں تلوار سے زیادہ قلم کی کاٹ ہوتی ہے تلوار چل چکی تھی اس لیے اب انھوں نے قلم کے ذریعہ اِک ایسی نسل کی تربیت کا بیڑا ٹھایا جو ایک طرف تو اسلامی اقدار کی پاسدار تھی تو دوسری طرف جس کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ ملکی سطح پر ابنائے وطن کے اشتراک کے ساتھ انگریزی حکومت اور انگریزوں کی تہذیبی یلغار...... دونوں کو شکست دینا ہے۔

جس کارِ خیر کا نقطۂ آغاز حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور جس کے پس منظر میں ولی اللہ تحریک تھی وہ کام آگے بڑھتا رہا۔ اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کارواں کے قائد شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحق' دیوبندی تھے۔ دراصل ہندوستانی سیاست میں نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کا تقاضہ بھی یہ تھا کہ حضرت مولینا برطانوی سامراج کے خلاف ترکِ موالات کا فتویٰ دیں۔ اس لیے کہ بین الاقوامی سطح پر پہلی جنگِ عظیم میں ترکوں کی شکست' خلافت کا خاتمہ' عالم اسلام میں وطنیت کی بنیاد پر قومیت کا تصور اور عرب نیشنلزم کا ایک طاقتور تحریک کی شکل میں ابھرنا...... یہ وہ سیاسی عوامل تھے جن کے اثرات ہندوستانی سیاست پر بھی پڑے تھے اور ہندوستان میں گوکھلے کی اعتدال پسند تحریک کی جگہ اب تلک کی پُر جوش اور تصادم کی سیاست پروان چڑھ رہی تھی۔ گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی اُفق پر اسی زمانے میں اُبھر رہے تھے چنانچہ نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت تحریک کے ساتھ جمعیۃ العلماء ہند کا قیام بھی عمل میں آیا اور حالاتِ زمانہ کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلح تصادم یا مسلح انقلاب کی گنجائش نہیں ہے اور عدم تشدد کی بنیاد پر ترکِ موالات اور عدم تعاون کی حکمت عملی اپنائی جانی چاہیے۔ اور یہی راستہ اپنایا بھی گیا۔

ایک طرف تو اسیرانِ مالٹا کے کردار کی روشنی تھی دوسری طرف ۱۹۲۰ء میں شیخ الاسلام حضرت مولینا حسین احمد مدنی نے واضح الفاظ میں برطانوی حکومت کی اطاعت' اعانت اور

ملازمت کو حرام قرار دے دیا۔

تاریخ کی یہ ستم ظریفی کس قدر المناک ہے کہ دورِ حاضر میں علماء کی حُبّ الوطنی پر سوالیہ نشان لگایا جاتا ہے اور مدارس کو مشتبہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ ان کے اسلاف نے کسی کی پرواہ کئے بغیر آزادیٔ وطن کی خاطر سختیاں جھیلی۔ تکلیفیں برداشت کیں مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔

اس عہد کے علماء کرام میں حضرت مولٰینا کفایت اللہ مفتیٔ اعظم‘ مولٰینا احمد سعید دہلوی‘ مولٰینا فخر الدین مراد آبادی‘ مولٰینا ابوالمحاسن سجاد بہاری‘ مولانا عبدالباری فرنگی محل‘ مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولٰینا وعیداللہ سندھی ریشمی رومال کی تحریک اور علمائے حق کا یہ کردار جس کا تذکرہ کیا گیا یہ سب وہ عوامل تھے جو ملک کی سیاسی فضاء میں مسلمانوں کو آگے بڑھا رہے تھے اسی کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی ۱۹۲۳ء میں کانگریس کی صدارت نہ اتفاقیہ امر تھی اور نہ ہی مہاتما گاندھی کی طرف سے کوئی انعام تھا۔ بلکہ مولانا آزاد چارسو (۴۰۰) سے زیادہ جید علماء کی نمائندگی کررہے تھے یہ وہ علماء تھے جو دینی اور شرعی مسائل ہی میں نہیں بلکہ تہذیبی اور معاشرتی رخ سے بھی مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ جہاں تک دوسرے مسلمان زعماء کا تعلق ہے یہ بھی اپنے سیاسی طرزِ فکر کی بنیاد پر کانگریس سے اشتراک کے قائل تھے بلکہ اشتراک کررہے تھے ان لوگوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری‘ حکیم اجمل خاں‘ ڈاکٹر سیف الدین کچلو‘ رفیع احمد قدوائی‘ حافظ محمد ابراہیم‘ خانی عبدالغفار خان‘ خان عبدالصمد خان‘ مولانا شوکت علی‘ مولانا محمد جوہر علی مرحوم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ حضرات صرف سیاسی نصب العین رکھتے تھے مگر علماء کا مقصد صرف سیاسی نہ تھا بلکہ ان کے پیشِ نظر تہذیب بھی تھی اور مذہبی اقدار کے تحفظ کے ساتھ اسلام کی دیرینہ عظمت کی بازیافت بھی تھی اور احیائے دین کا تصور بھی تھا۔ اس پس منظر میں یہ پہلو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ انگریزوں

کے خلاف سیاسی فضا گرم ہوتی گئی اور مختلف سمتوں سے ہی سہی ملک کا کاروانِ آزادی بتدریج منزل مقصود کی طرف بڑھتا رہا یہاں یہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنو پیکٹ نے ہندو مسلم اتحاد کی راہیں ہموار کی تھی ہوم ورک تحریک کی وجہ سے پورے ملک میں ایک نئی ہر دوڑ گئی تھی لیکن ۱۹۱۹ء میں جلیان والا سانحہ اور چوری چورا والا حادثہ وغیرہ آزادی کی تحریک میں نیا جوش ابھر رہا تھا۔ یہ سارے واقعات آزادیٔ وطن کے لیے بہت اہم ثابت ہوئے تھے۔ یہ ایسے نقطوں کی حیثیت رکھتے تھے جس سے جہد آزادی کی تصویر مکمل ہوتی تھی۔

تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ملک میں فرقہ وارانہ خطوط پر جو علیحدگی پسند رجحانات پیدا ہوئے اُس کی طرف اشارہ نہ کرنا تاریخی بد دیانتی ہوگی۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ۳۷ء میں قومی وزارتوں کی تشکیل صوبوں میں عمل میں آئی۔ اسے ابنائے وطن کی بے اعتنائی کہیے یا مسلمانوں کے سلسلہ میں انہیں نظر انداز کرنے کی پالیسی بہر حال اسی زمانے سے قومی تحریکات سے کچھ مسلمان الگ ہوئے گئے ۱۹۲۵ء میں لالہ لاجپت رائے نے ہندوستان کی تقسیم کا تصور پیش کیا تھا۔[1]

۱۹۳۷ء میں ہندو مہا سبھا کے اجلاس کے صدارتی خطبہ میں ساور کر نے کہا تھا:

''آج ہندوستان کو ایک وحدانی اور ہم آہنگ قوم نہیں سمجھا جاسکتا ہے بلکہ دراصل یہاں دو قومیں ہیں ہندو اور مسلمان''۔[2]

پھر ۱۹۳۹ء میں کلکتہ کے اجلاس میں انہوں نے کہا:

''یوں ہی ہمارا مقابلہ کسی غیر ہندو جماعت سے کیا جائے چاہے وہ انگریز ہوں یا جاپانی یا چاہے ہندوستانی مسلمان ہی کیوں نہ ہوں ہم ان سے ممتاز نظر آتے ہیں''۔[3]

اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں سیاسی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں مسلمانوں کا وہ

---

[1] تحریکِ آزادی ہند۔ ڈاکٹر تاراچند جلد چہارم ص ۱۱۰

[2]، [3] رام گوپال Indian Muslim ص ۲۶۴

طبقہ جس نے مذہبی بنیادوں پر انگریزوں سے لڑنے کا فیصلہ کیا تھا اُن کی تمام کوششوں کو جھٹکا لگا۔ اور دوسری طرف مسلم لیگ کی سیاسی طاقت بڑھتی گئی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ ۱۹۴۲ء میں مسلم اکابرین کو بھی قید و بند کے شدائد جھیلنے پڑے۔ اور ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن آیا اور اس کے سامنے ۴۵ء کے انتخابات کے نتائج آئے تو مشن نے اُس کی بنیاد پر مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت تسلیم کرلی۔ حالانکہ ان انتخابات میں حق رائے دہی بہت محدود تھا اور یقینی طور پر یہ نتائج پورے مسلم سماج کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی، سید محمد میاں دیوبندی، مولانا نور الدین بہاری، مولانا حفظ الرحمان سہواروی اور اس طرح بہت سے علماء مسلم سماج کے سامنے اپنا نقطہ نظر نہ رکھ سکے اور نہ ہی مسلم سماج کی مکمل نمائندگی ہوسکی۔ ضمناً یہ عرض کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ یوپی میں حالانکہ حق رائے دہی محدود تھا مگر بارہ نشستیں کانگریس نے جمیعت العلماء کی مدد سے حاصل کی تھیں۔ اور جن نشستوں پر کانگریس کو شکست ہوئی تھی وہاں بہت ہی کم ووٹوں کے تناسب سے شکست ہوئی تھی۔

مگر فرنگی سیاست اور ہندوستان کے لیڈروں کی کمزوری اور اقتدار پانے کی جلد بازی کے نتیجہ میں ہندوستان بٹ گیا۔

یہ بات یادگار ہے کہ میرٹھ میں کانگریس کے اجلاس میں جب سارے لیڈر تقسیم کے حق میں ہو چکے تھے۔ مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے پورے زور وقوت کے ساتھ تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی تاریخ کی کتابیں اس حقیقت کا اخفا کرتی ہیں لیکن کانگریس پارٹی کی کاروائی میں مولانا کی تقریر دیکھی جاسکتی ہے بہرحال اس طرح کی باتیں تو پس منظر میں چلی گئی مسلمان علماء کرام نے اتحاد و اتفاق کا جو سبق دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اس پر گہری ضرب لگی تھی لیکن یہ بھی ایک اٹل سچائی ہے کہ علمائے دیوبند نے اپنے کردار کی استقامت اور بلندی کا ثبوت دیا۔ بیشک حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان گئے انہوں نے پاکستان تحریک کا ساتھ بھی دیا اُنکے ساتھ اُنکے کچھ شاگرد بھی گئے لیکن اکثریت ہندوستان میں ہی رہی حضرت مولانا قاری

محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ صاحب تشریف لے گئے تھے مگر شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت اور ان کے مشوروں کی روشنی میں واپس چلے آئے۔

تقسیم ہند کے مضمرات ہماری سیاسی تاریخ کا المناک باب ہیں جتنی بار اُن کا تذکرہ ہوتا ہے شدید ذہنی اذیت ہوتی ہے اور اس اذیت کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان جو اپنے علماء کے شیدائی تھے اور اُن کے احکامات کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھتے تھے اُن مسلمان عوام کو فاشسٹ طریقوں سے علماء سے برگشتہ کر دیا گیا۔

حضرت مولانا مدنی، حضرت مولانا آزاد کے ساتھ کچھ لوگوں نے انتہائی تحقیر آمیز اور تنفر انگیز رویہ اختیار کیا تھا۔

یہ ان حضرات کا ظرف تھا اور ان کی دینی وعلمی جلالت تھی کہ انہوں نے ہر موقع پر مسلمانوں کے معاشی، سماجی وتہذیبی اور دینی امور سے اغماض نہیں کیا۔ لکھنو کانفرنس میں مولانا آزاد کے مشورے سے دار العلوم دیو بند کے سلسلے میں شیخ الاسلام کی کاوشیں یادگار ہیں بحیثیت مجموعی ترکِ وطن اور مہاجرت کی بنا پر مسلمانوں کی وفاداریوں پر جو سوالیہ نشان لگ رہے تھے اُن کے خلاف علمائے حق کا صبر وتحمل کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل کو تعاون اور مفاہمت کی اپیل کے ساتھ ابنائے وطن کے سامنے رکھنا.......... تاریخ کا سنہرا اور روشن عنوان ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کے جو مذہبی، دینی اور علمی ادارے مسلمانوں ہی کے مالی تعاون پر انحصار کرتے تھے وہ سنگین حالات کا شکار ہوئے۔ انہیں دو رُخ سے ہدف ستم بننا پڑا۔

(۱) مالی وسائل کی کمی اور بحیثیت عمومی مسلمانوں کے بڑے طبقے کی طرف سے عدم تعاون۔ (۲) قحط الرجال یعنی اچھے خاصے تربیت یافتہ افراد کا ترکِ وطن کرنا۔

ایسے میں شیخ الاسلام کی شخصیت، عظمت ووقار کے ساتھ کوہ کی طرح بلند اور اٹل ثابت ہوئی۔ آپ نے ہر نازک موقع پر تمام مسلمانوں کی رہنمائی بھی فرمائی، دستگیری بھی کی۔ خصوصاً

اپنے اساتذہ کے لگائے ہوئے اس ''علمی شجر'' کی آبیاری کے لیے اپنی زندگی کو صرف کیا اور یہ کاوش بھی کی کہ دیوبند کی شاخ افنان پر بادسموم کے جھونکے اثر نہ کرسکیں اور یہ ''منہاج سراج'' جس کی علمی و دینی کرنیں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں روشنی پھیلا رہی ہیں'...... اس سراج کو اندھیرا اگلتی ہوئی ظلمتوں کی قوتوں سے بچایا جاسکے۔

اس مختصر سے پس منظر میں حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی کی پیدائش سے لے کر دیوبند آنے تک کے واقعات اور نفسیاتی محرکات کو دیکھنا چاہئے۔ اس لیے کہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں پس منظر کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی کی ''قاسمیت''، وطن پرستی' سیاسی وابستگیاں پر جوش قایدانہ صلاحیت اور دارالعلوم دیوبند سے والہانہ وابستگی اسی پس منظر کا نتیجہ تھی۔

اب آئیے ان کے خاندانی پس منظر اور ان کی انفرادی زندگی کی جہتوں اور ابعاد پر بھی نظر ڈالی جائے۔

❁❁❁❁❁

باب دوّم

مولاناوحیدالزماں کی انفرادی زندگی کا جائزہ

مولاناوحیدالزماں کی انفرادی زندگی کا جائزہ

مولاناوحیدالزماں کی انفرادی زندگی اور خاندانی پس منظر کے بارے میں انہوں نے اپنی خودنوشت میں اپنے اور اپنے اسلاف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ معتبر اور مستند حالات اور کیا ہو سکتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"خاندان دادھیال شیوخ کیرانہ ننھیال شیوخ جھنجھانہ سسرال شیوخ کاندھلہ والد محترم مولانا مسیح الزماں دادا مولانا اسمٰعیل پردادا حضرت مولانا محمد حسین پورا شجرہ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے جا ملتا ہے" [1]

"قصبہ کیرانہ مغربی یوپی کا آخری قصبہ ہے یہاں مہابھارت کے مشہور کردار راجہ کرن کا راج تھا اسی مناسبت سے اس کا نام کیرانہ ہوا یہاں پیاز اور سرخ مرچ کی بہت بڑی تجارت ہے۔ اسی طرح ہاتھ کے پنکھوں کی صنعت بھی قریش برادری میں عورتوں کا عام مشغلہ ہے اور دور دور تک یہاں کے پنکھے بھیجے جاتے ہیں۔ کیرانہ کے نواحی علاقہ اور دیہات میں مسلمان کاشتکاروں کی اکثریت ہے اور دین داری بھی ہے اور اس دینداری کی وجہ زمانہ گذشتہ میں دو شخصیتوں کی سالانہ تشریف آوری اور فیض روحانی کو بڑا دخل ہے۔ ایک حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ جن کا قیام ہمیشہ ہمارے مکان پر ہوتا تھا اور ہر سال کم از کم ایک ہفتہ قیام کرتے تھے۔ دوسرے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی جن کا قیام مولانا احمد اللہ صاحب کے مکان پر ہوتا تھا" [2]

---

[1] خودنوشت سوانح کے چند اوراق۔ مولانا وحیدالزماں کیرانوی مشمولہ ترجمان دارالعلوم مولانا وحیدالزماں کیرانوی نمبر صفحہ ۲۶ تا ۴۸ جستہ جستہ تلخیص

[2] خودنوشت سوانح کے چند اوراق۔ مولانا وحیدالزماں کیرانوی مشمولہ ترجمان دارالعلوم

مولانا نے اپنی خود نوشت میں اپنی پیدائش کی تاریخ نہیں لکھی ہے لیکن مولانا خلیل امینی صاحب کے مطابق وہ ۱۷/فروری ۱۹۳۰ء مطابق ۲۷/شوال ۱۳۴۹ھ کیرانہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے[1] تھے۔ مولانا نے بھی اور ان پر لکھنے والے بیشتر اہل قلم نے ان کی حیات کے کچھ گوشوں کو نظر انداز کیا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک ان کی ابتدائی تعلیمی زندگی کے بارے میں مولانا خلیل امینی صاحب خاموش ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان کی حیات کے یہ پندرہ سولہ برس بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن اس دور کے حالات پر وہی لوگ روشنی ڈال سکتے تھے جو مولانا کے بزرگ تھے اور ان کے ساتھ رہتے رہے ہوں یا ان کے ساتھی تھے ظاہر ہے کہ سفر حیدرآباد اور دارالعلوم میں داخلہ سے پہلے بھی مولانا کی تعلیمی زندگی تھی اور انہوں نے اسی زمانے کے جاگیر داری اشرافیہ خاندانوں کے مطابق گھر ہی پر ابتدائی اردو، عربی، فارسی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور ان کے معلّم اول خود ان کے والد محترم تھے۔

لیکن زندگی کے ابتدائی نقوش میں صرف یہی پہلو اہم نہیں ہوتا کہ اس نے کیا پڑھا اور کس سے پڑھا اور کتنا پڑھا۔ انسانی زندگی میں حصول علم یقیناً آنکھ کھولتے ہی شروع ہو جاتا ہے مگر یہ علم کتابی ہی نہیں ہوتا بلکہ ماحول بھی جو علم عطا کرتا ہے وہ اہم ہوتا ہے۔ کھیت کی پگڈنڈیاں باغ کی جھکی ہوئی شاخیں ساتھیوں کے ہمراہ مختلف کھیلوں کی دلچسپیاں شب میں سونے سے پہلے اگر مذہبی ماحول ہے تب بھی اسی انداز کی لوریاں اور ان سب امور کے پہلو بہ پہلو یہ گوشہ بہت اہم ہوتا ہے کہ بچے کو کتنی سختیوں اور پابندیوں سے گذرنا پڑا۔

مولانا خود اپنے ہی ''اپنے مذاق طرب آگیں'' کا شکار ہوتے تھے۔ یہ گوشے ایسے ہیں جن کی طرف مولانا کی شخصیت پر استخراج نتائج کے وقت غور کرنا مفید ہوگا مولانا کی زندگی کا یہ گوشہ بھی واضح نہیں ہے کہ وہ ان ۱۵ برسوں میں جب کبھی کبھی ''تنہا چھوڑ دیے گئے'' تو ان کے

---

[1] خود نوشت سوانح کے چند اوراق۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی مشمولہ ترجمان دارالعلوم

مشاغل و مصروفیات کیا رہیں۔ بہر حال مولانا کی خودنوشت سے تصویر کا جو خاکہ بنتا ہے اسمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بچپن کی زندگی میں انہوں نے اپنے بزرگوں کو بھی دیکھا کہ وہ اپنی بات ہر حال میں منوانا چاہتے تھے اور مولانا بھی جس ماحول میں رہے اسمیں ان کی پرسنالٹی Personality بھی Dominating رہی۔ ایسی شخصیتیں قائدانہ صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ رہنما ثابت ہوتی رہیں لیکن ایسی شخصیتوں کے ساتھ جب ''شکست خواب'' کی منزل آتی ہے یعنی جو بات منوانا ہے وہ نہیں پوری ہوتی یا ان کی منشاء کے مطابق لوگ کام نہیں کرتے تو پھر انجام المناک ہوتا ہے۔

مولانا اپنے سلسلے میں خودنوشت میں لکھتے ہیں:

میرے والد صاحب مرحوم ''دارالعلوم'' سے فارغ ہو کر ''انجمن حمایت الاسلام'' ادتسر میں مبلغ کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے .... [1]

دادا صاحب کے انتقال کے بعد دادی صاحبہ اور احباب و متعلقین نے اصرار کیا کہ اب کیرانہ ہی میں مستقل قیام کر کے دادا صاحب کی جگہ کام کریں اور جامع مسجد کی تولیت کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا انتظام و انصرام سنبھالیں ....

والد صاحب کا مزاج دادی صاحبہ پر تھا۔ غصہ بھی بہت تھا اور سختی بھی۔ طبیعت میں فراخی اور سخاوت بھی تھی اور خوش مزاجی بھی۔ غیرت و حمیت خودداری اور شجاعت نمایاں وصف تھا۔ سخت مزاجی اور سخت گیری کے باوجود عفو و درگزر بے مثال تھا۔ ناراض ہوتے تو اس کا اظہار ہر طرح کرتے، ترک کلام کرتے، اس کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے لیکن اگر اس نے بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے باوجود معافی چاہ لی تو ان کا غیظ و غضب اس طرح زائل ہو جاتا کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہتا...... اگر کسی نے طاقت کا مظاہرہ اور ان کے حکم سے سرتابی کی تو اس کی خیر نہ تھی فوراً اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیتے تھے''۔ [2]

مولانا نے اپنے والد مرحوم کی سچائی، ایفائے عہد، نماز کی پابندی، وقت کی پابندی وغیرہ کا

---

[1] خودنوشت سوانح کے چند اوراق۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی مشمولہ ترجمان دارالعلوم

[2] خودنوشت۔ جستہ جستہ تلخیص ص ۴۲ تا ۴۸

تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

''ہم بھائیوں کو بھی ہمہ وقت چاق و چوبند رہنا پڑتا تھا۔ اور اندرون خانہ اور بیرون خانہ کے سب کام انجام دینا ہوتے تھے۔ سستی اور کام چوری کے سخت خلاف تھے......
مکتب میں پڑھنے کے زمانے میں تاکید تھی کہ وقت پر سیدھے مکتب جانا اور سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا کسی سے کلام یا ہنسی مذاق نہ کرنا کوئی چیز کسی سے نہ لینا اور اختلاط سے بچنا''۔[1]

مولانا نے یہ بتایا کہ سب لوگ مکتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور نگران اعلیٰ مولانا مسیح الزماں صاحب ہی تھے۔ ویسے مکتب میں محمد خالد صاحب بھی پڑھاتے تھے۔ لیکن خود نوشت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا پر ان کے والد صاحب کا ہی اثر تھا اور مکتب کے ماحول سے زیادہ ''گھر'' ان کا سب سے بڑا مکتب تھا۔

مولانا کے والد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے دو بچے ہوئے تھے مگر وہ دونوں اور ان کی والدہ ۱۲/۱۳ سال کے بعد ہی انتقال کر گئے تھے۔ مولانا پانچ بہن بھائی تھے۔ حمید الزماں، عمید الزماں، معید الزماں، فرید الزماں اور ایک بہن فریدہ جن کی شادی مولانا غیاث الحسن صاحب سے ہوئی۔ مولانا کے بھائیوں میں حمید الزماں صاحب کا انتقال ۵ جون ۱۹۹۰ کو ہو گیا۔ عمید الزماں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ دہلی یونی ورسٹی سے ایم۔اے بھی ہیں اور سعودی سفارت خانے میں کام کرتے ہیں۔ معید الزماں صاحب بھی دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور جامعہ ملیہ سے بی۔یو۔ایم۔ایس کرنے کے بعد دیوبند ہی میں اقامت اختیار کی۔ فرید الزماں نے بھی دیوبند میں قاری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ ملیہ سے بی.اے. کیا اور بعد میں کویت سفارت خانے میں ویزا سیکشن کے انچارج ہو گئے۔

---

[1] خود نوشت۔ جستہ جستہ تلخیص ص ۲۴ تا ۴۸

مولانا کی شادی کاندھلہ کے شیوخ خاندان میں ہوئی۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ بڑے صاحبزادے بدر الزماں صاحب ہیں جو حافظ ہیں دارالعلوم کے فارغ التحصیل ہیں۔ بی۔ اے پاس ہیں سعودی سفارت خانہ میں ملازم رہے اور پھر اب قطر میں سرکاری ملازم ہیں۔ صاحبزادی کی شادی بھی دیوبند میں حافظ مولوی محمد رفعت مدرس درجہ قرآن دارالعلوم دیوبند سے ہوئی۔ دوسرے صاحبزادے صدر الزماں صاحب ہیں انہوں نے 1991 میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ چھوٹے صاحبزادے قدر الزماں ہیں انہوں نے بھی دارالعلوم سے حفظ قرآن کے بعد مزید تعلیم حاصل کی۔

مولانا نے اپنے جس گھریلو ماحول کا تذکرہ کیا ہے اس میں دو باتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ا۔ پورے خاندان کا ماحول و مزاج دینی تھا اور اولادِ ذکور میں سبھی نے حفظ قرآن کیا۔ مولانا کے والد صاحب کی طرف سے دو مکتب قائم تھے۔ جس میں حافظ ہدایت اللہ اور حافظ رحمت اللہ یہ خوشگوار فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ سب کے ذمہ ۱۰۰ طلباء کا روزآنہ سبق سننا، نیا سبق پڑھانا اور شام کو سب کا آموختہ سننا ضروری تھا۔

اس تناظر کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ مولانا کی دارالعلوم دیوبند سے وابستگی ایک حد تک خاندانی تھی۔ کیونکہ بھائیوں نے، بچوں نے وہیں تعلیم حاصل کی۔ درسیات کے لیے اگر کوئی استاد مقرر بھی کیا گیا تو وہ بھی دیوبندی تھا جیسے مولانا محمد خالد صاحب فارسی اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مگر وہ بھی دیوبندی تھے۔

اسی پس منظر میں مولانا کا بچپن لڑکپن کی سرحدوں سے گذرتا ہوا عہد شباب کے دروازے پر دستک دینے لگا اور مولانا ''حیدرآباد فرخندہ بنیاد'' تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے حیدرآباد کے سفر کا زمانہ سن ۴۶ء بتایا ہے۔ ۴۶ سے پہلے کے باقیات مولانا نے اشارتاً تحریر کیے ہیں لکھتے ہیں:

"میرا سفر حیدر آباد ۴۶ میں اس وقت ہوا تھا جب تحریک آزادی زوروں پر تھی اور ہر جگہ انگریز ہندوستان چھوڑو کی صدا بلند تھی۔ حیدر آباد کی ریاست بھی متاثر ہونے لگی تھی۔ یہاں اتحاد المسلمین کی تنظیم قائم ہو چکی تھی۔ اور بہت مقبول عام و منظم تھی اس کا مقصد اعلان آزادی کے بعد ریاست کو مکمل طور پر آزاد ملک بنانا تھا۔ قاسم رضوی رضا کار تنظیم کے قائد تھے۔

یہاں علماء ہند یا تقسیم مخالف جماعتوں سے متعلق افراد سے بڑی نفرت تھی علماء کو بطور خاص ہدف ملامت بنایا جاتا تھا۔ حضرت مولانا ابولکلام آزاد حضرت مولانا سید حسین احمد وغیرہ کو بطور خاص ہندوؤں کا غلام کہتے اور ان کی شان میں گستاخی کو دینی فریضہ سمجھتے تھے۔[1]

مولانا وحید الزماں نے جو بات حیدر آباد کے لیے لکھی ہے وہ بڑی حد تک شمالی ہند کے کچھ حصوں پر بھی منطبق ہوتی تھی اور مسلم لیگی ذہنیت نے ان علماء کرام کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یوپی اور بہار پر ان حضرات کا اثر برقرار تھا۔ قوم پرور مسلمان جو اس زمانے میں نیشنلسٹ کانگریسی مسلمان کہلاتے تھے ان کا معقول حلقہ اثر تھا۔ فسادات کا جو ایک خونیں سلسلہ تھا اور جس کا نقطۂ آغاز مسلم لیگ کا ۱۶/ اگست ۴۶ء کو" راست اقدام" (ڈائرکٹ ایکشن) تھا اور کلکتہ میں ہزاروں آدمی مارے گئے تھے۔ بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی چنانچہ کولکتہ کا رد عمل یا ضمیمہ نواکھالی اور ٹیپرا میں دیکھنے میں آیا اور پھر بہار میں مسلمانوں کے خلاف بڑا زبردست فساد ہوا۔

تاریخ کے ان حروف فرسا اوراق کی ورق گردانی حد درجہ تکلیف دہ ہے لیکن یہ لکھنا ضروری ہے بلکہ تاریخی فریضہ ہے کہ ایسے موقع پر حضرت مولانا ابولکلام آزاد اور جمیعت علماء ہند نے ہمت، جرأت، حوصلہ اور تدبر سے کام نہ کیا ہوتا تو ہندوستانی مسلمان اور زیادہ پریشان حال ہوتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اسپین جیسا ان کا حشر ہوتا۔

ایسے وقت میں مولانا وحید الزماں حیدر آباد میں تھے۔ انکی علمی مصروفیات اور مشاغل کا

---

[1] خودنوشت ۔ ص ۴۵

تذکرہ کرنے سے قبل سیاست کے طالب علموں کیلئے مولانا وحید الزماں کا یہ بیان کافی دلچسپ ہوسکتا ہے عام طور سے تاریخ کی کتابوں میں یہ پہلو نہیں ملتا۔ مولانا وحید الزماں لکھتے ہیں:

"مولانا ابولکلام آزاد نے اسی ریاست کو بچانے کے لیے بڑی حکمت وتدبر سے کام لیا اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کو اس پر آمادہ کرلیا کہ ریاست کا وجود کچھ شرائط کے ساتھ باقی رکھا جائے چنانچہ اس وقت کے ریاست کے وزیر اعظم نواب چھتاری کے ذریعہ نظام سے گفت وشنید کا آغاز ہوا لیکن جوں ہی قاسم رضوی اور دیگر لیڈروں کو علم ہوا جو ریاست کو ہندوستان سے بالکل الگ ایک آزاد ملک بنانے کے لیے کوشاں تھے تو نظام کو ان کے محل میں محصور کردیا اور کسی سے ملنے جلنے پر سخت پابندی لگادی اور ایک عارضی حکومت تشکیل دی گئی جو ریاست کے نظام حکومت پر قابض ہوگئی اتحاد المسلمین کے رضاکاروں کو نواب چھتاری کی دہلی آمد ورفت کا علم ہوا کہ وہ کوئی فارمولہ لے کر نظام سے بات کرنے آئے ہیں تو ان کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک کیا گیا جو نا قابل ذکر ہے"[1]

مولانا ابولکلام آزاد کا فارمولہ:

مولانا آزادؔ نے حکومت کو آمادہ کر کے جو فارمولہ تیار کیا تھا اور جسے حکومت تقریباً منظور کر چکی تھی حسب ذیل تھا:

۱۔ ریاست حیدرآباد اندرونی طور پر خود مختار ہوگی۔

۲۔ دفاع امور خارجہ اور مواصلات میں مرکز کے تابع ہوگی۔

۳۔ ضرورت کے مطابق پولیس اور دس ہزار مسلح فوج ہوگی۔

۴۔ ریاست کا اپنا نظام اپنا سکہ اور اپنا جھنڈا ہوگا۔

۵۔ سربراہ ریاست کا حسب سابق لقب ہوگا اور ان کا حسب سابق وزیر اعظم ہوگا[2]

نظام تو چونکہ محصور تھے اس لیے عارضی حکومت نے اس فارمولہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور عابد روڈ کے چوراہے پر بہت بڑا بورڈ لگا دیا گیا جس پر مولانا آزاد کی بڑی تصویر بنی

---

[1] خودنوشت ص ۴۵　　[2] خودنوشت۔ ص ۴۶

ہوئی تھی اور گلے میں پڑی زنجیر سے ایک گاڑی گھسیٹے ہوئے دکھایا گیا تھا جس پر مسلمانوں کا غدار اور ہندوؤں کا غلام لکھا ہوا تھا۔ اس پر یہاں کے لوگ بہت خوش تھے اور یقین کیے ہوئے تھے کہ اگر ہندوستان نے فوج کشی کی تو پاکستان کی فوجیں فوراً مدد کے لیے آجائیں گی۔[1]

غرض کہ ان حالات میں مولانا وحید الزماں کا قیام حیدرآباد میں مختصر رہا اور انہوں نے اس موجہ خوں کو نہیں دیکھا جو اہل حیدرآباد کے سروں سے گذر گئی تھی۔ پھر مولانا واپس چلے آئے تھے لیکن یہ تھوڑا سا وقفہ مولانا کی زندگی کے لیے بہت اہم تھا۔ اول تو حیدرآباد کا اسلامی ماحول اور بالخصوص حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کی اشاعت' درس گاہ جامعہ نظامیہ اور ریاست حیدرآباد کا دیوبند سے تعلق' یہ سب تو اپنی جگہ پر تھا ہی لیکن ایک گوشہ ایسا بھی تھا جس نے مولانا کے ذوق علم کو مہمیز کیا اور عربی سے ان کی وابستگی' عربی زبان وادب خاص طور سے عربی کو عام بول چال کی زبان کی حیثیت سے استعمال کرنا۔ یہ سارے گوشے حیدرآباد کا فیضان تھے۔ مولانا کے عزیز حافظ واجد علی جو مولانا کے چچا بھی ہوتے تھے اور ماموں بھی وہ حیدرآباد میں ہی رہتے تھے وہ کیرانہ تشریف لائے اور وہ مولانا کو اپنے ساتھ حیدرآباد لے آئے۔ ان کا قیام نام پلی میں تھا یہ محلہ مسلمانوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اول تو آبادی کی بنا پر دوسرے یہاں درگاہ یوسفین بھی تھی اور پھر تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر معظم پورہ عرف ملے پلی کی بڑی مسجد بھی تھی جہاں ہمیشہ دینی طلباء کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ حافظ واجد علی اسی نام پلی میں رہتے تھے اور نام پلی کی مسجد میں ایک کوارٹر میں علامہ المامون الدمشقی رہتے تھے۔ مولانا وحید الزماں جب حیدرآباد پہنچے تو ان سے تقرب وتوسل حاصل ہوا۔ علامہ صاحب سات زبانوں سے واقف تھے اور ان کا طریقۂ درس بھی روایتی نہ تھا۔ مسجد میں ایک گھنٹہ عربی زبان کا درس دیتے تھے۔ مولانا ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ دس بجے کے قریب مکان سے نکلتے اور مختلف اداروں اور دفتروں میں جا کر لوگوں

---

[1] خودنوشت ص ۴۶

سے ملاقاتیں کرتے ہمیشہ فصیح و بلیغ عربی بولتے اور دوسروں کو حتی کہ بڑے بڑے عربی باشندوں کو لغت فصحٰی بولنے کی تاکید کرتے لغت عامیہ بولنے والوں کو ٹوکتے اور کہتے لاتُفسدو اللغة العربية میں ایک ماہ ان کے ساتھ صبح سے شام تک رہا ہر جگہ پیدل جاتے تھے میں تھک جاتا تھا۔ مگر وہ نہ تھکتے تھے ان کی گفتگو کو غور سے سنتا اور ان کے جملوں کو محل استعمال کے ساتھ ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا کبھی کوئی جملہ بنا کر اسی کی تصیح و تصویب چاہتا" [1]

کبھی تو بڑی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہتے: اَنْتَ فُقْتَ الْعَرَبْ

اور کبھی ہنستے اور کہتے: اَنْتَ لَا تعرفَ الْعَرَبية (آپ عربی نہیں جانتے) [2]

عربی زبان سے مولانا کی والہانہ دلچسپی کے بارے میں مولانا وحید الدین خاں (مدیر الرسالہ) کا ایک مضمون الجمیعت کے ۷ جون ۱۹۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور یہ مضمون انٹرویو کی شکل میں تھا۔ اس میں یہ درج ہے کہ مولانا وحید الزماں نے علامہ محمد المامون کے بارے میں بتایا کہ وہ چھ زبانیں جانتے تھے۔ ترکی، عربی، جرمنی، فرانسیسی، انگریزی اور اُردو۔ علامہ وحید الزماں کیرانوی نے ایک سوال کے جواب میں کہا:

> "حیدر آباد کے سفر سے پہلے عربی زبان میرے لیے بس اس طرح کی ایک چیز تھی جس کو میں نے نحو جیسی کتابوں میں پایا تھا۔ فَعَلَ فَعَلُوْا کی گردان وغیرہ۔ اب معلوم ہوا کہ عربی ایک زندہ زبان ہے جو اردو کی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں یہ میرے لیے گویا ایک دریافت تھی جس نے میرے سامنے ایک نئی دنیا کھول دی تھی"۔ [3]

مولانا وحید الدین خاں کے ایک سوال کے جواب میں مولانا وحید الزماں نے فرمایا۔ مطالعہ میں عربی اخبارات و رسائل خصوصیت سے دیکھتا تھا ۴۸ء میں دار العلوم دیوبند

---

[1] خودنوشت مولانا وحید الزماں کیرانوی مشمولہ ترجمان دار العلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر صفحہ ۴۲

[2] خودنوشت مولانا وحید الزماں کیرانوی مشمولہ ترجمان دار العلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر صفحہ ۴۲

[3] حوالہ ترجمان دار العلوم انٹرویو الرسالہ الجمیعہ۔ ص ۵۷

آ کر داخلہ لیا۔ داخلے کے وقت عربی تو کچھ بول لیتا تھا مگر عربی رسائل وغیرہ پڑھنے کی استعداد ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دار العلوم میں اس سلسلے میں کچھ نہیں تھا۔ عربی انشاء بھی نہیں تھی اور اس معاملہ میں اپنے شوق ولگن کے سوا کوئی چیز میری رہنما نہ تھی۔ میں نے عربی اخبارات ورسائل حاصل کر کے پڑھنا شروع کیا مگر استعداد کا عالم یہ تھا کہ ماہنامہ العرب کے ایک ایک صفحہ کو دس دس بار پڑھتا تھا۔ پھر بھی پوری بات سمجھ میں نہیں آتی تھی میرے پڑھنے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ میں کسی مضمون کو اس اعتبار سے نہیں پڑھتا تھا کہ اس میں جو بات ہے وہ کیا ہے بلکہ صرف اس اعتبار سے دیکھتا تھا کہ کسی مفہوم کو عربی میں کس طرح ادا کیا گیا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں نے دریافت کیا کہ اس طریقۂ مطالعہ کو مثال سے واضح فرمائیے۔ میں نے کہا:

> فرض کیجئے ایک جملہ ہے ساشکوك الی ابیك لانك تغیب عن الدروس کثیرا ...... عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم عربی عبارت کا اجمالی مفہوم سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے اس لیے وہ اردو اور عربی تعبیر کے فرق کو نہیں سمجھ پاتا۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا جملہ سمجھنے میں ایک طالب علم کو دقت پیش نہیں آئے گی لیکن اگر اسی سے کہا جائے کہ اس کی عربی بتاؤ کہ میں تمہارے والد سے شکایت کروں گا تو عین ممکن ہے کہ وہ کہہ دے۔ ساشکوك من والدك...... میرا طریقہ تھا کہ جب اس طرح کا جملہ آیا تو میں نے خصوصیت سے نوٹ کیا کہ ایسے موقع پر عربی میں شکایت کے ساتھ الیٰ کا صلہ آئے گا۔ اسی طرح مطالعہ میں میرا انہماک اسی قدر بڑھا ہوا تھا کہ اکثر ایسا ہوتا کہ پورا مضمون پڑھ ڈالتا بلکہ کئی کئی بار پڑھتا اس کے باوجود اس سے لاعلم رہتا کہ پورے مضمون میں بات کیا کہی گئی ہے کیونکہ میرا ذہن عام طور پر اخذ تعبیرات پر مرکوز رہتا تھا۔[1]

عربی زبان سے مولانا کہ یہ وابستگی انکے دور طالب علمی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب دار العلوم میں زمانہ طالب علمی تھا اس وقت بھی عربی سے ان کی وابستگی قابل مثال تھی:

---

[1] انٹرویو الجمیعۃ بحوالہ ترجمان دار العلوم مولانا کیرانوی نمبر صفحہ ۵۸

اس دور کا قاعدہ تھا کہ جو طالب علم کم از کم پانچ پرچوں میں ۵۰ نمبر لاتا اور کسی پرچے میں ۴۰ نمبر سے کم نہیں ہوتا اُسے خصوصی انعام دیا جاتا تھا۔ ۱۳۶۹ھ کے نتائج امتحانات سناتے ہوئے حضرت مدنی (حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ) نے نام پکارا وحید الزماں کیرانوی اور جب نتائج کا اعلان فرمایا تو سارے مجمع نے واہ واہ اور شاباشی کہا۔[1]

یہیں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا زمانۂ طالب علمی ان کی شخصیت کے خدوخال کو ابھار رہا تھا جو آگے چل کر عربی زبان کے معلم و مدرس کی شکل میں سامنے آئی۔ ان کی ابتدائی و متوسط تعلیم کے سلسلے میں ان کے برادر محترم حافظ عبید الزماں مرحوم کا بیان ہے کہ:

''مولانا بچپن میں کبڈی، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی اور اس طرح کے دیگر کھیلوں میں جن میں عام طور پر بچے لگے رہتے ہیں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے بلکہ ان کی دلچسپی کا کھیل یہ تھا کہ وہ کاغذ پر مکانات کے نقشے بناتے۔ قینچی سے خوبصورت مساجد اور تعمیرات کے فولڈ تراشتے اور اچھے اچھے ڈیزائین تیار کرتے۔ ایک مرتبہ اپنے ہاتھ سے مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کو تراش تراش کر اینٹیں بنائیں اور ان سے گھر میں چھوٹا سا کمرہ تیار کیا جو بہت پیارا اور خوب صورت تھا۔ مولانا کے والد مرحوم کے پاس علامہ شبیر احمد عثمانی کی آمد و رفت رہتی تھی جب علامہ عثمانی نے مولانا کا بنایا ہوا کمرہ دیکھا تو بہت تعجب کیا کہ کمسنی اور اتنی فنکاری''۔[2]

مولانا نے بچپن میں ایک خواب بھی دیکھا تھا کہ کیرانہ کی جامع مسجد کے حوض میں وضو کر رہے ہیں اور حوض سے روئی کے گالے ابل ابل کر آسمان پر پھیل رہے ہیں۔ حافظ محمد عیسیٰ مرحوم جو مولانا کے ماموں بھی تھے ان سے جب یہ خواب بیان کیا تو انہوں نے اس کی تعبیر میں یہ فرمایا کہ یہ بچہ آگے چل کر اپنے علم سے ساری دنیا کو فیضیاب کرے گا۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ خواب کے سلسلے میں دور حاضر کی نفسیات یہ بتاتی ہے کہ انسانی لاشعور میں شخصیت کے جو ابتدائی نقوش ہوتے ہیں خواہشات، جذبات،

---

[1] مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی عنوان میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا مشمولہ ترجمان دار العلوم کیرانوی نمبر صفحہ ۵۱
[2] کوہ کن کی بات۔ ص ۲۲۸

تخیلات وہ سب خواب میں ابھر آتے ہیں بے شک ایک مذہبی بزرگ کو اس کی تعبیر پیش کرنے کا حق حاصل تھا اور انہوں نے صحیح تعبیر فرمائی لیکن اسے یوں بھی دیکھنا چاہیے کہ مولانا بچپن ہی میں عالی شان عمارتوں سے ذہنی طور پر منسلک تھے اور عمارتوں کے نقوش اور ان کے خدوخال مولانا کے ذہن پر مرتسم رہتے تھے۔ تعمیرات سے ان کی دلچسپی اوائل عمری سے تھی اگر وہ انجینئرنگ کی طرف متوجہ ہوتے ہوتے تو بہت بڑے آرکیٹکٹ ہوتے۔ فن تعمیر سے بے پناہ دلچسپی کا ایک نمونہ دارالعلوم دیوبند کی تزئین، جدید تعمیرات تھیں مولانا کے خواب اس سمت اشارہ کرتے ہیں۔

انہوں نے شوال ۱۳۶۷ھ مطابق اگست ۱۹۴۸ء دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ یہاں انہیں ایسے قابل فخر اساتذہ کے سامنے زانوے ادب تہہ کرنے کا موقع ملا جو پورے ملک کے لیے باعث افتخار تھے۔ ان میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدی مدنی ؒ۔ علامہ ابراہیم بلیاوی ؒ، مولانا محمد اعزاز علی امروہوی ؒ، مولانا معراج الحق ؒ، مولانا محمد حسین بہاری ؒ، مولانا سید فخرالحسن صاحب جلال آبادی، مولانا نصیر احمد خاں صاحب ؒ وغیرہ کے آفتاب علم کی نورانی کرنوں سے اکتساب فیض کیا۔

عربی زبان وادب میں مولانا بچپن سے ہی ممتاز تھے اور یہاں آ کر انکے جوہر اور کھلے:

ان کی طالب علمانہ زندگی بھی بہت فعال رہی۔ وہ جمیعت طلباء کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ "مدنی دارالمطالعہ" کے بھی ناظم اعلیٰ رہے۔ اور طلباء میں ان کی ہردل عزیزی وہ نقش اول تھی جو آگے چل کر جب نکھری تو اس طرح کہ وہ اپنے شاگردوں کے میر کارواں قرار پائے۔ چونکہ عربی زبان پر مکمل عبور تھا اسی وجہ سے طالب علمی کے دور میں بھی جو مہمان آتے تھے ان سب کا استقبال اور سپاس نامہ وغیرہ لکھنا اور مختلف النوع کام جو عربی میں ہوتے تھے وہ سب آپ ہی انجام دیتے تھے۔

آپ کی تعلیمی مدت پانچ سال رہی اور تعلیمی ریکارڈ میں امتیاز رکھنے کی وجہ سے آپ کو پندرہ روپیہ ماہانہ دارالعلوم کی جانب سے ملتا تھا۔

اسی میں کوئی شک نہیں کہ آپ مثالی طالب علم تھے جو اساتذہ کے محبوب اور اپنے ہم درس ساتھیوں میں مقبول اور پورے دارالعلوم میں معروف رہے۔ اپنے ہم جماعت اور ہم درس طلباء میں آپ کی مقبولیت کا سبب صرف علمی امتیازی خصوصیات ہی نہ تھیں بلکہ اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کو اس میں دخل تھا۔ یوں بھی آپ اپنے مزاج، حسن ذوق اور نفاست طبع کی بناء پر ممتاز رہے۔ آپ ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے۔ یہاں اس نکتہ کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے کہ اس طرح کی شخصیتوں میں ظاہری وجاہت کو اگر کوئی دخل ہوتا بھی ہے تو وہ بس لمحاتی اور عارضی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی نے وحید الزماں مرحوم کا سراپا کھینچا ہے:

> ''منحنی جسم، کتابی چہرہ، کشادہ جبیں، قدرے کشادہ جسم، کشادہ قامت، گندمی رنگ مائل بہ سفیدی، آنکھوں سے ذہانت، عبقری کے آثار نمایاں، چھریرا بدن تیر کی طرح مستقیم القد، رفتار میں وقار گفتار میں اعتماد و تاثیر، حرارت و صلاحیت و دلکشی و حلاوت ایک نفیس سانچے میں ڈھلی ہوئی ان کی پر کشش شخصیت کی مجموعی وضع پر سفر یا حضر میں جس اجنبی کی نگاہ پڑ جاتی وہ صاحب شخصیت کے غیر معمولی ہونے کا یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور دارالعلوم میں خصوصاً اور دیوبند میں عموماً ادھر سے بھی گذرتے مرکز نگاہ رہتے''[1]

بظاہر ایسی شخصیتیں جو متناسب جسم رکھتی ہوں...... لاکھوں ہو سکتی ہیں لیکن ایسے جسمانی خد و خال کے پیچھے جو تڑپ، حدت، دوسروں کے لیے کچھ کرنے کی تمنا ہوتی ہے وہی جسم کو بھی کشش عطا کرتی ہے اور جو مزاجی خصوصیات ہوتی ہیں انہیں سے ظاہر میں نظر آنے والی خصوصیات بنتی یا بگڑتی ہیں۔ مثلاً اگر مزاج میں نفاست اور خوش ذوقی ہے تو ایسی شخصیت بلاشبہ جامہ زیب ہوگی۔ اگر زندگی میں کچھ کرنے کی امنگ ہے تو ایسا آدمی پھرتیلا نظر آئے گا کسی کے

---

[1] کوہ کن کی بات ۱۸۶

اندرون یا باطنی کوائف سے اُس کی ظاہری شخصیت بنتی ہے اور ظاہر سے باطن کا اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی کی جامہ زیب شخصیت لباس کے معاملے میں بھی نوک پلک اور درتگی کا خیال اور وراثت میں جو خوش ذوقی نفاست اور ڈسپلن ملی تھی اُس نے مولانا کی پوری شخصیت کو متاثر کیا تھا۔

ایک طرف جاگیرداری اشرافیہ کا خاندانی پس منظر ہر چیز میں نوک پلک کی درتگی و آراستگی اور دوسری طرف خالص دینداری کا ماحول' گھر پر آنے والے بزرگوں میں جید علما' اُن کا طرز گفتگو اُن کا طریقہ نشت و برخاست......سب ایسے گوشے تھے جس سے بچپن سے لیکر لڑکپن تک اور بلوغ کی عمر سے عہد شباب تک......مولانا نے اثر قبول کیا اور انہیں عوامل سے اُن کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوئی۔

وراثت میں انہیں اپنے والد مرحوم سے جو خصوصیات ملی تھیں۔انہوں نے اُس کی پاسداری بھی کی اور حتی الامکان اس پر عمل پیرا بھی رہے۔

اُن کی تحریر کے مطابق اُن کے والد مولانا مسیح الزماں صاحب مرحوم (اگر بہت ہی محتاط لفظوں میں لکھا جائے تو......) محرور المزاج تھے اور یہ مزاجی کیفیت جاگیرداری اشرافیہ کی خصوصیت ہوتی ہے کہ" گاہے بہ سلام برنجند' گاہے بہ دشنام خلعت دہند" اور یہی شاہانہ مزاج کہا جاتا تھا۔

اس حد تک تو مولانا وحید الزماں میں محرور المزاجی نہ تھی مگر تلون مزاجی اور سیمابیت مولانا کے حصہ میں ضرور آئی تھی جس کا نمونہ بعد کے واقعات میں نظر آتا ہے مگر جس کے نقوش بچپن ہی سے ابھرنے لگے تھے۔

اپنے خاندان کی روایات کے مطابق مولانا وحید الزماں کی شادی شیوخ میں ۱۹۵۰ء

م ۱۳۶۹ھ میں کاندھلہ کے انتظام احمد ابن حافظ حبیب احمد صدیقی کی چھوٹی صاحبزادی محترمہ فخر النساء سے ہوئی۔

"خاندانی روایات" اس لیے لکھا گیا کہ عموماً لڑکیوں کی شادی اُس دور میں بالخصوص جاگیردار گھرانوں میں جلد کر دی جاتی تھی لیکن علماء کے یہاں یہ روایت لڑکوں کے لیے بھی تھی کہ بلوغ کے بعد زیادہ وقفہ نہیں گزرنے دیا جاتا اور شادی کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا ابھی زیر تعلیم ہی تھے۔ جب اُن کی شادی کر دی گئی۔ اس طرح ان کی زندگی کا یہ پہلو بھی بہت اطمینان اور روایتی انداز میں آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے' مولانا کا گھریلو ماحول پر سکون تھا۔ شادی سے قبل بہنوں کے مزاج اور سگھڑپن نے جو فضا تعمیر کی تھی۔ شادی کے بعد اسی طرح کی خوشگوار فضا کی تعمیر مولانا کی شریک حیات نے کی اور مولانا نے اس فضا کے لیے اپنی شریک حیات کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔

جس طرح اُن کے بھائی اور بہن مل جل کر رہے اور ان میں اتحاد و اتفاق اور یگانگت رہی وہی فضا اُن کے بیٹوں اور بیٹی کے درمیان برقرار رہی۔

اس سلسلے میں مولانا نے خودنوشت میں لکھا ہے:

> اللہ کا فضل و کرم ہے کہ جس طرح بھائیوں اور بھاوجوں میں خوشگوار تعلق اور چھوٹے بڑے کا خیال ہے اسی طرح چاروں اولاد فرمانبردار اور نیک چلن ہے۔ میں اولاد کی طرف سے ہر طرح مطمئن اور خوش ہوں۔ اولاد کا نیک چلن اور ماں باپ کا فرمانبردار ہونا اور خدمت گذار ہونا بڑی سعادت اور خدا کا انعام ہے اس پر جتنا بھی خدا کا شکر ادا کروں کم ہے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء[1]

اس طرح بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے ایک ذہین اور عبقری شخصیت کے باوجود خیال و خواب کی دنیا کو نہیں اپنایا بلکہ وہ ایک عملی انسان بھی رہے اور انہوں نے اس پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھا کہ انسانی زندگی میں سب سے اہم گوشہ اُس کے سماجی رشتوں اور روابط کا

[1] خودنوشت ترجمان دارالعلوم ص ۳۸، ۳۷

ہوتا ہے۔ دراصل یہیں سے چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں فرد کو بڑی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اور یہ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخصیت عوامی یا سماجی زندگی میں بہت فعال اور کارکرد ہے تو اُس کی گھریلو یا انفرادی زندگی ویران، سنسان اور اُجاڑ ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اہم سیاسی رہنماؤں کی زندگی کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ مثلاً محمد علی جناح، سردار ولبھ بھائی پٹیل مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد یا اُسی عہد کے دیگر رہنما.....، دورِ حاضر میں شری اٹل بہاری واجپائی کنوارے رہے، بے شک پنڈت نہرو ایک لڑکی کے باپ تھے مگر سیاسی سرگرمیوں نے ان سے ان کی اہلیہ کو جدا کر رکھا تھا۔ ایسے لوگ بہت سے جھمیلوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

غرض یہ کرنا ہے کہ مشغولیات، سرگرمیاں، مصروفیتیں، تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف کی دنیا میں جب انسان کھو جاتا ہے تو کس حد تک اپنے بھائی، بہن، بیوی، بچوں سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور یہ لاپرواہی کوئی وصف نہیں ہے بلکہ ایسے زندگی کا لاابالی پن یا کمزور ذمہ دارانہ مزاج کہنا چاہیے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نے یہ خیال رکھا کہ زندگی یکرنگی کا نام نہیں ہے بلکہ ''گل صد رنگ'' سے عبارت ہے۔ ایک شخصیت بیک وقت کئی شخصیتوں میں تقسیم ہو جاتی ہے یعنی ایک آدمی کسی کا باپ بھی ہوتا ہے۔ اُسے پدرانہ شفقت برتنی پڑتی ہے اور خود اپنے ذریعہ سے وجود میں لائے خاندان کی ذمہ داریاں بھی نباہنی پڑتی ہیں۔ وہ شوہر بھی ہوتا ہے اور اُسے نازک نفیس اور لطیف احساسات کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہنر بھی آنا چاہیے۔ اور اگر وہ شخصیت مذہبی ہے تو اُسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ کی رو سے زوجہ کے حقوق کو ادا کرنا واجب ہے اور یہی شخص جو باپ ہے، شوہر ہے، وہ بھائی بھی ہوتا ہے، اور بیٹا بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے اخلاف کا مخلص دوست بھی ہوتا ہے، اپنے اسلاف کی صحت مند روایات کا امین بھی ہوتا ہے۔ ان رشتوں اور تعلقات میں ذرا سا توازن بگڑا اور سماجی زندگی کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہے۔

اور یہ توازن دوسروں کے ساتھ تعلقات رکھنے میں بھی ہے۔ خود دوسری طرف اپنی شخصیت کے اتنے ابعاد (Dimensions) ہوتے ہیں کہ ان میں اعتدال اور توازن پیدا کرنا دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً مولانا کیرانوی عربی کے معلم و مدرس تھے اس زبان کی تدریس کے ساتھ انہیں تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ خطاطی اور خوشنویسی کے بھی پرستار تھے نماز صبح کے بعد کئی گھنٹے تک کتابت کیا کرتے تھے۔ یہ اُن کا ذوق بھی تھا اور وسیلۂ رزق بھی تھا۔ ان تمام امور کے ساتھ اُن کی شخصیت کا یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جسے ان کی خوش ذوقی اور نفاست طبع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بستر کی چادر پر سلوٹیں نہ ہوں تکیہ سلیقہ سے رکھا ہو کھانے کا انداز بھی شائستگی کی حدود کے اندر ہو اگر کوئی کھلی پلیٹ میں کھانا لے کر جا رہا ہے تو اُسے ٹفن میں لے کر جانا چاہیے یا پھر پلیٹ ڈھکی ہوئی ہو! کھانا کھاتے ہوئے منہ سے آوازیں نکالنا ذوقِ سلیم پر گراں گذرتا ہے۔ اسی طرح چائے کی چسکی بھی اگر لینا ہے تو "سُڑک سُڑک" کی آوازیں نہ نکلیں۔ چائے اعلیٰ درجہ کی ہو نفیس ہو جس برتن میں ہو وہ صاف ستھرا ہو...... پھوہڑ پن ناقابل برداشت ہے۔ ہر جگہ سلیقہ مندی کا اظہار ہو۔

ان تمام امور میں اعتدال و توازن پیدا کرنا' ان میں ہم آہنگی قائم کرنا بہت دشوار اور مشکل کام ہے۔ مگر مولانا زندگی کے اس پل صراط سے یوں گذرتے رہے جیسے تختۂ گل پر چہل قدمی کر رہے ہوں۔ انہوں نے رشتوں کا بھی خیال رکھا، ذمہ داریوں کو بھی نبایا' فرائض کو بھی پورا کیا اور ایک اچھے اور سچے مسلمان کی طرح حقیقی دینداری کی زندگی بسر کرنے کی سعی مشکور کی۔ ان کی زندگی کے جو نقوش ہیں ان میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ وہ راتوں کو اٹھ کر تہجد یا اعتکاف یا مجاہدہ' مراقبہ میں اپنا وقت گذارا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں وہ بھی بہت بڑا دیندار تھا جو اس زندگی کو نعمات الٰہی میں شمار کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی میں زندگی کو اس طرح بسر کرتا تھا کہ رضائے الٰہی کا حصول ہو۔

انہوں نے زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کی

بلکہ پوری دیانت کے ساتھ فرائض کو ادا کیا۔

یہاں اس رخ کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ مولانا کو سیاست میں بھی دلچسپی تھی وہ جمعیتہ العلمائے ہند کے سرگرم کارکن بھی رہے اور اُسی دور میں مسلم لیگ کے خلاف بھی رہے جس دور میں بڑے بڑے زعمان ملت نعروں کا شکار ہو کر اپنے آباواجداد کی دہلیز چھوڑ خیال وخواب کی جنت کی طرف چلے گئے۔ صرف نیاز فتح پوری یا جوش ملیح آبادی کا ہی نام کیوں لیجئے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی جیسے ثقہ حضرات سے بھی ''خطائے اجتہادی'' سرزد ہوئی۔ حضرت مولانا قاری طیبؒ جیسی شخصیت بھی پاکستان چلی گئی تھی یہ تو حضرت شیخ الاسلام کی زبردست شخصیت کا اثر تھا یا اپنی خاندانی روایات کا فیضان تھا یا ''قاسمیت'' کا اعجاز تھا کہ وہ واپس تشریف لائے تھے۔

مولانا وحید الزماں کو سارے سنہرے مواقع میسر تھے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اُن کے خاندانی مشفق وسرپرست تھے اور وہ پورے اعزاز واحترام کے ساتھ پاکستان میں تھے اور تھانہ بھون کے کئی حضرات بھی پاکستان میں موجود تھے۔ مگر مولانا وحید الزماں نے شیخ الاسلام کے اچھے اور سچے شاگرد کی حیثیت سے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور یہاں کی سیاست سے خود کو اس طرح سے وابستہ رکھا جیسے کنول کے پھول کا تعلق جھیل کے پانی سے رہتا ہے۔ وہ بعد میں جمعیتہ العلمائے ہند سے الگ ہوئے اور ملّی جمعیت العلماء قائم کی مگر اسی سیاسی نظریہ کا دامن اُن کے ہاتھ سے نہ چھوٹا جس سیاسی نظریہ کی روایات کا نقطۂ آغاز مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے جسے پروان چڑھایا تھا اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی' مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی جیسے محترم بزرگوں نے اس کاروان فکر کو آگے بڑھایا تھا۔

مولانا وحید الزماں کے سوانحی سلسلہ کی آخری منزل ان کے معاشی سفر کا تذکرہ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا فن کے اعتبار سے خود کفیل تھے یعنی اگر وہ چاہتے تو صرف کتابت سے

اتنا کما سکتے تھے کہ اُن کی ضروریات کے لیے کافی ہوتا۔

لیکن کتابت کو انہوں نے ضمنی حیثیت دی۔ دار العلوم سے تحصیل علم کے بعد وہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پرسنل سکریٹری رہے۔ رئیس الاحرار کے ساتھ مولانا کا یہ تعلق ۱۹۵۶ء تک برقرار رہا۔ مولانا لدھیانوی کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا مگر کچھ ہی عرصہ بعد اردو کے مقبول ترین فلمی رسالے ''شمع'' کے مالک حافظ محمد یوسف مرحوم نے ایک کتب خانہ مکتبۂ دینیات کے نام سے قائم کیا تھا۔ مولانا نے ان کے لیے کتابیں لکھنی شروع کیں۔ اس کے بعد مولانا دیوبند آگئے۔ یہ عبوری دور تین برس رہا۔ دیوبند آنے کے بعد تصنیف وتالیف کا کام شروع ہوا۔ اور ''دار الفکر'' کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا خلیل امینی لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۹ء میں دیوبند کی جامع مسجد کے عقب میں حافظ ظہیر احمد صاحب عرف حافظ دھنیے کے مکان کی بیٹھک میں ایک جامع المقاصد ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد تصنیف و تالیف، نشر واشاعت، اسلامی اور ادبی صحافت کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فضلاء وطلبا کو بھی عربی زبان کی شوق انگیز و نتیجہ خیز تعلیم اور اسی کے ساتھ ان کی تربیت بامقصد گذارنے کا شعور بیدار کرنا تھا۔
>
> مولانا کی تصنیف وتالیف سے وابستگی کا ایک نمونہ دار الفکر سے مجلّہ ''قاسم'' کا اجرا تھا۔ اس زمانے میں مولانا نے ایک معیاری دار الکتب بھی قائم کیا۔ جس کا نام مکتبۂ نظامیہ تھا۔ اس کے لیے ایک متمول عالم مولانا شوکت علی خاں مرحوم بھٹہ والے تھے اس کے ذریعہ چھوٹی چھوٹی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ لیکن بعد میں یہ مکتب بند ہوگیا''۔[1]

مولانا وحید الزماں نے اپنی مشہور عربی لغت ''القاموس الجدید'' اسی زمانے سے ترتیب دینی شروع کردی تھی۔ جب آپ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کے ساتھ تھے اس کے دونوں حصے یعنی عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی اسی زمانہ میں شائع ہوئی۔ مولانا فیضل الرحمان ہلال عثمانی کے حوالہ سے مولانا خلیل امینی لکھتے ہیں:

---

[1] وہ کوہ کن کی بات۔ مولانا نور عالم خلیل امینی ص ۲۵۲ [2] وہ کوہ کن کی بات۔ مولانا نور عالم خلیل امینی ص ۲۵۲

''ڈکشنری مرتب کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے برابر سائز کے کاغذ کے ٹکڑوں پر الفاظ لکھتے پھران کو حرفوں کے حساب سے الگ الگ ڈبوں میں رکھتے جاتے مکمل ہو جانے کے بعد ان کاغذ کے ٹکڑوں کو کاپی میں منتقل کرتے''۔[1]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود کوزہ، خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کی مثال مولانا وحید الزماں کیرانوی پر کم از کم تصنیفی اور تالیفی زندگی پر مکمل طور سے منطبق ہوتی ہے۔ مسودہ تیار کرنا۔ اس مسودہ پر نظر ثانی کے بعد اس کی کتابت کرنا اور یہ سارا کام موصوف خود انجام دیتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی نے تحریر فرمایا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے صبر آزما، جاں گسل اور جاں گداز لمحات سے مولانا کو گذرنا پڑتا تھا خطاطی یا کتابت کی پیچیدگیوں اور دشواریوں سے عام آدمی کیا واقف ہوگا وہ لوگ بھی کم واقف ہوتے ہیں جو اشاعت کے کام سے وابستہ ہوتے ہیں بس اس نکتہ کو تو صرف وہی سمجھ سکتا ہے کہ جس کا سابقہ کاتب سے پڑا ہو۔ کتابت ایک فن تھا اور اب تو حضرت کمپیوٹر کی آمد نے اس فن شریف کو ماضی کی چیز بنا دیا ہے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ آج سے چالیس (۴۰) برس قبل اس فن کے ماہرین کے ناز ونخرے شہرۂ آفاق تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابت کا فن بڑی نزاکت اور پیچیدگی کا فن تھا اُس دور میں عموماً پہلے کاغذ پر کتابت ہوتی تھی۔ اچھی سیاہی China Ink کہلاتی تھی اس کی تیاری بھی ہر کس و ناکس کی بس کی بات نہ تھی۔ گھونٹنا بھی پڑتا تھا۔ کتھائی کا بھی استعمال کیا جاتا تھا کہ کاپیاں پلیٹ جماتے وقت اُڑنے نہ پائیں۔ کتابت کرنے کے لیے ایک خاص طرزِ نشست ضروری تھی اور اسی لیے کاتب کی آنکھیں سب سے پہلے متاثر ہوتی تھیں۔ اور بہت جلد اُسے چشمہ لگانا پڑتا تھا۔ اس جان لیوا اور اعصاب شکن کام کی ان تفصیلات کو ذہن میں رکھیں اور پھر یہ واقعہ پڑھیں۔

مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی اپنے مضمون ''شہید ناز ارباب تقویٰ'' میں لکھتے ہیں:

---

[1] وہ کوہ کن کی بات۔ مولانا نور عالم خلیل امینی ص ۲۶۰

پوری کتاب کی ترتیب اور صبر آزما کتابت کے بعد جب کتابت شدہ کاپیاں مرحوم کے مخلص اور بے تکلف دوست مولانا خالد صاحب اعظمی کے کوونور پرنٹنگ پریس (دہلی) پہونچ گئی اور شائد ہفتہ عشرہ میں طباعت ہونے ہی والی تھی کہ صرف القاموس جدید کی کتابت شدہ کاپیاں چوہے درمیان سے اس طرح کتر گئے کہ جیسے خاص اس کام کے لیے پلان بنا کر آئے ہوں کیوں کہ وہیں رکھی ہوئی متعدد کتابوں کی کتابت شدہ کاپیاں بالکل محفوظ رہیں۔ مگر اس قسم کی باتوں کا مولانا کی صحت پر کیا اثر پڑسکتا تھا۔ مولانا مرحوم ساری آفت رسیدہ کاپیاں وہاں سے دیوبند لائے۔ اور اُن کے متاثرہ حصوں پر بطور پیوند دوسرا کاغذ چپاں کرنے کے بعد ان از سرِ نو کتابت مکمل کر لی[1]

اس طرح مولانا کا تصنیفی اور تالیفی عہد مختلف مراحل سے گذرتا رہا ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اِن حالات کے پیشِ نظر معاشی پریشانیاں بھی ہوسکتی تھیں۔ اور رہی ہوں گی۔ لیکن ان تلخ حالات کے باوجود مولانا کو اپنے خاندانی پس منظر سے جو وضعداری ملی تھی اُسے بھی برقرار رکھنا ضروری تھا اور آمدنی کے امکانات محدود اور خفیف وضعیف تھے۔ اس دور کے سلسلہ میں مولانا ابوالحسن کے مضمون سے ہی ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے مولانا کی شخصیت کے کچھ نقوش اُبھرتے ہیں چنانچہ دار الفکر کے بارے میں مولانا ابوالحسن تحریر کرتے ہیں۔

> "مرحوم حافظ ظہیر صاحب کے مکان کی بیٹھک جو دار الفکر کے دفتر کی حیثیت سے معروف ومتعارف تھی ہمیشہ ہی زندہ دل احبابِ بے تکلف کی آمد ورفت سے آباد رہتی ظاہری رونق اور چہل پہل کی وجہ سے تمام دیکھنے والوں کو وہاں ہمیشہ خیر وعافیت اور خوشحالی ہی نظر آتی جب کہ حقیقت حال سے ہم چند افراد ہی آگاہ تھے...... جمعہ کی شب نمازِ عشاء کے بعد اجتماعی کھانے کا پروگرام بھی نہایت دلچسپ ہوا کرتا تھا شرکاء میں قاری علاء الدین صاحب بردوئی، مولانا عبد الرؤف صاحب عالی، مفتی ہلال عثمانی کے علاوہ وقتاً فوقتاً دیگر مختلف احباب کا بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا کبھی کبھار سراپا تفریح مولوی فرزند علی صاحب

---

[1] ترجمانِ دار العلوم مولانا کیرانوی نمبر ص ۶۳

میرٹھی بھی آد ھمکتے تھے جن سے مولانا کافی مانوس تھے اور جن کے جان لیوا قسم کے فلک شگاف قہقہے ہمیشہ یاد رہیں گے وہ بھی عجب دور تھا جس کی اب صرف یاد ہی رہ گئی ہے نہ دفتر رہ گیا نہ دوست واحباب کچھ تو غفرلہ ہو گئے اور باقی جو ہیں بالکل فالودے کی شکل اختیار کر کے اوپر جانے کے لیے پر تول رہے ہیں"۔

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس ولم یسمر بمکۃ سامر[1]

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

ان سطور کی روشنی میں اس دور کا پورا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا اپنی تمام تر وضعداریوں سمیت اپنی شگفتہ پاکیزہ حیات کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اجتماعی کھانے کا پروگرام، بے تکلف احباب کی محفل اس میں ہنسی کے چھوٹتے ہوئے فوارے قہقہوں کے ابلتے ہوئے چشمے یہ سبھی شامل تھے۔ مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی بھی مولانا وحید الزماں کے بے تکلف احباب میں سے ایک تھے اور ہم جلیس و ہم نوالہ تھے اور اگر صرف چائے مراد لی جائے تو ہم پیالہ بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک بار بہت رات تک کام ہوتا رہا اچانک مولانا اٹھ گئے اور جا کر گرما گرم حلوہ کی پلیٹ لے آئے کہ ہم بہت دیر سے کام کر رہے ہیں"۔[1]

حلوہ کی ایسی گرما گرم پلیٹ کے پس منظر میں گھر والوں کی کوششیں اور معاشی مشکلات کے دور میں دیر رات تک کام کرنے والے شخص کی مشقت کے بارے میں کون سوچے گا لوگوں کو تو حلوہ کی خوشبو اٹھتی ہوئی بھاپ کی لطیف سفید لہریں اور ذائقہ یاد رہے گا۔ اس موقع پر بے اختیار ایک شعر یاد آتا ہے۔ ؎

---

[1] ترجمان دارالعلوم کیرانوی نمبر ۶۴

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
میرا مجلسی تبسم میرا ترجماں نہیں ہے

لیکن اب اسے کیا کیا جائے کہ یہی "مجلسی تبسم"، نفیس اور متمدن زندگی کا پیغامبر ہوتا ہے۔ سب کے درمیان بیٹھ کر قہقہہ بردوش رہنا، اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو روکنا، پاسِ ناموسِ عشق میں پلکوں تک آئے ہوئے اشکوں کو ضبط کرنا متوسط طبقہ کی سماجی زندگی کا بہت بڑا وصف ہے۔ مولانا نے بھی ایسی ہی زندگی گزاری۔ سخت حالات، ماحول کا جبر، کشاکش سے بھری ہوئی حیات...... ۶۳ء تک رکھ رکھاؤ، وضع داری، سفید پوشی، خاندانی پس منظر ان سب کا خیال رکھتے ہوئے وہ زندگی کے طوفانی سمندر کو اس طرح جھیلتے رہے جیسے کسی خوشنما حوض میں غسل کر رہے ہوں۔

علم سے اُن کی گہری وابستگی، عربی زبان سے ان کا والہانہ عشق اس دور میں بھی "رہین ستمہائے روزگار" رہنے کے باوجود برقرار رہا۔ یقیناً انہیں دھمکایا گیا ہوگا۔ ان سے حسد کرنے والوں نے مختلف راستے اختیار کئے ہوں گے۔

"مولانا کو دیوبند سے اکھاڑنے کی کوشش کی گئی دار الفکر میں کھڑکی کے راستے دھمکی آمیز خطوط لکھ کر ڈالے گئے"[1]

مگر نہ مولانا کے پائے ثبات میں لغزش ہوئی اور نہ ان کی استقامت میں فرق آیا۔ وہ سچے مومن کی طرح اپنے عزم وارادہ میں اٹل رہے۔

فروری ۶۳ءتک کی ان کی زندگی سمندری جہاز کے پرندے کی سی ہے کہ وہ ادھر اُدھر اڑتا پھرتا ہے اور پھر جہاز پر آخر بیٹھ جاتا ہے۔ طالب علمی کے دور سے ۶۳ءتک مولانا نے تصنیف وتالیف کو ہی اپنا وسیلۂ رزق بنایا۔ مختلف مشاغل میں ضرور مصروف رہے مگر یہ اعتبار نوعیت سب ایک ہی جیسے تھے ان کا مرکز ومحور عربی اور اسلامیات رہے وہ ہر حال میں مخالف سمت سے آتے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند

[1] وہ کوہ کن کی بات۔ سید احمد رامپوری ص ۲۶۱

میں علامہ محمد ابراہیم بلیاوی کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے مولانا کو توجہ دلائی گئی۔

دیوبند کا جو تنظیمی ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے وہ ہندوستانی یونی ورسٹیوں سے کچھ مختلف نظر نہیں آتا جیسے یونی ورسٹیوں میں جگہیں خالی ہوتی رہتی ہیں اور اُن پر Ad-hoc یا Casual تقرر کر دیئے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہی لوگ عارضی یعنی Temporary اور پھر Appointment مستقل حیثیت اختیار کر لیتے ہیں مولانا کے تقرر کے سلسلے میں مولانا خلیل امینی صاحب کا مندرجہ اقتباس بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

''پانچ سالہ طالبِ علمی میں ہمیشہ ممتاز نمبرات سے کامیاب ہوئے ادب واحترام کے سلوک کی وجہ سے اساتذہ کے نزدیک محبوب تھے فراغت کے بعد ان کی علمی وفکری سرگرمیاں اساتذہ سے مخفی نہ تھیں۔ دارالعلوم کے قیام کے زمانے میں آپ کی صلاحیتیں طلباء اور اساتذہ کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں اور دارالعلوم آپ کی آواز سے گونجنے لگا۔ ارباب حل وعقد کو شدت سے احساس ہوا کہ دارالعلوم میں عربی زبان' اور طلبا کو تہذیب وثقافت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے مولانا کیرانوی ایسے سپوت فرزند کی خدمات حاصل کرنی ضروری ہیں۔

چنانچہ اُس وقت کے ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند...... علامہ محمد ابراہیم بلیاوی کی تحریر پر تقسیم اسباق کے اجتماع میں اُس وقت کے اکابر اساتذہ نے مولانا کو یکم ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۶/ فروری ۱۹۶۳ء سے بطور اجیر استاد دارالعلوم میں تدریس کی سفارش کی تاکہ حسب ضابطہ مشاہدۂ کار کے بعد مجلسِ شوریٰ سے باقاعدہ استاد منتخب کئے جانے کی سفارش کی جاسکے۔

علامہ بلیاوی ۱۹/ شوال ۱۳۸۲ھ مطابق دس فروری ۱۹۶۳ء کو مہتم دارالعلوم کے نام اپنے ضابطہ کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

بگرامی خدمت حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! تقسیم اسباق کے اجتماع میں جس میں احقر اور جناب مہتمم صاحب اور مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب اور مولانا ظہور احمد صاحب شریک ہوئے احقر نے یہ ذکر کیا تھا کہ مجلس شوریٰ میں اس کا تذکرہ بہت دنوں سے آرہا ہے کہ عربی تحریر و تقریر سے طلبا عاجز نظر آتے ہیں۔ مصر کے بھی علماء آئے مگر اُن کے آنے سے بھی جو ذوق مطلوب تھا وہ پیدا نہیں ہوا اور جو کچھ کامیابی ہوئی وہ کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتی اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ علمائے مصر اُردو نہیں جانتے اس پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ تجویز سامنے آئی کہ مولوی وحید الزماں کیرانوی دار العلوم کے فاضل ہیں اور اُن کو اردو کی تحریر و تقریر میں اچھی مہارت ہے۔ ان کی استعداد پر نظر کرتے ہوئے مجلس کو امید ہوئی کہ اس سلسلے میں وسیع خدمت انجام دے سکیں گے نیز مختصر نصاب جو افریقی طلباء کے لیے تجویز کیا جارہا ہے اس میں سے کچھ تعلیم بھی ان کے سپرد کردی جائے۔ سب کی رائے سے یہ بات طے ہوئی کہ سر دست یکم ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۶ فروری ۱۹۶۳ء سے ایک سال کے لیے بمشاہرہ ایک سو دس روپئے بحیثیت اجیر اُن کو رکھ لیا جائے۔ ایک سال کی کارکردگی پر نظر کرنے کے بعد ملازمتِ مستقلہ کی حیثیت میں ان کے درجہ اور گریڈ کے تعین کے ساتھ مجلس شوریٰ سے تقرر کی منظوری حاصل کی جائے گی۔ حسب قاعدہ تنقید فرمادی جائے۔ احقر کی یہ رائے بھی ہے کہ افریقی طلباء کی علمی و اخلاقی نگرانی بھی مولوی صاحب موصوف کے متعلق خارج اوقات میں کردی جائے اور اس کا معاوضہ کم از کم پچاس روپیہ ماہوار ہونا چاہئے۔ اور اس معاوضہ کی ادائیگی اہل افریقہ کے ذمہ ہوگی۔

فقط والسلام

محمد ابراہیم

۱۹/۱۰/۱۳۸۲

چنانچہ ایک سال کے بعد مجلس شوریٰ منعقدہ سولہ رجب ۱۳۸۳ھ مطابق چار نومبر ۱۹۶۳ء مولانا کو ترقی کے ساتھ باقاعدہ استاد مقرر کیا گیا۔[1]

[1] وہ کوہ کن کی بات۔ نور عالم خلیل امینی ص۔ ۶۴۔ ۳۳۔ ۲۶

حضرت مولانا کی تعلیم و تدریس سے دلچسپیوں کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے۔اس سلسلے میں وہ کس طرح طلبا کا ذہنی پس منظر تیار کرتے تھے اور کس طرح اُن کے ذوق وشوق کو آگے بڑھانے کے لیے مہمیز کرتے تھے اس کا ایک ہلکا سا خاکہ حضرت مولانا محمد اسرار الحق قاسمی کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔حضرت مولانا تحریری فرماتے ہیں:

"دارالفکر تو قایم ہوگیا تھا جدید عربی زبان وادب کی تعلیم وتمرین کے لیے...... لیکن وہاں طلبہ کی اخلاقی' ذہنی اور فکری تربیت بھی کی جاتی تھی اہم علمی موضوعات پر مباحث کا سلسلہ بھی تھا' طلبا کو تعلیم کے مقاصد اور ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔اس طرح دارالفکر کا فیض یافتہ ہر طالب علم علمی اعتماد اور فکری شعور و آگہی اور ذہنی بالیدگی اور احساس ذمہ داری کا پیکر بن کر باہر آتا تھا اور یہ دراصل سب کچھ علمی فیض تھا حضرت الاستاذ کا جو اس ادارہ کے بانی اور روح رواں تھے۔انہوں نے دارالفکر کے ذریعہ مردم خیزی اور کردار سازی کی ایک مہم شروع کی تھی اور اس مہم کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں ان کی فعال' متحرک اور سیمابی شخصیت شب و روز مصروف کار رہتی تھی۔قدرت نے ان کو علم و فضل' جہد و عمل کی سرفرازیوں سے نوازا تھا" اخلاق کریمانہ تھا دل درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذہن کشادہ تھا' فکر میں بے پناہ وسعت تھی' خیالات جدت طراز لیکن شریعت پر مضبوط گرفت تھی۔طلبہ کے ساتھ باپ جیسا سلوک کرتے تھے۔[1]

حضرت مولانا کے اس تقرر سے طلباء کو ایک نئی روحانی زندگی ملی اور مولانا بھی تمام صنفوں کو سن ۶۷ تک تنہا پڑھاتے رہے۔سن ۶۸ میں مولانا کو درجہ وسطیٰ الف میں ترقی ملی۔ پھر سن ۷۶ میں درجہ علیا میں ترقی دی گئی اور سن ۷۷ میں عربی زبان وادب کے ساتھ حدیث کی دو مشہور کتابوں طحاوی شریف اور نسائی شریف کا درس بھی دیا۔

اس روداد سفر پر تبصرہ آئندہ باب میں ہوگا۔مولانا کا طرز تدریس ان کا اور طلباء کے درمیان رابطہ ان سب پر آئندہ باب میں گفتگو کی گئی ہے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کی نجی' ذاتی اور شخصی زندگی کا جو معاشی پہلو تھا جس میں مختلف نوعیتوں کے کام کرنے ہوتے تھے۔ ان سب کو سمٹ سمٹا کر ایک جہت اور ایک سمت مل گئی۔

---

[1] ہمارے شفیق استاد۔مولانا محمد اسرار الحق قاسمی مشمولہ ترجمان دارالعلوم مولانا کیرانوی نمبر ۱۱۸۔۱۱۷

مولانا نے ۱۷ برس تک پوری احساس ذمہ داری علمی وقار اور تدریس کی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ درس دیا۔ ۸۰ سے ۸۳ تک وہ جشن صد سالہ اور کیمپ کی سیاست اور دوسرے بکھیڑوں میں الجھا دیئے گئے لیکن تدریس سے ان کی وابستگی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ آخری برسوں میں سبکدوشی سے پہلے ان کا رویہ وہی رہا جو ایک باعمل اور صاحب کردار شخص کا ہونا چاہئے۔ انہوں نے اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں برتی۔ ان کا کردار ان کی قوت تھا طلباء سے ان کی وابستگی اور ان کے منفرد طرز تدریس نے انہیں پورے دارالعلوم میں ممتاز حیثیت عطا کی تھی۔

زندگی کا وہ سفر جو سن ۳۰ میں شروع ہوا اور مولانا جس ماحول میں پلے بڑھے اس کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا گیا۔ ان کی نشوونما میں اور ان کے مشاغل اور مصروفیتوں میں ہمیشہ ایک پہلو نمایاں رہا اور وہ یہ کہ زندگی کو 'یک رخا' نہیں ہونا چاہئے بلکہ شخصیت کو ہمہ جہت ہونا چاہئے وہ اپنی تمام تر گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ایک بہترین دوست اعلیٰ پایہ کے مدرس، شفیق باپ، رفیق بھائی، مثالی شوہر اور دیوبند کے دائرے سے نکل کر ملت کا درد رکھنے والے انسان تھے انہوں نے خود کو غالبؔ کے اس شعر کا مصداق بنالیا تھا کہ:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

انہیں اس کا عرفان تھا کہ قطرہ خونِ جگر سِل کو دِل بناتا ہے اور نغمہ کو سرمدیت عطا کرتا ہے۔ اب اس کی خاطر جو کچھ بھی ہو اسے تو 'انگیز' کرنا ہی پڑے گا اس قطرہ خونِ جگر کی وجہ سے انہوں نے اپنی تمناؤں اور اپنی آرزوؤں کی قتل گاہ اپنی آنکھوں سے سجتے ہوئے دیکھی لیکن وہ اس مقتل آرزو میں گئے۔ بقول حضرت مولانا سید سلمان ندویؒ :

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ اک قطرہ خوں جو رگِ گلو میں ہے

❁❁❁❁❁

بابِ سوّم

مولانا وحید الزمان بحیثیت مدرس

مولانا وحید الزماں بحیثیت مدرس

مولانا وحید الزماں کیرانوی کا دارالعلوم دیوبند کے تدریسی عملہ سے وابستہ ہونا اُن کی زندگی کا وہ اہم موڑ تھا جس نے اُن کی تصنیفی اور تالیفی جہت کو حیاتِ تازہ بخشی اور اُن کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کیا۔ تقریباً اٹھائیس برس تک وہ تدریس سے وابستہ رہے اور اُن کے اگر کچھ مخالفین تھے بھی تو انہوں نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ مولانا ایک بہترین مدرس بلکہ مثالی مدرس تھے۔

اُن کی تدریسی زندگی پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بھی تھوڑی سی گفتگو کر لی جائے کہ تدریس ہے کیا......؟ تدریس اور تعلیم میں کیا فرق ہے......؟ ہم جب انگریزی کا لفظ Education استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ کی وسعت کیا ہے......؟ کیا مغربی تصورات معلم اور مدرس کے درمیان کوئی خطِ امتیاز کھینچتے ہیں......؟

تدریس و تعلیم کا فرق:

علم کے معنی ہیں پہچاننا' یقین کرنا' جاننا' مربوط کرنا' ادراک کرنا۔ معلم وہ ہوتا ہے جو اس عمل میں طالب علم کی مدد کرتا ہے۔ علم اشیاء کا بھی ہو سکتا ہے خارج میں بھی ہو سکتا ہے یعنی کوئی فرد اشیاء کا یا کائنات کے کسی رخ کا یا کسی شعبہ کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے مشاہدہ اور تجربہ دونوں سے کام لیا جا سکتا ہے یہ دونوں مل کے مطالعہ کی منزل تک لے آتے ہیں۔ علم اور آگہی میں فرق ہے۔ علم میں ضبط و نظم ناگزیر ہے۔ علم منتشر نہیں ہو سکتا بلکہ مختلف بے

ترتیب اجزاء کو مرتب کر کے ایک واضح شکل وصورت دیتا ہے۔ آگہی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔کسی شئے سے باخبر ہونا' آگاہ ہونا یا واقف ہونا صرف جاننا ہے۔ایک شخص ہوائی جہاز کی پرواز کے اوقات جان سکتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص آگہی رکھتا ہے لیکن یہ آگہی صرف پرواز تک محدود رہے گی یہی چیز اس کے علم کا حصہ اس وقت بن جائے گا جب ہوائی جہاز کے نظامِ پرواز کو مربوط ومرتب کرے گا۔

علم اپنی ذات اور اپنی شخصیت کا بھی ہو سکتا ہے علم کے لیے ''معلوم'' کا وجود لازمی ہے۔لیکن اپنی ذات کا علم حاصل کرنے کے لیے معلوم کی تلاش ضروری نہیں ہے اکثر منطقی الجھاوے سلجھانے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ''خدا عالم ہے''۔پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر وہ عالم ہے تو وہ کون سا معلوم ہے جو اس سے پہلے سے وجود رکھتا ہے تو یہی سمجھایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کا عالم ہے چوں کہ انسان کو خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر فائز کیا گیا ہے اس لیے ایسی بلند ومرتبہ شخصیتیں بھی ہیں جو اپنی ذات کا کس حد تک علم رکھتی ہیں ۔ یہ علم مراقبہ،مکاشفہ اور استغراق سے حاصل ہوتا ہے۔اس کے لیے کسی معلول کی ضرورت ہو بھی سکتی ہے،نہیں بھی ہو سکتی ہے۔

اس طرح چاہے اپنی ذات کا علم ہو یا اشیاء کا علم ہو یا طبیعات یا حیاتیات'سماجیات' ریاضیات یا مجالیات وجدیات کا علم ہو۔طالب علم کے لیے معلم کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

مگر تدریس تعلیم سے الگ ہے یہ درس سے بنا ہے درس کے معنی ہے سبق' اور راستہ' کتاب کو یاد کرنے کی طرف متوجہ ہونا۔مدرس کے لیے کچھ چیزیں لازمی ہیں۔مثلاً مدرسہ۔درس حاصل کرنے والا'درس حاصل کرنے والے کے لیے مدرس اور طریقۂ تدریس سے باخبر ہونا ضروری ہے۔

عربی مدرس کی خصوصیات:

مدرس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ درس حاصل کرنے والوں کو خطاب کرے اور

اس اعتبار سے مدرس میں قوتِ اظہار ضروری ہے۔ جسے تقریر و تحریر دونوں صورتوں میں ظاہر ہونا چاہئے۔

اظہار کے لیے ترسیل ناگزیر ہوتی ہے مثلاً کوئی بہت اچھا مقرر ہے اور زبردست قوتِ اظہار رکھتا ہے لیکن جس زبان میں وہ تقریر کر رہا ہے وہ زبان سنسکرت ہے اور سننے والے مجمع میں کوئی بھی سنسکرت نہیں جانتا تو یہ قوتِ اظہار ترسیل و ابلاغ سے عاری ہے۔ ترسیل و ابلاغ کے بغیر کسی کی قوتِ اظہار بہت اعلیٰ سہی لیکن وہ بیکار محض ہے۔

مدرس میں قوتِ اظہار اس نہج سے ہو کہ اس میں ترسیل و ابلاغ بھی ہو۔ کہا گیا کہ:

تكلم الناس على اقدار عقولهم

اب اگر مدرس ابتدائی عربی جاننے والے کو طرفہ متنبی اور ابونواس کے اشعار سمجھانا شروع کر دے گا تو نتیجہ معلوم......!

اسلیے یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب علم و فضل ہونا اور بات ہے اور اچھا مدرس ہونا اور بات ہے۔ اچھا مدرس وہی ہے جو اپنے علم و فضل کو اپنے طالب علموں تک منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لیے اُسے اپنے طالب علموں کی ذہنی سطح تک آنا پڑتا ہے پھر دھیرے دھیرے طالب علموں کی سطح کی ناہمواری کو ہموار بناتے ہوئے اسے ترفع عطا کرنا ہوتا ہے۔

مدرس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انگریزی کا لفظ Ethas کا مصداق ہو یعنی جس بات کا درس دے رہا ہو اس کی شخصیت سے اس کی تصدیق و توثیق ہوتی ہو اس لیے اُسے اپنے طالب علموں کے سامنے اعلیٰ ترین اخلاق کا نمونہ بن کر آنا پڑتا ہے۔ ان خوبیوں کا عربی زبان کے مدرس کے لیے ہونا ضروری ہے حالانکہ دوسرے علوم و فنون کے لیے بھلا کسی بھی زبان کی تدریس کے لیے یہ صفات ناگزیر حیثیت رکھتی ہیں لیکن خصوصاً عربی زبان کے لیے کچھ باتیں خاص طور سے بہت اہم ہیں۔

عربی زبان مذہبی تو نہیں ہے اس لیے کہ زبان کبھی مذہبی نہیں ہوتی مگر ایک مذہب کی مقدس ترین کتاب اسی زبان میں نازل ہوئی ہے یہ ضرور ہے کہ عربی جاننے والے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ لیکن دوسرے مذاہب کے لوگ بھی عربی کے جاننے والے ہیں مثال کے لیے ایک ہی نام کافی ہے اور وہ ہے معلوف مسیحی کا۔ جس نے عربی کی زبردست لغت المنجد ترتیب دی ہے۔ اس طرح یہ تو نہیں ہے کہ عربی کسی خاص مسلک یا مذہب کی زبان ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عربی بولنے والے اور پڑھنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے اور اسی وجہ سے عربی جاننے والوں کے لیے شخصیت کے گرد مذہبی تقدس کا ایک ہالہ بنا رہتا ہے اسکی روشنی میں اس کے لباس، طور وطریقہ آدابِ نشست و برخاست، اندازِ گفتگو سب پر ہی نظر پڑتی ہے۔ اردو عربی کا درس دینے والا اپنے تقدس کی وجہ سے سماج سے ذرا الگ تھلگ سا ہو جاتا ہے۔

دوسرے ممالک کے لیے نہیں کہا جا سکتا ہے مگر ہندوستان میں دورِ حاضر کے حالات کے تحت یہ ضروری ہے کہ عربی کا مدرس اپنے کام سے الگ تھلگ نہ ہو جڑا ہوا رہے۔ اس کی شہرت عام میں نہ صرف یہ کہ منفی پہلو نہ ہوں بلکہ وہ ایک باضابطہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہو اور طالب علم اُسے دیکھ کر فخر محسوس کریں۔

لباس وضع قطع خورونوش کے ساتھ اس کے مشاغل بھی صرف قالو قولو تک محدود نہ ہوں اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مغربیت کو اپنا لے...... لیکن عربی کے مدرس کو معلومات عامہ بھی ہونی چاہئے اُسے دوسری زبانوں خصوصاً فارسی، اردو، ہندی کی شائستہ اور ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرنی چاہئے سیاسی حالات سے بھی باخبر ہونا چاہئے۔ انٹرنیٹ کیا ہے سائبر کیفے کیا ہوتا ہے ای میل کسے کہتے ہیں۔ انڈونیشیا کے منصب صدارت پر کون فائز ہے بوسنیا میں کیا ہوا تھا......؟ کیرالہ کی ملیالی پر عربی کا کتنا اثر ہے......؟ وغیرہ۔

اس طرح عربی کا مدرس ایسا ہونا چاہئے جو اپنے طالب علم کو اپنی ذات اور شخصیت سے

عربی کی طرف متوجہ کر سکے۔

ہر مدرس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے موضوع کے سلسلہ میں ترغیب وتشویق پیدا کر سکے صرف اسباق بتا دینا مقاماتِ حریری کے کچھ مشکل مرحلوں کی تشریح کر دینا' اصول وفقہ یا کلام کے سلسلے میں بتا دینا یا لبید وعنترہ کے اشعار کی عارفانہ توجیہ کرنا یا احادیث کے اتسناد کے لیے جرح وتعدیل سے کام لینا...... بیشک یہ سب ضروری ہے مگر مدرس اور کامیاب مدرس کا کام یہیں پر ختم نہیں ہوتا اس کا فرضِ منصبی ہے کہ اپنے طالب علم کے اندر وہ تڑپ' وہ لگن' وہ خلوص' وہ ذوق وشوق اور عربی زبان کو اپنانے کی وہ تمنا وآرزو اور زبان کے سلسلے کی تمام نزاکتوں اور نفاستوں کی وہ شمع روشن کر دے جو طالب علم کے دل ودماغ کو ہر وقت منور بھی رکھے اور وہ ھل من مزید کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھتا رہے۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ دستارِ فضیلت جب سرِ اقدس تک پہونچتی ہے اور کلاہِ علم میں سند کا طُرّہ لگ جاتا ہے تو عربی کا مدرس اپنے کو اس دنیا کی مخلوق سمجھنے کے بجائے چرخ چہارم سے اترا ہوا مرغِ زریں سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح کا مزاج تکبر تجریا جسے انگریزی میں Academic snobory کہا گیا ہے زبان وادب کے مدرس کے لیے سخت مضر ہے۔

مغرب کا مزاج تدریس کے لیے سخت ناساز گار رہا۔ مغرب تدریس نہیں جانتا صرف تجربہ گاہ میں آلاتِ ومشینوں سے کام لینا جانتا ہے اگر غور کیا جائے تو دانشوری کی تمام تر روایات کے باوجود مغرب نے دنیائے انسانیت کو اپنے مشاہدے سے باخبر کیا۔ تجربہ گاہیں دی۔ ہمارے یہاں جو کام بچے کرتے تھے اور جو کھیل کود اور تفریح کی شکل تھی یا کنکوے اور پتنگے انہوں نے اسی کو آسمان میں آہن وفولاد کی ایک باضابطہ شکل دے کر انسانیت کی تخریب کا ایک ذریعہ بنا دیا...... مغرب کا طرز تدریس کتاب سازی پر زور دیتا ہے کردار سازی پر نہیں لیکن مشرق میں ہمارے مدرسے ہماری پاٹھ شالائیں کردار سازی پر زور دیتی تھیں۔

عربی میں تدریس کے اصول وہ تو ہوں گے ہی جو کہ دوسری زبانوں اور ادبیات کے

تدریس کے اصول ہیں۔ اس سلسلہ میں اہم مفکرین نے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے جو کچھ ہے وہ متن ہے متن سے باہر نہ کوئی دنیا ہے نہ کوئی معنی کا میدان ہے۔ صداقتوں کا سلسلہ صرف متن ہے۔ معنی مستقل نہیں ہوتے بلکہ دنیائے معنی لسانی رشتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ تدریس میں یہ ضروری ہے کہ پروفیسر دریدہ کے ان افکار و خیالات سے باخبر ہونا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ متن ایک رہ گزر ہے جہاں سے معنی کے قافلہ گزرتے رہتے ہیں۔ جو کچھ ہے وہ متن ہے۔ متن سے باہر کوئی دنیا نہیں ہے اور اس لیے ادبیات کے مدرس کا پہلا فریضہ ہے کہ وہ متن سے واقف ہو متن کے تشکیلی نظام سے باخبر ہو اور یہ جانتا ہو کہ متن کے معنی و تفہیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ متن کی تدریس دو طرح سے ہو۔ نمبر ایک متن کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو تحریری ہوتی ہے یعنی یہ متن صرف لکھا جا سکتا ہے۔ متن کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو صرف تقریری ہے ان دونوں کے درمیان بڑا نازک اور لطیف فرق ہے مدرس کو اس سے باخبر ہونا چاہئے۔ اسی کے ساتھ تدریس میں یہ بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان متن کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے کے لیے شاعرانہ لب و لہجہ سے اجتناب کیا جائے لیکن اندازِ بیان خشک نہ ہو۔ اس لیے کہ پہلی صورت میں متن کا روح القدس حجاباتِ تشبیہ و استعارہ میں گم ہو جائے گا اور دوسری صورت میں وہ اتنا بے کیف و بے جان ہو جائے گا کہ طالب علم بے کیفی اور اکتاہٹ محسوس کرے گا اچھا مدرس ہمیشہ اپنے بیان کو اظہار معلومات کے ذریعہ دلچسپ اور پُرکشش بناتا ہے۔ اگر متن کی تشریح میں دوسرے موضوعات یا بین کلیاتی موضوعات Interdisciplinary (Interaction) سے مربوط کرکے ان میں باہمی تفاعل پیدا کرنا چاہئے۔ حضرت مولانا نے تدریس کے سلسلہ میں عملی طور پر اچھوتا طریقہ اختیار کیا تھا وہ اس بنیادی نکتہ سے باخبر تھے کہ کسی بھی زبان کی ادبیات کے تفہیم کے لیے اسی زبان کا وسیلہ اظہار ہونا چاہئے چنانچہ عربی زبان و ادبیات ہوں مقاماتِ حریری ہو یا پھر دورۃ حدیث شریف بھی۔ مولانا عربی کو ہی وسیلۂ اظہار بناتے تھے۔ اس سلسلہ میں محترم نور عالم خلیل امینی نے اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''عربی زبان کی تدریس کا جو سلیقہ اور طریقہ خزانہ قدرت سے اُن کو ودیعت ہوا تھا۔ برصغیر بلکہ بیرون ملک میں بھی عربی زبان کے بہت کم تدریس کے حصے میں آیا ہوگا''۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ مولانا علم وفضل میں یا ادب وزبان کے گہرے مطالعہ میں سبھوں سے بڑھ کر تھے' کیوں کہ خود اندرونِ ملک بہت سے فاضل گرامی' وسعت مطالعہ اور ذوقِ زبان وادب میں اُن سے بہ درجہا فائق ہیں لیکن جو چیز مولانا کو دوسروں سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے وہ ان کا پیارا' خوب صورت' آسان ترین اور مفید ترین طریقۂ درس تھا[1]

النادی الادبی کا قیام:

مولانا نے تدریس میں اس کا بھی لحاظ رکھا کہ تدریس اور درس کا سلسلہ منظم طریقہ سے ہو اور اس کی اجتماعیت برقرار رہے مولانا نے النادی الادبی کی تشکیل اسی لیے کی تھی مولانا ندیم الواجدی لکھتے ہیں:

''ان دنوں دارالعلوم میں عربی زبان سیکھنے کا شوق کافی بڑھا ہوا تھا' بے شمار طلباء القراۃ الواضحہ کے اجزاء سبقاً سبقاً پڑھنے میں مصروف تھے۔ استاد محترم نے عربی زبان کی ترویج واشاعت کے مقصد سے طلباء کو مشق وتمرین کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے'' النادی الادبی'' کے نام سے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی''۔[2]

''النادی الادبی'' کے مختلف شعبے تھے ایک شعبہ امداد باہمی کا تھا جس کے ذریعہ نادار طلباء کی مدد کی جاتی تھی۔ ایسی تحریک تھی جو کردار سازی پر زور دیتی تھی۔ یہاں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ٹکسلا اور نالندہ ہو یا کوفہ' بغداد' بخارا اور سات سو پچاس عیسوی تک مدینہ منورہ میں ایک ایک عالم کے درس گاہ میں طلباء کی کثیر تعداد ہوتی تھی اور وہ درسگاہ سے نکل کر انسانی شخصیت کو سنوارنے کے لیے نکلتے تھے یہی وہ کردار سازی تھی جس نے یوروپ کی نشاۃ الثانیہ میں ابن رشد جیسے فلسفی کے ذریعہ تعاقل پسندی کی روح دوڑا دی تھی۔ اس تناظر

---

[1] وہ کوہ کن کی بات' ص: ۷۱-۷۲' ادارہ علم وادب دیوبند

[2] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۱۳۵

میں عربی زبان کی تدریس کے سلسلہ میں ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو صورتِ حال بہت ہی خوش گوار نہ تھی گذشتہ دو سو برس میں عربی زبان کی تدریس اُس کے فروغ پورے ہندوستان میں اُس کی وسعت پر اچھا اثر نہیں پڑا۔ میکالے کے طرزِ تدریس کی وجہ سے مقامی زبانیں بالخصوص ہماری کلاسیکی روایات کی امین زبانیں سمٹی و سکڑتی گئی۔ لوگوں میں ایک دہشت پھیلادی گئی اور وہ لوگ جو فتویٰ دیا کرتے تھے اُن کے خلاف سرکاری فتویٰ چلنے لگے ان کی سرگرمیوں پہ پہرے بٹھادیئے گئے یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں شکست خوردہ ہندوستانی' زخمی و مجروح ناتواں ہندوستان عربی سے جب دور ہو رہا تھا تو اس خاک سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شکل میں ایک بدر جلیل نے اپنے عمل سے ایسا صور پھونکا جس سے نہ صرف خاکِ دیوبند کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھا بلکہ پورے ہندوستان میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ تصورات بھی بدلے وہ پھوس کے صاحبان والے مدرسے' وہ ٹاٹ اور چٹائیاں بھی بدلی اور عربی کی تدریس کے لیے کئی دارالعلوم (یونی ورسٹیاں) وجود میں آ گئیں۔ ہمارے حیدرآباد میں بھی اور ندوی پھلواری شریف' دیوبند جیسے مراکز پر عربی زبان علم وادب کے ذریعہ بہت سارے علوم کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوا کچھ دیواریں گری کچھ دریچے کھلے۔ روایتی درس گاہوں میں جہاں مغربی طرزِ تدریس رائج ہے وہاں بیشک اہل علم و فضل آئے انہوں نے لوگوں کو عربی کا درس حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا لیکن یہ معاشرہ کی بد نصیبی تھی کہ ہر سطح پر عربی کی مدد سے بہتر ڈویژن بنانے کے باوجود طلبہ وطالبات میں عربی کے لیے تشویق نہ پیدا ہوئی۔ ادھر کچھ برسوں سے زبان سیکھنے کی طرف لوگ متوجہ ہو رہے ہیں اس میں مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ہیں یہیں زیادہ تر لوگوں کا مقصود منشا عربی کی معرفت اور زبان کی تحصیل نہیں ہے وہ صرف اس لیے عربی سیکھنا چاہتے ہیں کہ خلیجی ممالک میں ''ویزا'' ملنے کے بعد جب ملازمتوں کے درخت سے ٹناٹن ریال گریں گے تو انہیں سمیٹنے کے لیے بھی عربی کی ضرورت آئے گی اور ''ہاتف'' سے یہ خبر بھیجنا پڑے گا کہ فلاں تاریخ کو آ رہے ہیں۔

لیکن ان صبر آزما حالات اور حوصلہ شکن ماحول میں بھی وہ چراغ روشن ہے جن سے ہوائیں بچ کر چلتی ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو عربی زبان کے ایسے بے مثال مدرس ثابت ہوئے کہ آج بھی اُن کے کارنامے مشعل راہ ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں مولانا وحید الزماں کیرانوی تھے۔

راقمۃ الحروف نے حضرت مولانا کو نہیں دیکھا نہ اُن سے درس لیا کسی مدرس کے بارے میں کچھ لکھنے کا حق اسی کو ہے جس نے درس لیا ہو۔ لیکن اُن کے بارے میں اتنا پڑھا کہ اُن کی شخصیت میں ایک مثالی مدرس کے اوصاف نظر آئے۔ اور چونکہ خود بھی تدریس سے وابستہ ہوں اس لیے بہت سارے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور مسائل کو سلجھانا پڑتا ہے۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد درسگاہوں اور جامعات میں طالبِ علموں نے بھی ہر طرح کی آزادی حاصل کرلی۔ بسا اوقات تو ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں وہ ''سِلیِٔ استاد'' جس کا غالبؔ نے ذکر کیا ہے وہ اُستاد کے بجائے شاگرد کے ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ وہ اُستاد جس کے لیے ہمارے ہندوستان میں یہ ''پرمپرا'' (روایت) تھی کہ گرو سے گووند کا سُراغ ملتا تھا اور گرو دکشنا کے لیے اکلو جیسے شاگرد اپنا انگوٹھا کٹوا دیتے تھے اسی مہان بھارت میں اب اخبارات کی سرخیاں اکثر یہ بتاتی ہیں کہ استاد کی بے حرمتی بطور فیشن اختیار کی گئی۔ مگر استاد کی شبیہ اگر واقعی مدرس کی ہے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ طالب علم ہو یا بڑے سے بڑا سیاست داں ہو یا اپنے وقت کا مانا ہوا دبنگ و جابر شخص ہو علم کے سامنے سب کے سر جھک جاتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی اس سلسلہ میں ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں:

''مولانا مرحوم نے دارالعلوم کے ایک پُرجوش نوجوان اور باڈی بلڈر قسم کے لیڈر کی احاطہ مولسری ہی میں سب کے سامنے پٹائی کردی تھی اور وہ کسی سے نہ دبنے والا نوجوان مولانا کے سامنے اس طرح سر جھکائے مار کھا رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ کسی شرارت پر اپنے والدین سے پٹتا ہے''۔ [1]

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۶۶

اور یہ رعب و دبدبہ جسم کا رہین منت نہیں ہوتا بلکہ اس پس منظر میں علم کی جلالت و دیانت اور خود استاد کے کردار کی راستواری اور شائستگی کو دخل ہوتا ہے۔

اسلامیانِ ہند کی نہایت ہی ممتاز و معروف شخصیت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے طلبہ کی رہنمائی اور ان کی تربیت میں نہ صرف بے مثال کردار ادا کیا بلکہ تعلیم و تربیت کی ایک نئی طرح ڈالی ان کے ہزاروں شاگرد شائستگی اور سلیقہ مندی کا نمونہ بن کر ہماری امت کے نونہالوں کو بنانے سنوارنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں''۔ [1]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مولانا وحید الزماں کیرانویؒ حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی صاحب کے بعد دارالعلوم کی تاریخ میں شاید پہلی شخصیت تھی جس نے ''رجال سازی'' اور ''فرد سازی'' کا ایسا کارنامہ انجام دیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا''۔ [2]

یہ اُن حضرات کا تبصرہ تھا جنہوں نے مولانا کے معاصرین کے حیثیت سے اُن کے شاگردوں کے زبانی اُن کے بارے میں سنا اور ایک تاثر قائم کیا اور پھر لکھا انہی کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالوحید حیدرآبادی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس سے مولانا کے طرزِ تدریس پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعض وہ بے حد اہم گوشوں پر توجہ دیتے تھے جسے اکثر اساتذہ نظر انداز کر دیتے ہیں یہ اہم گوشہ درست مخرج کے ساتھ الفاظ کی ادائیگی تھی مولانا عبدالوحید لکھتے ہیں:

ادب کے علاوہ دیگر علوم و فنون پر ان کی اچھی نظر تھی۔ جس فن کی کتاب پڑھانے کو دی گئی اس کا حق ادا کر دیا کبھی کسی طالب علم کو تشنگی کا احساس نہ ہوتا تھا مگر جب ''حماسہ'' اور ''متنبی''

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۶۶

[2] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۵۳

جیسی ادبی کتابیں پڑھایا کرتے تھے تو سماں باندھ دیا کرتے تھے اردو میں سمجھاتے سمجھاتے کبھی کبھی اشعار کی شرح عربی میں کرنے لگتے۔ میں نے عربی کے مشہور ادیبوں اور عالموں کو عربی میں خطبات دیتے' تقریریں کرتے اور گفتگو کرتے سنا مگر جو روانی شگفتگی اور الفاظ کی صحت کے ساتھ ادائیگی کا انداز مولانا کو نصیب ہوا تھا وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہوگا۔ مولانا کی زبان سے بکھرتے موتیوں کی کھنکھناہٹ عربی زبان کے آمرانہ لہجہ اور طنطنہ کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتی تھی۔ ایک دن ہم سب ساتھی حماسہ کے درس میں بیٹھے ہوئے تھے مولانا سے کسی غیر درسی موضوع پر بات چیت چل رہی تھی اچانک مولانا نے پہلو بدلا اور کتاب کا ورق الٹتے ہوئے عربی میں بولنا شروع کر دیا اور ایک ایسے موضوع پر بولنے لگے جس کا درس سے کوئی تعلق نہ تھا وہ اخبارات اور رسالوں میں جو غیر اخلاقی مضامین شائع ہو رہے ہیں اُس سے قوم کے افراد اور معاشرہ پر مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں''۔ یہ موضوع تھا اور وہ اپنی گرج دار بلند آواز میں رواں ہو گئے۔ یہ سماں دیکھ کر طلبہ بھی پہلو سنبھال کر بیٹھ گئے چند لمحات کے بعد ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے عرب مہمان درس گاہ کے سامنے دروازے کے پاس مبہوتی کے عالم میں کھڑے مولانا کو تک رہے ہیں گویا انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس روانی کے ساتھ بھی کوئی ہندی عالم عربی زبان میں کسی موضوع پر بول سکتا ہے مولانا تلفظ اور لفظوں کی صحیح ادائیگی کا بہت خیال رکھتے تھے چنانچہ اُن کی ذہنی نظر سے باریک سے باریک پہلو بھی نہیں چھوٹتا تھا خاص طور سے وہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ زبان میں تلفظ اور لفظ کی صحیح مخرج کے ساتھ ادائیگی بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ طلباء عربی بولنے میں اس طرح کی غلطی نہ کریں کہ جلیل ذلیل ہو جائے۔

مولانا عبدالوحید حیدرآبادی لکھتے ہیں:

''اُن کے شاگردوں میں شاید ہی بنگالی' بہاری' بھوجپوری شاگرد ایسا بچ نکلا ہو جس کی روز ''ش'' درست نہ ہوئی ہو۔ حیدرآبادیوں کے خالوسب قالو میں بدل گئے تھے''۔ [1]

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ۴ ، ۱۱۲'۱۱۳

دوسروں میں صلاحیت منتقل کرنا، قوتِ عمل کو بیدار کرنا مختلف علوم وفنون پر عربی میں اظہار خیال کرنا۔ اس سلسلہ میں ندیم الواجدی لکھتے ہیں:

''اگر کوئی طالب علم غلطی کرتا تو دوسرے طالب علم سے سوال کرتے کہ اس نے کیا غلطی کی ہے؟ اگر وہ بتلا دیتا تو اس سے عبارت کی تصحیح کراتے' تلفظ کی درستگی اور لہجے کی اصلاح پر خاص توجہ ہوتی' ایک ایک جملہ کئی کئی بار پڑھواتے' دائیں بائیں آگے اور پیچھے بیٹھے ہوئے کسی بھی طالب علم سے عبارت پڑھوائی جا سکتی تھی' اور کسی سے کچھ بھی پوچھا جا سکتا تھا اس لیے درس گاہ میں ہر شخص حاضر دماغی کے ساتھ بیٹھتا جہاں ذرا ذہن بھٹکا چہرے کے تاثر یا آنکھوں کی گردش سے استاد محترم نے انداز لگا لیا اسی وقت گرفت ہو گئی' عبارت کی قرأت' تصحیح و اصلاح اور لہجے کی درستگی کے بعد معانی کا نمبر آتا پہلے ان الفاظ کے معانی بیان کرتے جو گذشتہ اسباق میں گذر چکے ہیں پھر نئے الفاظ کے معانی بتلاتے اس کے بعد ترجمہ شروع ہوتا' مختلف طلباء بار بار ایک ہی عبارت پڑھتے اور اس کا ترجمہ کرتے باقی طلباء سماعت کرتے' دو روز کے بعد مشق و تمرین کا سلسلہ شروع ہوتا' ایک ایک سبق کی تمرین میں کئی کئی دن لگتے کبھی اردو جملوں کی عربی بنوائی جاتی کبھی عربی جملوں کا اردو میں ترجمہ' کبھی سوال و جواب ہوتے' کبھی طلباء کا محادثہ کرایا جاتا' غرضیکہ مشق میں اس قدر تنوع تھا کہ ایک دن کا سبق ہفتوں کا سبق بن جاتا''[1]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا کے طرزِ تدریس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ طلاب میں تحریص اور ترغیب پیدا کی جائے جو کام اساتذہ تقریر سے لیتے ہیں اور کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ تقریر طالب علموں کے سروں سے گذر جاتی ہے حضرت مولانا نے تقریر کے ساتھ ساتھ بالکل ہی نیا اور دلچسپ انداز اختیار کیا تھا اس وقت اعلیٰ تعلیم کے لیے مغرب نے ایک لفظ ایجاد کیا ہے Group Discussion لیکن عربی کا ایک مدرس اس کا برمحل مناسب اور عملی طریقہ کس طرح نمونہ بنا کر پیش کر رہا تھا کہ اس کے طالب علم بھی اس سے متاثر تھے اور موضوع ہفتوں تک زندہ رہتا تھا۔

---

[1] ترجمہ دارالعلوم...... مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۱۳۰

مزید وضاحت کرتے ہوئے جناب ندیم الواجدی لکھتے ہیں:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری القراۃ الواضحہ کا پہلا جزو آخر سال تک چلتا رہا۔ پھر کتابی تعلیم پر ہی قناعت نہیں تھی، ہم اس سبق کے دوران اٹھنے، بیٹھنے، گفتگو کرنے، چلنے پھرنے اور ہنسنے تک کے آداب سیکھتے تھے۔ درس گاہ میں کیسا لباس پہن کر آئیں، کس طرح سلام کریں، اگر درسگاہ میں تاخیر سے آئے ہیں تو باہر کھڑے ہو کر کس طرح اجازت لیں، کس طرح بیٹھیں، سبق کے دوران استاد کو کس طرح مخاطب کریں، حد یہ ہے کہ کمرے میں کس طرح رہیں، بازاروں میں کس طرح جائیں، دوکانوں سے کس طرح خریداری کریں، مطبخ سے کھانا کس طرح لائیں یہ اور اس جیسی تمام باتیں ہماری تعلیم کا حصہ بن گئی تھیں اور یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جو ہم سب کے لیے نامانوس تھا، لیکن یہ باتیں ایسی تھیں کہ طبیعت خود بخود ان کی طرف مائل ہوتی تھی۔ پھر استاد محترم کے کے بولنے کا طریقہ ان کی گفتگو کا انداز ان کے سمجھانے کا اسلوب دل میں اتر جانے والے الفاظ کبھی ایسا لگتا جیسے سارے بدن میں نیزے اتر گئے ہوں اور کبھی دل کو برف کی سی ٹھنڈک اور پھولوں کی سی خوشبو ملتی، کبھی ایسی حرارت نصیب ہوتی جیسے شعلے بھڑک اٹھے ہوں۔ وہ جادوگر تھے الفاظ سے ایسا سحر کرتے کہ سننے والا اپنے دل و دماغ پر سے قابو کھو دیتا۔ وہ ایک سحر طراز شخصیت کے مالک تھے ان کے ایک گھنٹے کے سبق نے ہماری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ ہم اپنے اردگرد کے ماحول میں امتیاز پاتے جا رہے تھے یہ تھا استاد محترم کی شاگردی کا پہلا سال۔ اور ان کی ساحری کے زیر اثر آنے کی ابتدا''۔ [1]

یہ ایک شاگرد کا تاثر ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف اپنے استاد سے بہت زیادہ متاثر تھے اور تاثر کی ادائیگی میں جذباتی ہو گئے ہیں اگر اسے جذباتیت تسلیم بھی کر لیا جائے تو جو طرزِ تدریس ہے اس کے کئی نکات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً حضرت مولانا اپنے طالب علموں کو صرف ''کرمِ کتابی'' بنانا نہیں چاہتے تھے اور طلباء کی پوری شخصیت کو سنوارنا چاہتے تھے شخصیت کے ان اجزاء میں رفتار و گفتار مطبخ سے کھانا لانا وغیرہ سبھی شامل تھے۔

اسی طرح کے خیالات کا اظہار حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے سبھی شاگردوں

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۱۳۰۔۱۳۱

نے کیا ہے۔اُن کی ساحری کے زیر اثر آنے کی ابتداء کے بعد اس سلسلہ میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ مولینا کی کتاب "القراۃ الواضحہ" کے تینوں اجزاء ان کے ماہر تعلیم ہونے کا بین ثبوت ہیں۔اسے مولینا کے طویل تجربہ کا حاصل کہا جا سکتا ہے اس میں اسباق کی تیاری میں انہوں نے تعلیم کی عصری منہج کی رعایت ملحوظ رکھی ہے مسلمان طلبہ کی نفسیات اور ان کے مخصوص ماحول کو بھی ذہن میں رکھا ہے۔تعلیم کے دشوار اور اکتا دینے والے طریقوں سے اجتناب کیا ہے،سہل سے دشوار کی طرف نہایت منطقی انداز میں پیش رفت کی ہے،اسباق کی بنیاد ضروری نحوی قواعد پر رکھی ہے اور ان کی ترتیب میں عملی ضرورت کو اساس بنایا گیا ہے۔ہر سبق کے بعد مفید مشقیں دی گئی ہیں۔اور مثالوں کے ذریعہ طالب علم کے لیے آسانی پیدا کی گئی ہے کہ وہ اس طرح کے جملے اپنی طرف سے بنائے۔ایک سبق میں صرف ایک ہی قاعدہ پر اکتفا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کسی اور قاعدے کو خلط ملط کرنے سے گریز کیا گیا ہے مثلاً اگر کوئی سبق ترکیب اضافی کے قاعدے پر مبنی ہے اور اس سے قبل ترکیب توصیفی پر مبنی کوئی سبق نہیں گزرا ہے تو اس سبق میں کوئی ایسا جملہ نہیں دیا گیا ہے جو صفت و موصوف کے قاعدے پر مبنی ہو۔اس طرح طالب علم کا ذہن ایک سبق میں صرف ایک ہی قاعدے پر مرکوز رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کی تیاری کے پیچھے جو ذہن ہے وہ ایک تجربہ کار ماہر تعلیم کا ہے جس کی گرفت تعلیم کے میدان میں زمانہ کی نبض پر بہت مضبوط ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب سالہا سال سے نہ صرف مدارس بلکہ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے اور آج تک کوئی دوسری کتاب اس کی جگہ نہیں لے سکی ہے۔

ان کے نامور شاگرد اور دورِ حاضر میں خود اپنی جگہ پر استاد کا مرتبہ رکھنے والے "حضرت مولانا اسرار الحق قاسمی کے قول کے مطابق ایک عام رائے حضرت مولانا کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اپنے علمی اور عملی کارناموں کی وجہ سے مسلمان ان میں مستقبل کا مولانا علی میاں" کی جلوہ گری دیکھ رہے ہیں" وہ گفتار و کردار دونوں کے غازی ہیں اور ان کی جرأت مندانہ تحریریں بہت بڑا

سرمایہ ہیں۔حضرت مولانا نے بہت تفصیل کے ساتھ مولانا وحید الزماں کیرانوی ؒ پر ’ہمارے شفیق استاذ‘ کے عنوان سے اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں ان کے مضمون سے جستہ جستہ اقتباسات اس لیے پیش کئے جارہے ہیں کہ اس سے دو تصویریں بنتی ہیں پہلی تصویر اس شفیق استاد کی بنتی ہے جس کی فیضانِ نظر نے مکتب کی کرامتوں کے ساتھ لائق شاگرد کو آداب شاگردی سکھائے اور اس تصویر میں اگر ایک رخ استاد کی علمی وقار،جلالت،شفقت اور دیگر صفات کا ہے تو اس میں دوسرا رنگ شاگرد کی سعادت مندی،بلند کرداری اور احسان شناسی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

’’مولانا وحید الزماں کیرانوی کی آمد سے وہ نیا انقلاب برپا ہوگیا۔عربی زبان وادب کی نئی بہار آگئی۔نئی نصابی کتابیں،نیا طریقہ تعلیم،نیا اسلوب بیان،تدریس وتدریب کا نیا طرز، آلاتِ درس کا استعمال،اوقات کی تجدید وتقسیم اور مناسب ومفید استعمال سے ایک نیا ماحول پیدا ہوا جس میں ذوقِ مطالعہ کو فروغ ملنے لگا۔عربی زبان میں قلمی جرائد کا سلسلہ شروع ہوا،عربی خطابت وصحافت کے میدانوں میں طلبہ کی فطری صلاحیتیں پروان چڑھنے لگیں۔عربی خطاطی کے فن کو عروج بخشا گیا۔عربی مجلہ ’’دعوۃ الحق‘‘ کا اجراء عمل میں آیا جس کے ذریعہ عربی زبان میں طلبہ کی علمی،ادبی،فکری اور صحافتی صلاحیتوں کا عوامی مظاہرہ شروع ہوا۔دنیائے لغت میں تہلکہ مچادینے والا ’’اردو عربی‘‘ اور ’’عربی اردو‘‘ لغت حضرت الاستاذ ؒ کا علمی شاہکار بن کر سامنے آیا جس سے استفادہ کرنے کے بعد طالبانِ علوم میں نیا ولولہ اور نیا جوش پیدا ہوا۔نظم وضبط اور ڈسپلن کی زندگی پر زور دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دلکش مناظر ہر طرف نظر آنے لگے۔درد محسوس کرنے اور درد بانٹنے کا مزاج پیدا کیا گیا اور مواسات ومواخات کے چشمے اُبل پڑے۔اکرام واحترام اور عقیدت ومحبت کا درس دیا گیا اور استاذ وتلمذ،ہم عصر وہم درجہ جیسے رشتوں کے تقدس میں انوکھا نکھار آگیا۔اور یہ سب کچھ وہ ’’نیا تعلیمی انقلاب‘‘ اپنے دامن میں سمیٹ کر لایا جو حضرت الاستاذ ؒ کی تشریف آوری سے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں بپا ہوا تھا۔حضرت الاستاذ ؒ نے ’’دارالفکر‘‘ میں طلبہ کی کردار سازی کی جو مہم محدود پیمانے پر شروع کی تھی۔

انہوں نے اس مہم کو یہاں نہ صرف جاری کیا بلکہ اس کو مزید وسعت دی۔ انہوں نے موم کی بتی کی طرح ہمیشہ اپنے جسم و جان کو پگھلایا"۔[1]

تدریس کیلئے کہا جاتا ہے کہ مدرس وہی ہو سکتا ہے جو مندرجہ ذیل شعر کا مصداق ہو۔

جلا کے مشعل جان ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

کتابیں دار المطالعہ میں بھی پڑھی جا سکتی ہیں سبق رٹنا کوئی بڑی بات نہیں اگر دورِ حاضر کی ٹیکنیکل تعلیم ہے تو فارمولے یاد ہوں اُن کے اطلاق کا ہنر آتا ہو اور تجربہ گاہ میں آلات و مشینوں کے ذریعہ ان کے بارے میں سیکھ کر ایجاد و اختراع کے باغ لگائے جا سکتے ہیں مگر یہ "نونہال" آگے چل کر اچھے انسان بھی بنیں گے یعنی یہ کتابیں پڑھنے سے ہی نہیں آئے گا یہ تو علامہ اقبالؒ کے شعر کی صحیح تفہیم سے آئے گا۔

محبتِ اہل صفا نور و سرور دہند
سر خوش و پر سوز ہے لالہ لب آب جو

استاد کے ساتھ شاگردوں کے جو لمحات گزرتے ہیں وہی درحقیقت محبتِ اہل صفا کے مصداق ہوتے ہیں اور اُن سے شاگرد صرف کتابی درس نہیں لیتا بلکہ انسانیت کے وہ رموز سیکھتا ہے جو کتاب کا مقصد ہوتا ہے۔ اخوت، مساوات، ہمدردی، مصیبتوں میں کام آنا، کشادگی قلب، وسعتِ نظر...... یہ وہ خصوصیات ہیں جو علم کا مقصد ہے اور جن پر حضرت مولانا کے درس میں عملی تربیت دی جاتی تھی اس سلسلہ میں مولانا اسرار الحق قاسمی لکھتے ہیں:

"اور انہوں نے اپنے طلباء کی زندگیوں میں حیاتِ نو اور نئی تازگی پیدا کی۔ اپنا آرام و راحت قربان کیا اور اپنے طلبہ کے لیے زندگی بھر کی راحتوں کا سامان مہیا فرما دیا۔ انہوں نے اپنی علمی و انتظامی مصروفیتوں کے پر ہجوم دور میں بھی اپنے طلبہ کے

[1] ترجمان دار العلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۱۱۸

فلاح و بہبود کی اسکیموں پر برابر غور کیا جس کی ایک مثال 'صندوق الاسعاف'' کا قیام ہے۔ یہ ایک باہمی امدادی سوسائٹی کے طرز پر مالی فنڈ تھا جو طلبہ کو ہنگامی ضرورتوں میں مالی امداد فراہم کرتا تھا۔ راقم السطور کو اس مالی فنڈ کا پہلا سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی ذات طلباء برادری کے لیے مرجع وملجاء بن گئی تھی۔ ان کی محبت اور عقیدت کی جڑیں طلبہ کے دلوں میں گہری ہو گئی تھیں۔ ہر طالب علم ان کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کرتا تھا جس کا زبردست مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے ہنگامہ کے موقعہ پر سامنے آچکا ہے۔ آج ان کے زیرِ سایہ تعلیم وتربیت حاصل کرنے والے طلبہ بڑی تعداد میں ملک اور بیرونِ ملک مختلف شعبہ ہائے حیات میں اپنی بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں ان میں سے کئی اہم مناسب اور کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کے سبھی تربیت یافتہ اپنی بہتر کارکردگی کے ذریعہ اپنی ضرورت واہمیت کو منوا چکے ہیں اور زندگی کے ہر قدم پر ان کے منت شناس ہیں آج ہمارے سروں سے ان کی زندگی کا گھنا اور خنک بار سایہ اٹھ چکا ہے لیکن ان کی یادوں کا چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا اور اپنی ضیاپاشی سے دلوں کو منور کرتا رہے گا''[1]

ڈاکٹر خلیل الرحمان راز لکھتے ہیں:

ہمارے علمی اداروں نے فارغ التحصیل حضرات کی مزید تربیت وآبیاری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے دونوں جانب اس قدر کامیابیاں نہیں ملیں جتنی مل سکتی تھیں علمی ودینی رجحان ومزاج جو ادارے کی چہاردیواری میں پروان چڑھتا ہے اس کی اگر عملی زندگی میں مسلسل آبیاری ہوتی رہے تو بہت سے گوہر ہائے شاہوار جو فکر معاش اور ناقدریٔ ایام کی دست برد کا شکار ہو جاتے ہیں اس سے محفوظ رہ کر قوم وملت کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ دراصل صالح تنظیم اور اجتماعی روح ہی انسانیت کی سربلندی کا زینہ ہے۔ ابن خلدون اپنے مقدمہ تاریخ میں برابر اس طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ مثلاً ایک لاکھ بے ہنگم منتشر افراد کے مقابلے میں ایک ہزار متحد ومنظم با مقصد افراد کی قوت کہیں زیادہ ہوتی ہے بقول شاعر:

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں''[2]

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۱۱۹۔　　[2] ۱۱۸ ترجمان دارالعلوم ص ۲۱۵

اسی لیے ایک اچھا استاد اپنے طلبہ کے ساتھ گھل مل کر رہتا ہے اور اگر سچ کہا جائے تو اس کی حیثیت طلبہ کے لیے ایک دوست ایک عالم اور ایک رہنما کی ہوتی ہے۔ سقراط اپنے شاگردوں سے اکثر سوالات پوچھتا تھا اور اکثر ان کے جوابات بھی خود ہی دیتا تھا۔ کیوں کہ جب استاد سوال کرتا ہے تو شاگرد سوچنے پر مجبور ہوتا ہے جس کے مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں اور طلبہ کے ذہن و دماغ کی گرہیں کھلتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے آج کے دور میں اساتذہ یہ سمجھ ہی نہیں پائے ہیں کہ طلبہ کا بھی اپنا ذہن ہے اور ان میں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ نتیجتاً بیشتر اوقات اساتذہ اپنی علمی تمکنت میں طلبہ کی رائے کو یکسر خارج کر دیتے ہیں یا ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ حالانکہ انہیں سوچنا چاہئے کہ طلبہ کی رائے بھی کئی بار غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیتی ہے کیوں کہ تدریس کے عمل کے ساتھ ساتھ درس کا عمل بھی چلتا رہتا ہے۔

اکثر اساتذہ کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ طلبہ محنتی نہیں ہیں۔ اسباق میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں یا آج کا تعلیمی نظام امتحانات پر منحصر ہے جس میں استاد کو ایک معینہ مدت میں تعلیمی نصاب مکمل کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا استاد کے پاس طلبہ میں دلچسپی و لگن پیدا کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا ہے یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن اساتذہ کو طلبہ میں لکھنے پڑھنے سے دلچسپی و لگن پیدا کرنے کے عمل کو ایک چیلنج کی طرح لینا چاہئے۔

برنارڈ شاہ نے بجا کہا تھا کہ ہم میں سے جو بہتر ہوں گے وہ استاد بنیں اور باقی جہاں جانا چاہیں جائیں۔

ملک اور دنیا کے حالات اور ضرورتوں کے پیش نظر تخلیقی صلاحیت ذہانت اور کمال کا اعلیٰ ترین معیار ہماری درس و تدریس کی منزل مقصود ہونی چاہئے۔ تخلیقی صلاحیت انسانی زندگی کا انمول خزانہ ہے اور تمام نمایاں ایجادات اور کامیابیوں کے پس پشت یہی کارفرما ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تخلیقی صلاحیت پر چند منتخب اشخاص کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ یہ بنیادی خدائی عطیہ

مختلف درجات میں ہر فرد میں موجود ہوتا ہے۔ اب ایسے ذرائع وجود میں آ گئے ہیں جن کے ذریعے اس چھپے ہوئے خزانے کو دریافت کیا جا سکے اور اسے ترقی دی جا سکے۔ تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دینے والی تدریس روایتی طریقے سے مختلف ہوتی ہے۔ اول الذکر طریقۂ تدریس کو اپنانے کا حوصلہ وہی استاد کر سکتا ہے جسے اپنے مضمون پر عبور حاصل ہو اور جو بھرپور تیاری کے ساتھ جماعت میں داخل ہو۔

ذہین طلبہ قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اساتذہ، سرپرست بلکہ پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو پہچانیں اور تدریس کے نئے طریقوں جدید وسائل تعلیم اور مختلف تربیتی پروگراموں کے ذریعے انہیں فروغ دینے کی کوشش کریں۔

یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ موجودہ زمانہ مسابقت و ترقی کا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں انہی لوگوں کی پذیرائی ہو رہی ہے جو اپنے مخصوص میدان میں کمال کے اعلیٰ ترین مقام پر ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسکول کو مختلف سرگرمیوں کا ایسا مرکز ہونا چاہئے جہاں طلبہ کی صلاحیتیں فروغ پائیں اُن کی ذہانت کو جلا ملے۔ وہ علم کے اعلیٰ معیار کو چھو سکیں۔ ضابطوں کی بے جا جکڑ بندیوں اور خوف کے ماحول کے بجائے کھلے ماحول میں اپنی پسند اور میلانِ طبع کے مطابق اکتسابِ علم کریں اور اپنی شخصیت میں نکھار لائیں۔

ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ہماری درس و تدریس اور اسکول کی تمام سرگرمیاں نیکی، شرافت، تہذیب، شائستگی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی بنیاد پر استوار ہوں۔ انسانی اقدار سے محروم تعلیم، معاشرے کو بڑی تیزی سے پستی میں لے جائے گی۔

جس طرح اہل دولت کا سب سے بڑا سرمایہ سونے اور چاندی کا انبار ہوتا ہے اور وہ اپنی شناخت و پہچان کے لیے خوب صورت کاریں زرق برق لباس، شاندار عمارتیں اور دل ہلا دینے والی شان و شوکت کا مظاہرہ کرتے ہیں...... ایک معلم اور مدرس کی پہچان و شناخت اُس کے شاگردوں سے ہوتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس کا پورا کردار اس کے شاگردوں کو دیکھ کر سمجھ میں

آجاتا ہے۔ مثلاً اگر اچھا اُستاد ہے اور جو کچھ علمی سرمایہ رکھتا تھا اسے اپنے شاگردوں تک پہنچا سکا ہے تو یقیناً اس میں علمی بخل اور خست نہیں تھی اور یہ اٹل سچائی ہے کہ اگر کوئی خسی ہے تو وہ زندگی کے ہر شعبہ میں مظاہرہ خست کرے گا۔ ایسے اساتذہ بھی ہیں کہ جنہیں اگر کوئی نایاب کتاب مل جاتی ہے تو وہ اپنے شاگردوں کو اس لیے پڑھنے نہیں دیتے کہ وہ کل اپنے برابر بیٹھ کر اُن سے برابر کی سطح پر بحث کر سکتے ہیں یعنی خست کے ساتھ جذبہ حسد بھی ہے۔

لیکن اعلیٰ ترین اُستاد ان کثافتوں سے دور ہوتا ہے وہ صرف ایک بات جانتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے پاس جو علمی سرمایہ ہے وہ اُسے اپنے شاگرد تک پہنچا دیتا ہے اس سلسلہ میں اُس کی شخصیت کا ادراک اسی وقت ممکن ہے جب اس کے شاگرد اس کے بارے میں یہ سوچتے ہوں کے استاد نے سارا علمی سرمایہ ان تک پہنچا دیا۔ مولانا کے ایک اور شاگرد کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

جناب ندیم الواجدی کے تاثرات اس سے پہلے پیش کیے جا چکے ہیں لیکن یہاں اُن کا تناظر اور سیاق بدلا ہوا ہے۔

> ایک طالب علم کو اس کی تعلیمی زندگی میں بہت سے لائق اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ طے کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے ان میں سے بعض مہربان اور مشفق بھی ہوتے ہیں اور بعض محتاط اور یکسو ہوتے ہیں۔ میں نے بھی دارالعلوم کے تعلیمی سفر میں بہت سے لائق تعظیم اور مشفق اساتذہ سے رہ نمائی حاصل کی ہے ان سب کے بے شمار احسانات مجھ پر ہیں لیکن جو بات استاذ محترم میں تھی وہ کسی میں نہیں تھی وہ دارالعلوم کے روایتی اساتذہ کی طرح نہیں تھے جو صرف اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں۔ اور جن کی تمام ترسرگرمیوں کا مرکز وہ اسباق ہوتے ہیں جو ارباب حل وعقد نے ان کو تفویض کر رکھے ہیں یا ان کا دائرہ عمل ان مناسب تک وسیع ہوتا ہے جو انہیں حاصل ہیں یا جن کے حصول کی امید ہے اُستاذ محترم بھی ایک استاذ تھے ان کے ذمے بھی کچھ اسباق تھے لیکن وہ استاذ کم ایک مشفق مربی اور ایک مہربان باپ زیادہ تھے۔ میری طرح ان کے

لاتعداد شاگردوں کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ محض تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک رحم دل ہمدرد اور مزاج شناس باپ کے سایہ عاطفت میں پرورش پا رہے ہیں اپنے طلباء سے ان کا لگاؤ ان کے مشاغل پر گہری نظر ان کی اصلاح و تربیت کے لیے جہد مسلسل ان کے مسائل سے دلچسپی ان کی پریشانیوں میں اضطراب یہ استاذ محترم کی ایسی خصوصیات ہیں جو روایت کے اسیر اساتذہ میں ناپید ہیں۔ ہر طالب علم ان سے انتساب کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتا تھا اور جس نے ان کے دامن میں پناہ لے لی اسے یہ احساس سرشار کر جاتا تھا کہ وہ حالات کی تیز دھوپ سے بچ کر ایک ایسے درخت کے سایے میں آگیا ہے جس کی شاخیں گھنی اور جس کی ہوائیں خنک ہیں۔ [1]

النادی الادبی:

اُستاد جہاں علم کی جاگیر تقسیم کرتا ہے اور کردار سازی کیلئے اسے سختی بھی برتنا پڑتی ہے وہیں اُس کا یہ خوشگوار فریضہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے لیے اپنی شفقتوں کے خزانے لٹاتا رہے اور اس طرح وہ استاد بھی ہوتا ہے اور ایک مہربان باپ کی طرح مشفق بھی..

اُستاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طالب علموں میں تحریک پیدا کرے اُن کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھارے اور انہیں مشاغل میں اس طرح مصروف رکھے کہ وہ صراطِ مستقیم سے ہٹنے نہ پائیں دورِ حاضر کے مغربی ماہرین تعلیمات کا یہ کہنا ہے کہ طلباء میں جو انحراف پسندانہ وتشدد دانہ اور غیر علمی رجحانات جو پیدا ہو رہے ہیں انہیں Chanallised نہیں کیا گیا ہے۔

مولانا وحید الزماںؒ اس نکتہ سے باخبر تھے اور اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے النادی الادبی کا ادارہ قائم کیا تھا۔ یہ طلباء کے لیے طلباء کی طرف سے طلباء کا ادارہ تھا اس ادارہ کے موسس مولانا وحید الزماں کیرانوی تھے اس سلسلہ میں مولانا نور عالم خلیل امینی تحریر فرماتے ہیں:

''النادی الادبی'' کی بنیاد مولانا ؒ نے ۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں رکھی تھی۔ اس کا مقصد

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۱۲۹ ندیم الواجدی کا مضمون ''کچھ حقائق کچھ تاثرات''

ہر چند کہ دراصل عربی زبان میں تقریر و تحریر کی مشق اور عربی زبان کو مدرسوں کی زندگی میں ایک زندہ زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کی تحریک پیدا کرنا تھا لیکن مولاناؒ کے زرخیز ذہن، تخلیقی صلاحیت اور مربیانہ نفسیات نے اس کو ایک جامع ترین مدرسہ بنا دیا تھا۔ طلبہ یہاں وہ سارے اسباق پڑھتے اور ہوش و خرد کے ساتھ یاد کرتے تھے، جن کی انہیں آج دارالعلوم میں اور کل دارالعلوم کے باہر کے معاشروں میں ہر جگہ ضرورت تھی اور جنہوں نے ان کی زندگی کی چولیں درست کر دیں۔ ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، حوصلہ بلند ہوا، عزم و ہمت پروان چڑھی، صلاحیتیں اجاگر ہوئیں، افکار و خیالات کا زنگ دور ہوا، جینے کا سلیقہ آئے، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر رحم کھانے کا سبق ملا، انتظامی اور تنظیمی صلاحیتیں پروان چڑھیں، میزبانی اور مہمان نوازی کا گر معلوم ہوا، خدمت اور محنت کے خوگر بنے، صبر و ثبات کی لذت انہیں معلوم ہوئی، حسن سلوک، ہمدردی، غم خواری، عدل و مساوات، ایثار و قربانی اور اسلامی اخلاق پر عمل، تجربے کی راہ سے جان گئے۔[1]

انہوں نے النادی کے مختلف شعبہ قائم کئے تھے اور طلباء کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اس کے سالانہ اجتماعات ہوتے تھے اسی کا ایک بڑا شعبہ تحریر سے متعلق تھا جس میں شامل طلباء عربی زبان میں مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کی مشق کرتے تھے۔ مضمون نگاری سے جو طلباء دلچسپی رکھتے تھے انہیں مختلف زمروں میں تقسیم کرتے تھے اور ہر زمرے کا جو رسالہ ہوتا تھا اس کا ایک مدیر ہوتا تھا اور ایک نائب مدیر اور کچھ اراکین ادارت ہوتے تھے یہ سارے رسائل ایک مقررہ تاریخ پر دیوار پر چسپاں کر دیئے جاتے تھے اس سے ایک پنتھ دو کاج والی کہاوت صحیح ثابت ہوتی تھی اور طلبہ اسی بہانے کتابت سیکھ لیتے تھے کتابت اس طرح آجاتی تھی کہ ہر گروپ کو اپنا رسالہ خود لکھ کر دیوار پر چسپاں کرنا ہوتا تھا اور اس کی صوری کیفیت ایسی ہو کہ وہ دلکش ا رجاذب نظر ہو۔

النادی کے دوسرے شعبوں میں مالیات امر بالمعروف نہی عن المنکر کے شعبہ بھی تھے جس سے کہ طالب علم ہر وقت مصروف رہتا تھا اس سلسلہ میں مولانا نور عالم خلیل امینی لکھتے ہیں:

---

[1] وہ کوہ کن کی بات ص ۸۰۔۸۱

دوسری طرف طلبہ بھی ہر چیز کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس لیے سیکھ جاتے کہ مولاناؒ کی طرز ہمت افزائی ہی کچھ ایسی ہوتی کہ اُن کی خوابیدہ صلاحیتیں آناً فاناً بیدار ہو جاتیں۔ انہیں محسوس ہوتا کہ وہ بڑے لائق و فائق آدمی ہیں، وہ اتنا کچھ کر سکتے ہیں، جو ماضی میں بڑے بڑے لوگ نہ کر سکے۔ مولاناؒ کے الفاظ ایسے مواقع پر سدھائے ہوئے تیر کی مانند ہوا کرتے، وہ سیدھا دل میں پیوست ہو جاتے، سننے والے کی نیند حرام ہو جاتی اور حرکت و عمل اور بے خوابی و تکان کی لذت کے ماسوا، ہر لذت سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا:

تیرے نفس سے ہوئی، آتش گل تیز تر
مرغ چمن! ہے یہی، تیری نوا کا صلہ

ہمارا اور ہمارے بہت سے ساتھیوں کا دار العلوم کے زمانۂ طالب علمی میں طریقہ تھا کہ جب ہم سستی و کاہلی محسوس کرتے اور کسی وجہ سے ہفتے دو ہفتے کے بعد لکھنے پڑھنے سے جی اچٹ جاتا، تو ہمت و حوصلے کی بیٹری کو چارج کرنے کے لیے ہم مولاناؒ کے پاس آجاتے، مولاناؒ لکھنے پڑھنے اور اپنے مشاغل میں لگے ہوتے، ہم اُن کے پاس ایک آدھ گھنٹے بیٹھ کر اُن کی چستی اور پھرتی سے، ایسی طاقت اور غذا حاصل کر لیتے، کہ کئی کئی ہفتے ہم چست رہتے[1]

النادی الادبی کے سلسلہ میں جناب ندیم الواجدی نے بڑی تفصیل سے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں یہاں یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یونیورسٹیوں میں ہر موضوع سے متعلق ایک انجمن ہوتی ہے مثلاً جامعات میں شعبۂ اُردو کی اسوسی ایشن کو بزم ادب کہتے ہیں اُسی طرح النادی الادبی کی تنظیم تھی مگر کارکردگی کے اعتبار سے النادی زیادہ فعال، متحرک اور کارکرد تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا ندیم الواجدی اپنے تجربات کی روشنی میں لکھتے ہیں:

ان دنوں دار العلوم میں عربی زبان سیکھنے کا شوق کافی بڑھا ہوا تھا، بے شمار طلباء القرأۃ الواضحہ کے اجزاء سبقاً سبقاً پڑھنے میں مصروف تھے، استاد محترم نے عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے مقصد سے، طلباء کو مشق و تمرین کی سہولتیں بہم پہنچانے کے

[1] وہ کوہ کن کی بات۔ مولانا نور عالم خلیل امینی

لیے "النادی الادبی" کے نام سے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی استاد محترم اس کے المشرف العام (سرپرست اعلا) تھے۔ انجمن کی باقی تمام ذمہ داریاں طلباء کے سپرد تھیں۔ بہ ظاہر یہ ایک انجمن تھی لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسا ادارہ تھا جہاں طلباء عربی زبان میں تحریر و تقریر کی مشق بھی کرتے تھے اور تہذیب و شائستگی کا درس بھی لیتے تھے۔ دار العلوم کے تمام ذہین، باشعور اور باصلاحیت طلباء اس انجمن کے رکن تھے، اور اس طرح استاد محترم "النادی الادبی" کے ذریعے بلکہ النادی الادبی کے واسطے سے اپنی خدمات کے ذریعے تمام طلباء کے دل و دماغ پر حکومت کرتے تھے۔

ابھی تعلیمی سال کے آغاز کو ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ استاذ محترم نے "النادی الادبی" کی نئی کابینہ تشکیل فرمائی اور میں اس وقت خوشگوار حیرت میں پڑ گیا جب استاذ محترم نے یہ بتلایا کہ تمہیں "النادی الادبی" کا معتمد بنا دیا گیا ہے یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی، دار العلوم دیوبند میں طلباء کی سب سے بڑی انجمن کا معتمد بننا کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا۔[1]

طوالت کے خیال سے بہت ساری تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے کہ موصوف کے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں یہ تحریر فرمایا ہے جس کا لب ولباب یہ ہے کہ النادی میں شرکت کرنے والے طلباء میں جذبہ مسابقت تو ہوتا تھا مگر یہ "خیر" پر مبنی ہوتا تھا۔ اس میں گروہ بندی، سازشی سیاست اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا تصور نہیں تھا جو اکثر طلباء کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کے ذریعہ سے اساتذہ کرام طلباء کو سیڑھیوں کی طرح استعمال کر کے زک پہونچاتے۔ مگر مولانا نے اس انداز میں تربیت کی تھی کہ یہ امر واقعہ نہ ہو۔

النادی کے سلسلہ میں یہ پہلو قابل غور ہے کہ اس کی تشکیل ہیئت وساخت میں عہدِ حاضر کے وہ تمام گوشوں کی جو کسی تنظیم کو چلانے کی ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ جناب ندیم الواجدی اس کے معتمد بھی تھے عہدہ دار ہونے کی وجہ سے اس کے تشکیلی ڈھانچہ سے باخبر

[1] ترجمان دار العلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر میں شامل مضمون کچھ حقائق کچھ تاثرات مولانا ندیم الواجدی۔ صفحہ ۱۳۵۔۱۳۶

تھے اس لیے ان کا یہ طویل اقتباس ناگریز طور پر پیش کیا جارہا ہے:

دل چاہتا ہے "النادی الادبی" کا کچھ اور ذکر کروں، یہ انجمن استاذ محترم کی محنتوں کا ثمر، ان کی امنگوں کی آماجگاہ ان کے حسین خوابوں کی تعبیر ان کے تخیل کی اڑان اور ان کے خون جگر سے سینچا ہوا وہ شاداب پودا تھا جو اب تناور درخت بن گیا ہے اور جس کے برگ و بار دار العلوم کی حدود سے گذر کر اب دنیا کے بے شمار مدارس میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ انجمن استاذ محترم کی ایک ایسی علمی یادگار ہے جسے مستقبل کا کوئی مورخ نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اس کے ذریعے استاذ محترم نے جو خدمت انجام دی ہے وہ ناقابل فراموش ہے، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن جو لوگ اس انجمن کے رکن رہ چکے ہیں وہ اس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ انجمن دار العلوم کے ان طلباء کے لیے تشکیل دی گئی تھی جو عربی زبان میں تقریر و تحریر کی مشق کرنا چاہتے ہوں، اس کا ایک دفتر تھا، جس میں سلیقے سے متعدد ڈیسک رکھے ہوئے تھے اور ہر ڈیسک پر النادی الادبی کے کسی ایک ذمہ دار کے منصب کی تختی رکھی ہوئی تھی، الماریوں میں قرینے سے فائلیں اور رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر طلباء کی تحریری کاوشوں کے نمونے شیشے کے بڑے بڑے فریموں میں آویزاں تھے۔ النادی الادبی کا مکمل نظام تھا، پوری انجمن مختلف شعبوں پر منقسم تھی، شعبۂ تحریر، لائبریری، مالیات، شعبۂ اصلاح، شعبۂ تعاون وغیرہ۔ ہر شعبے میں تین عہدے دار تھے ایک ناظم، دوسرا نائب ناظم، تیسرا معاون، معتمد ان تمام شعبوں کا سربراہ تھا اور براہ راست سرپرست اعلیٰ کو جواب دہ تھا۔ شعبۂ تقریر کے تحت طلباء عربی زبان میں تقریر کی مشق کرتے تھے اس کے لیے جمعرات کے دن مغرب کی نماز کے بعد دار العلوم کی مختلف درس گاہوں میں آٹھ آٹھ دس دس طلباء ایک جگہ بیٹھتے۔ ایک طالب علم جو ان سب میں ممتاز اور باصلاحیت ہوتا، ان کی نگرانی کرتا۔ یہ ایک چھوٹا سا جلسہ ہوتا تھا۔ اور اس میں ایک مکمل اجلاس کے آداب کی رعایت کی جاتی تھی۔ مراقب یا نگراں کسی طالب علم کے نام کا اعلان

کرتا اور وہ متعین جگہ پر کھڑے ہو کر اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تقریر کرتا۔ نگراں کے پاس النادی الادبی کے مطبوعہ فارم ہوتے تھے جن پر مقرر کا نام اس کی تقریر کا عنوان تحریر کیا جاتا۔ اور یہ لکھا جاتا کہ اس نے کتنی دیر تقریر کی ہے' اس کا لہجہ کیسا تھا۔ اس کی تقریر میں نحوی' صرفی اور لغوی غلطیاں کتنی تھیں' بعد میں یہ فارم دفتر میں جمع ہوتے' اس طرح تمام ممبر طلباء کی ہفتہ وار سرگرمیوں کی رپورٹ معتمد کے سامنے رہتی۔ ماہانہ اور سالانہ جلسوں میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی ان جلسوں میں خاص طور پر ان طلباء کو ترجیح دی جاتی تھی جن کی کارکردگی ہفتہ وار اجتماعات میں بہت رہی ہو۔

ماہانہ جلسوں کی اپنی الگ شان تھی' کافی دن پہلے دارالعلوم کے صدر گیٹ پر یہ اعلان لگا دیا جاتا تھا کہ فلاں تاریخ کو النادی الادبی کا ماہانہ اجتماع منعقد ہوگا' جو طلباء اس اجتماع میں اپنی تحریری یا تقریری کاوشیں پیش کرنا چاہتے ہوں وہ درخواست دے دیں' اسی کے ساتھ اجتماع کی باقاعدہ تیاری شروع ہو جاتی۔ خواہش مند طلباء سے ان کے مقالے' تقریریں' نظمیں اور محادثے حاصل کر لئے جاتے' معتمد اور شعبۂ تقریر کے ذمہ دار لوگ ان کاوشوں پر غور و خوض کرتے' ضرورت ہوتی تو اصلاح کرتے۔ لمبی اور طویل تحریروں کو مختصر کرتے تا کہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ طلباء کو موقع دیا جا سکے۔ یہ اجلاس پورے مہینے کی کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا تھا اس لیے بڑی دل جمعی اور نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اسکی تیاری ہوتی تھی اور یہ کوشش کی جاتی تھی کہ پورا پروگرام اتنا دلچسپ اور ہمہ جہت ہو کہ سامعین شروع سے آخر تک جلسہ گاہ میں جمے رہیں۔ اس مقصد کے لیے نئے نئے موضوعات پر دلچسپ محادثے (مکالمے) تیار کئے جاتے تھے' اور وہ ایک تقریروں یا مقالوں کے بعد ایک محادثہ پیش کر دیا جاتا تھا۔ ماہانہ اجتماعات میں استاذ محترم لازماً شرکت فرماتے تھے' بعض دوسرے مدرسین کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور اکثر و بیشتر اساتذہ دارالعلوم ہی جلسوں کی صدارت بھی کیا کرتے تھے۔[1]

---

[1] وہ کوہ کن کی بات۔ مولانا نور عالم خلیل امینی

کبھی کبھی صدارت طلباء بھی کرتے تھے اور اس طرح ان کے اندر خود اعتمادی علمی وقار کی پاسداری اور قائدانہ صلاحیت پیدا ہوتی تھی اُن کے بہت ہی عزیز شاگرد مولانا نور عالم خلیل امینی نے النادی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے:

النادي اور اس کے شعبوں کا تذکرہ اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کیرانوی رحمہ اللہ کی علمی تعلیمی تدریسی فکری تربیتی تحریری اور تقریری سرگرمیوں کو کما حقہ گرفت میں لانے کے لیے "نادی" کا جاننا ضروری ہے کہ نادی ہی کے اسٹیج سے مولانا نے وہ گراں قدر خدمات انجام دیں جو ان شاء اللہ ابد الآباد تک باقی رہیں گی ان کے صحیفۂ اعمال کو روشن کریں گی اور کل بروزِ حساب ان کی حسنات کے پلڑے کے لیے پاسنگ ثابت ہوں گی۔

النادی کی اہمیت اور قدر و قیمت جاننے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ دار العلوم میں مولانا وحید الزماں سے قبل عربی زبان کے تئیں ایک ایسی زندہ زبان کی حیثیت سے جس کو لکھنے پڑھنے اور بولنے کے لیے یکساں طور پر استعمال کیا جاسکتا ہو کوئی سنجیدہ اور ٹھوس کوشش سامنے نہیں آئی۔ مولانا کو کتاب و سنت اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت کے سلسلے میں برصغیر کے اس سب سے بڑے مرکز اور اسلام و مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے اس دیار کے اس سب سے بڑے نقیب ادارے اور تحریک کی طرف سے قرآن کریم اور اسلام کی قانونی زبان کے سلسلہ میں عظیم کوتاہی کا باور احساس ہوا۔

اس طرح سے مولانا نے النادی کو ایک نشرگاہ کی حیثیت سے استعمال کیا اور طالب علموں میں وہ Spirit پیدا کی کہ ان کے اندر کہ وہ احساس ذمے داری اور ہر کام کو اپنے وقت پر کرنے کی عادت ان کے عمل کا حصہ بن گئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ایک فوجی کی چستی اس کی تیزی اس کا ساڈسپلن اور اس کی سی اطاعت شعاری ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی اور طالبِ علم کی حیثیت سے اپنی ذمے داری اور اس مسلم قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی اور کائنات میں اپنا مقام سمجھ گئے جو لوگوں کی اصلاح قیادت و سیادت اور ہر گوشۂ عالم انسانیت سے ظلم و تیرگی کو مٹانے کے لیے معرضِ وجود میں لائی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ نادی ہی کے ذریعے اکثر طلبہ دعوت الی اللہ کے ڈھنگ اور عصرِ حاضر میں اس کو

> پیش کرنے کے طریقے نیز اس سلسلے میں حکمت اور تدریجی عمل کی مصلحت وغیرہ سے بھی اچھی طرح گزر گئے جس سے انہوں نے بعد میں دعوت والی زندگی میں خدا کی توفیق سے بہت کچھ کر دکھایا[1]

النادی کا ایک تصور طلباء کو متحرک رکھنا تھا ایسی مشغولیت جو اُن کے اندر عقابی روح بیدار کرے اس سلسلہ میں النادی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ:

دار العلوم کے تعلیمی اور ثقافتی ماحول پر "النادی الادبی" کے ماہانہ اجتماعات کے زبردست اثرات مرتب ہوتے تھے طلباء میں عربی زبان سے دلچسپی اور وابستگی بڑھتی تھی؛ نئے طلباء آنا چاہتے تھے اور پرانے طلباء زیادہ بہتر انداز میں کام کرنا چاہتے تھے اور کامیابیوں سے حوصلہ پا کر ذمہ دار طلباء نقش ثانی کو نقش اول سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اجتماعات میں پیش کئے گئے پروگراموں کے معیار اور جلسہ گاہ کے نظم ونسق میں استاذ محترم کے ذہن وفکر کی جھلک ملتی تھی۔ یہ ماہانہ اجتماعات دوسری اضلاعی انجمنوں کے لیے نمونہ اور معیار قرار پاتے تھے۔

النادی الادبی کا سالانہ اجتماع دار العلوم کی تعلیمی زندگی کا ایک بے مثال، پُر جوش اور کیف آور واقعہ ہوا کرتا تھا۔ تقریباً دو ماہ پہلے سے اس اجتماع کی تیاری شروع کر دی جاتی تھی جنہوں نے ہفتہ وار اور ماہانہ اجتماعات میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو، جس کی درخواست منظور ہو جاتی اسے اس کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق موضوع دیا جاتا۔ اجتماع سے کافی پہلے تمام طلباء سے ان کے موضوعات تحریری شکل میں لے لیے جاتے' ان پر غور کیا جاتا' بعض طلباء کے مضامین دفتر ہی میں صحیح کر دیئے جاتے' اور بعض طلباء سے دوبارہ لکھنے کے لیے کہا جاتا' بعض طلباء کو دفتر میں بلا کر تقریریں اور محادثے سنے جاتے۔ جلسہ گاہ کے نظم ونسق کے متعلق تمام جزئیات پر نظر ڈالی جاتی اور ہر کام کے لیے طلباء میں سے ذمہ دار مقرر

---

[1] وہ کوہ کن کی بات۔ مولانا نور عالم خلیل امینی

کیسے جاتے۔ یہ زمانہ النادی الادبی کے اراکین کے لیے معروفیت کا زمانہ ہوتا تھا۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں تعلیم کا وہ تصور تھا جو کہ آج مغرب کا جدید ترین تصور ہے طلباء کی صلاحیتیں صرف کلاس روم تک محدود نہیں رہنا چاہئے انکا بھرپور اظہار ہونا چاہئے مغرب کے پاس ڈرامہ اداکاری اور فیشن ریہرسل مولانا نے تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اُن کی دنیا ہی بدل دی۔ علم میں بھی دلچسپی ہوتی ہے اور مذہب بھی روکھا پھیکا' خشک مُلا نہیں ہوتا بلکہ انسانی شخصیت کے بہت سارے گوشوں میں جمود کو توڑ کے حرکت پیدا کرنا اور حرکت سے قوس قزح کے رنگوں کی طرح صحت مند فضا کے ساتھ دلکشی کی تخلیق کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ آسان و سہل بھی ہے۔

مولانا نے ہر نظریہ اور تصور میں جنم لینے والے خیالات کو عملی شکل دے کر یہ ثابت کر دیا کہ عربی زبان کے ذریعہ بھی طالب علم میں ذوق و شوق، دلچسپی و لگن اور متحرک و فعال تنظیمیں وجود میں لائی جا سکتی ہیں۔

مولانا کے طرز تدریس کا صرف ایک رخ رہ جاتا ہے جو ان ہی کے طالب علموں کی تحریر سے پیش کیا جا رہا ہے اُن کے عزیز مولانا شاگرد نور عالم خلیل امینی لکھتے ہیں:

> وہ مکمل ایک ہفتے کتاب' یا اس کے تعلق سے کچھ کہنے کے بجائے اُن آداب کی تعلیم دیتے' جن کو باقاعدگی کے ساتھ برتنا' ان کے درجے کے ہر متعلم کے لیے ضروری ہوتا۔ وہ بتاتے کہ کوئی طالب علم دورانِ درس' درس گاہ سے باہر نہیں دیکھ سکتا' استاذ و کتاب کے علاوہ' ادھر ادھر نگاہ نہیں دوڑا سکتا' کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا' جس سے درس کے تئیں اس کی بے رغبتی کی غمازی ہوتی ہو' مولانا کے محاضرے اور شرحِ درس کے دوران' اُن سے کسی بات کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کر سکتا' اس لیے کہ اس سے سلسلہ کلام ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر وہ کسی کلمے کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتائیں کہ اس لفظ کے یہ معنی آتے ہیں' تو ضروری ہے کہ وہ نہایت غور سے سنے نہ یہ کہ وہ اس لفظ کے کسی ایسے غلط یا صحیح معنی پر غور کرنے میں اپنے ذہن کو مشغول رکھے' جو اس نے کسی لغت کی کتاب میں

دیکھا ہوا اور پتہ نہیں صحیح سمجھ سکا ہو کہ غلط یا کسی استاذ سے سنا ہو اور خدا معلوم کس حد تک اس نے ان سے صحیح صحیح اخذ کیا ہو؟ نیز ہر طالب علم کے لیے واجب ہے کہ وہ درس گاہ میں داخل ہونے سے قبل طاقتور عربی لہجے میں سلام کرے وغیرہ۔[1]

مولانا کا سبق ''سنجیدگی'' کے طویل، خشک اور صبر آزما مفہوم سے نا آشنا ہوتا، وہ تفریحی جملوں سے ہمیشہ کلاس کو زعفران زار بنائے رکھتے، اُن کا دل چسپ انداز گفتگو، پُر لطف نکتہ سنجی، زیر درس مسئلے پر مرتب اور فصاحت و بلاغت آمیز تقریر پھر دین و دنیا، زندگی و کائنات، حال و مستقبل، ایمان ویقین، تعلیم و تربیت اور اخلاق و آداب کے حوالے سے بلیغ اشارے، اس پر مستزاد ہوتے۔ ان سب وجوہات کی بنا پر ایک طالب علم از اول تا آخر سراپا شوق و ذوق بن کر ان کا درس سنا کرتا۔

بعض دفعہ مریض ہونے کے باوجود طالب علم کوشش کرتا کہ ان کا سبق نہ چھوٹنے پائے کہ صرف ایک گھنٹے میں خیر کثیر ہاتھ سے رہ جائے گا۔ طالب علم ان کی درس گاہ سے نکلتا، تو اس کی طبیعت میں بشاشت ہوتی، اس کا دل مسرور ہوتا اور اس کا حافظہ جہاں اس مضمون میں بہت کچھ سمیٹ لیتا، جو مولانا نے پڑھایا ہوتا۔[2]

مولانا نے عربی زبان کی تدریس کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ جو بھی موضوع ان کی تقریر کا جزو بن رہا ہے اس میں ان کی پوری شخصیت کی روح سمیٹ آئے یا اقبال کے لفظوں میں خون جگر کی نمود سے ہی معجزہ فن تدریس سامنے آئے اس سلسلہ میں مولانا نور عالم خلیل امینی کے بیان سے دعویٰ کی دلیل فراہم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا تقریر اور تدریس کے دوران اپنے مخاطب کے دل و دماغ کو اپنے خلوص، اپنی حقیقت بیانی، شیرینی گفتار، اپنی پرکشش شخصیت، رعنائی خیال اور چشم کشا و عقل کشا معانی و مضامین کے ذریعے اسیر کر لیتے۔ وہ تاثیر آفرینی کے لیے کسی خارجی سبب کا سہارا نہ لیتے، یعنی وہ اس ''کرتب'' سے کام نہ لیتے، جس سے عام طور پر پیشہ ور مقررین، مدرسین اور مجلس باز لوگ کام لیا کرتے ہیں۔ وہ نہ بلا ضرورت کے لطیفوں سے کام لیتے، نہ موقع بہ موقع اشعار پڑھتے۔

---

[1] کوہ کن کی بات ص ۶۹۔۷۰　[2] وہ کوہ کن کی بات ص ۵۷

ان کے اشعار نہ پڑھنے کی بات آہی گئی ہے تو یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میں نے یا میرے کسی دوست نے زندگی میں کبھی بھی مولانا سے کوئی شعر یا کوئی مصرع نہیں سنا' دورانِ تقریر نہ دورانِ مجلس نہ دورانِ تدریس۔ وہ غالباً ادب کے میدان کے واحد شہ سوار تھے کہ تحریر و تقریر میں مسلم فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود "مشقِ سخن" ہی نہیں بلکہ "شغلِ سخن" سے بھی پرہیز رکھا' ہم لوگوں کو اس سلسلے میں تعجب تو رہا! لیکن اس کی وجہ دریافت کرنے کی کبھی ضرورت محسوس ہوئی' نہ موقع سامنے آیا۔[1]

مولانا نے اپنے خطابت کے اسلحوں میں شوکی بیساکھیاں نہیں رکھی بلکہ لہجہ سے ہی کام نکالا وہ باکمال عربی خطیب تھے مولانا خلیل امینی لکھتے ہیں:

ہم لوگ جب انہیں عربی میں سنتے' تو محسوس ہوتا کہ کوئی عربی نژاد بلیغ اور باکمال خطیب نواسنج ہے' وہی لہجہ' وہی خوبی' وہی تلفظ' وہی نغمہ و جرس اور سب سے بڑھ کر حروف کی اپنے مخارج سے ادائیگی۔ اس پر ان کا وہ اخلاص مستزاد ہوتا' جس کی برکتیں ان کے منہ سے نکلے ہوئے سارے الفاظ میں اس طرح محسوس ہوتیں' جیسے پھول کی پتیوں میں بادِ سحر گاہی کا نم۔ ان کا ہر جملہ سچائی کی روشنی سے منور ہوتا اور صاف محسوس ہوتا' کہ دل کا با مقصد درد الفاظ کے لباس جمیل کے اندر سے چھلک جانا چاہتا ہے۔[2]

اُن کے طرزِ تدریس کے سلسلہ کا ایک واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ان کے شاگرد لکھتے ہیں:

دارالعلوم کی تعلیمی زندگی میں مجھے سب سے پہلے استاذ محترم سے القراءۃ الواضحۃ کا پہلا حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی' اس وقت دارالعلوم میں درجہ بندی نہیں تھی' بلکہ طلباء اپنی خواہش سے بھی خالی گھنٹوں میں یا خارج میں اسباق لے لیا کرتے تھے' بہر حال کسی گھنٹے میں میرا سبق شروع ہوا' سو ڈیڑھ سو طلباء درس گاہ میں حاضر تھے' دوسری درس گاہوں کے برعکس یہاں کا منظر کچھ غیر مانوس اور اجنبی محسوس ہوا۔ اب تک تو یہ دیکھا تھا کہ ہر کتاب کا آغاز جانے پہچانے انداز میں ہوتا' استاذ صاحب تشریف لاتے' سلام کا تبادلہ ہوتا' اور اپنی نشست پر تشریف رکھتے۔ کوئی طالب علم کتاب کی ابتدائی

---

[1] وہ کوہ کن کی بات ص ۷۵ [2] وہ کوہ کن کی بات ص ۷۵

عبارت پڑھتا اور استاذ صاحب کی تقریر شروع ہو جاتی۔ یہاں ابتدا ہی عجیب و غریب انداز سے ہوئی نہ کسی طالب علم سے عبارت پڑھنے کے لیے کہا گیا اور نہ لمبی چوڑی تمہید باندھی گئی اور نہ بسم اللہ پر بحث و گفتگو کے دروازے کھولے گئے۔ بلکہ طلباء کے سامنے تعلیم کی افادیت عربی زبان کی اہمیت اور سبق کے آداب پر کچھ دل میں اتر جانے والی باتیں کہی گئیں جب اجنبیت کی دیوار گری اور فضا میں انسیت کھلی تو طلباء سے کہا گیا کہ وہ کھڑے ہو کر اپنا تعارف کرائیں ہر طالب علم نے اپنا تعارف کرایا اور استاذ صاحب ہر طالب علم کی طرف اس طرح متوجہ رہے جیسے کوئی منکسر المزاج اور متواضع میزبان اپنے کسی پسندیدہ مہمان کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ دو تین روز اسی تعارفی کاروائی میں لگے یہ نقش اولیں تھا جو میرے اور مجھ جیسے نو آموز طلباء کی سطح ذہن پر مرتسم ہوا یہ انوکھی کاروائی ہی ہماری گفتگو کا موضوع بن گئی پہلے ہی دن تمام ہم سبق ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے [1]

یہ وہ چھوٹے چھوٹے نکتے اور نقوش ہیں جن سے مولانا کے تدریسی مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے انہوں نے وسیع تر تناظر میں ہمیشہ دیکھا برتا اور اُس کا عملی ثبوت دیا وہ اس رمز سے واقف تھے کہ اُستاد کے درس گاہ کی باہر کی زندگی بھی اہم ہوتی ہے اور کبھی کبھی اس کی شہرت اُستاد کی شخصیت کو اُبھارنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے چنانچہ کچھ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو انفرادیت عطا کرتی ہے اور اس انفرادیت کی شہرت استاد کی شبیہ بناتی ہے یہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

مولانا مرحوم کا مستقر تھا جہاں ہر موضوع پر باہمی مذاکرہ اور گفتگو کا سلسلہ مغرب سے عشاء تک بلکہ عشاء کی نماز کے بعد بھی خاصی دیر تک جاری رہتا۔ یہیں مولانا مرحوم کے جاری کردہ ماہنامہ "القاسم" جدید کے مضامین کا انتخاب اداریہ اور تبصرہ و ترتیب پر مشاورت ہوتی بعض اوقات مولانا بارہ بنکوی کی بدولت دلچسپ اور دوستانہ نوک جھونک سے یہ مجلس بڑی پُر لطف بن جاتی۔ راقم الحروف کا تعلق "القاسم جدید" کی ادارت سے ان تینوں احباب کی خواہش اور اصرار کے بعد ہو گیا تھا کہ اس سے قبل دیوبند سے نکلنے والے ماہنامہ تذکرہ کے قانونی مدیر تو مولانا نجم الدین اصلاحی تھے مگر عملاً کچھ عرصہ تک

---

[1] دہ کوہ کن کی بات ص ۷۵

پرچہ کی ترتیب اور اداریہ کا تعلق احقر ہی سے رہا جس نے بظاہر ایک اچھا تاثر چھوڑا۔ اسی بناپر "القاسم جدید" سے بھی وابستگی ہوئی اور اس کے بعض اداریئے اور تبصرے بھی خاصے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے اور حلقۂ دیوبند میں دیر تک موضوع بحث رہے۔ یہ دور مولانا مرحوم کی وضعداری کی خاص شان رکھتا تھا۔ وہ خود مقروض اور تنگ دست ہو کر دوستوں کے لیے قرض لیتے اور ان کی ضرورت پوری کرتے۔ معاشی حالات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود وہ اپنے رہن سہن اور طرز زندگی میں کوئی فرق نہ آنے دیتے' صاف شفاف لباس' شائستہ گفتگو' دوٹوک بات چیت اور تنقیدی مزاج کے ساتھ ہر جگہ "وحید الزماں" کی حیثیت سے اپنی اک پہچان رکھتے تھے [1]

برصغیر کے دینی مدارس میں مروج درسِ نظامی میں شامل مختلف عقلی و نقلی علوم کی طرح عربی ادب کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک ایک لفظ پر اُکتا دینے والی اور طلبہ کے لیے ناقابل ہضم بحثیں ہوتیں۔ کسی لفظ کے تحت ڈکشنری میں مختلف مواقع پر استعمال ہونے والے جتنے معانی درج ہوتے ہیں' وہ سب یا اُن کا بیشتر حصہ نقل کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی ادب جیسا دلچسپ علم یونانی فلسفے کی کوئی چیستاں معلوم ہوتا اور عربی زبان لکھنے اور بولنے کی صلاحیت بالکل پیدا نہ ہوتی۔ استاذ مرحوم کا اندازِ فکر یہ تھا کہ اس طریقۂ تعلیم میں مشقت زیادہ اور منفعت بہت کم ہے۔ اس کے برخلاف اگر ایک موقع پر کسی لفظ کے صرف وہ معنی بیان کئے جائیں جس معنی میں وہ لفظ اس جگہ استعمال ہوا ہے تو اسے "سمجھنا" یاد رکھنا اور لکھنے و بولنے میں اس کی مشق کرنا آسان ہو گا پھر جہاں کہیں وہی لفظ دوسرے معنی میں مستعمل ہو' وہاں دوسرے معنی بیان کئے جائیں۔ یہ بات کس درجہ مضحکہ خیز ہے کہ رَغِبَ الی رَغِبَ عن اور رَغِبَ فی کا رمز شناس ان کے معمولی استعمال سے ناواقف اور عاجز ہو اور عربی زبان بشمول عربی ادب درجنوں اسلامی علوم و فنون کی تحصیل کے لیے اپنی عمر کی ایک دہائی بسر کرنے والا واجبی تقریر و تحریر کے لیے شرمساری سے دوچار ہو۔

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۸۰

تدریس کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ استاذ مرحوم نصاب میں شامل کتابوں کے حل مطالب پر قناعت نہ کرتے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شامل نصاب کتابیں علامتی طور پر پڑھایا کرتے تھے۔ اصل نگاہ اس پر ہوتی کہ طلباء کے اندر عبارت فہمی کے ساتھ ساتھ عربی زبان لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے ''النادی الادبی'' قائم کر رکھی تھی جس کے دو اہم شعبے تھے۔ شعبہ تقریر اور شعبہ تحریر۔

علاوہ ازیں ان کے اسباق ''اردو میڈیم'' میں نہ ہوتے بلکہ ''عربی میڈیم'' میں ہوتے۔ الفاظ و معانی کی وضاحت عربی میں کرتے۔ کلمات کے معانی عربی میں لکھواتے۔ ان کے استعمال کی مشق عربی میں کراتے۔ انتہا یہ تھی کہ دورانِ درس اگر کسی طالب علم کی کسی حرکت بیجا پر ناراض ہوتے تو ناراض عربی میں ہوتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ایک طالب علم کی بسیار گفتاری پر خفا ہو کر کہنے لگے: انت تجادل دائما

درس گاہ میں مختلف موضوعات پر اپنے سامنے ایک ایک طالب علم کو مکلف کرتے کہ وہ کھڑا ہو کر اور حتی الوسع جملہ آدابِ خطابت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقریر کرے۔ دوسرے شرکائے درس کو پابند بناتے کہ وہ سراپا گوش بن کر تقریر سنیں اور فریضۂ خوردہ گیری و عیب جوئی انجام دیں۔ کبھی دو طالب علموں کو بھری درس گاہ میں کھڑا کرتے کہ وہ کسی موضوع پر گفتگو (محادثہ) کریں۔ جملہ شرکاء درس پر فرضِ عین تھا کہ درس گاہ میں انہیں جو کچھ بھی کہنا ہو عربی میں کہیں۔ اردو شجرِ ممنوعہ تھی۔ اسی کے ساتھ کسی شریکِ درس کو اس کی قطعی اجازت نہ تھی کہ وہ شرافت کے پس پردہ غفلت کشی خاموشی اختیار کئے بیٹھا رہے۔ ہر طالب علم کے لیے عبارت پڑھنا، سوالات کرنا اور اپنے جملہ حواس کو حرکت میں رکھنا ضروری ہوتا۔ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں ازراہِ معذرت ''لا استطیع'' کا استعمال ''اکبر الکبائر'' تھا۔

ان کی درس گاہ کے سامنے عام گزرگاہ تھی۔ دورانِ سبق کسی گزرنے والے پر اُچٹتی نگاہ ڈالنا بھی کمتر از کفر نہ تھا۔ ایسی صورتحال اگر کبھی پیش آتی تو اصلاحِ حال کے لیے بسا اوقات ایسا

کرتے کہ گزرنے والے کو اندرونِ درس گاہ بلا لیتے اور اُن سے کہتے کہ فلاں صاحب آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ براہِ مہربانی تھوڑی دیر یہاں کھڑے ہو جائیں تا کہ وہ آپ کو دیکھ لیں۔

ایک فاضل دارالعلوم دیوبند کے اندر جسے "قارونِ لغت ہائے حجازی" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ رائج الوقت عربی لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے داخل نصاب کتابوں کے علاوہ عربی اخبارات کے اقتباسات اور تراشے تیار کرتے اور انہیں اسباق کی طرح باقاعدہ پڑھاتے۔ طلباء کو اس بات کا مکلّف کرتے کہ وہ حتی الامکان سبق بغیر پڑھائے خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس سال میں نے تکمیل ادب کیا' نہایت خاموشی سے بغور عبارت اور ترجمہ سنتے رہے آخر میں فرمایا سبق ہو گیا۔

عبارت خوانی وغیرہ میں قواعد صرف ونحو پر غیر معمولی زور دیتے' صرف اتنا ہی کافی نہ تھا۔ بلکہ الفاظ کی مخارج سے ادائیگی کے ساتھ ساتھ حتی المقدور عربی لب و لہجے کی نقالی بھی ضروری تھی۔ "النادی الادبی" کی تحریری سرگرمیوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر آئے دن درس گاہ میں اپنے سامنے مضامین لکھواتے۔ درس گاہ میں طلبہ کو عربی خطوط میں "خطِ نسخ" اور خطِ رقاع" کی مشق کراتے۔ خط تو سبھی کا سدھر جاتا۔ بہت سے افراد اپنی ذاتی دلچسپی اور محنت سے باقاعدہ خطاط بن گئے۔

یہ ان کے درس' طریق درس اور درس گاہ کے اہم اجزائے ترکیبی تھے۔ مندرجہ بالا اجزاء میں کوئی جُز اختیاری نہ تھا۔ تمام اجزاء واجبی بلکہ اجباری تھے جس سے سرمو انحراف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی اس جگر سوزی کا نتیجہ یہ تھا کہ جس سال ہم نے تکمیل ادب کیا اس وقت کا تاثر بیس سال گزرنے کے باوجود اب تک لوحِ دماغ پر تازہ ہے۔ درس گاہ سے نکلنے کے باوجود ہم احباب آپس میں باتیں کرتے کہ مولانا کے اسباق سے کتنا زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ہر سبق کے بعد ایسا لگتا ہے کہ آج بہت کچھ حاصل ہوا ہے جو اب سے پہلے حاصل نہ تھا۔ اس وقت اس خاص تاثر میں شدت کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ تکمیل ادب کا سال دورۂ حدیث

سے فراغت کے بعد کا ہوتا ہے۔ اس وقت دورۂ حدیث کی ایک مخصوص نوعیت تھی۔ غالباً اس وقت بھی کم وبیش ویسی ہی نوعیت ہوگی جس میں سال کا بیشتر حصہ چند فقہی مسائل کی طوفانی بحثوں میں صرف ہوجاتا ہے۔ کتابوں کے بیشتر حصے کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے کہ انتہائی دقیقہ سنجی اور موشگافی کی عادت طبیعتیں اتنی رواں دواں ہوجاتی ہیں کہ تبرکاً قرأت احادیث پر قناعت کر لیتی ہیں اور کتب احادیث کے جملہ ابواب تک کا پتہ نہیں چلتا۔ ایسی صورتحال میں درس گاہ کی افادیت کا احساس عقیدۃً تو ہوسکتا ہے حقیقۃً نہیں۔

ایک تعلیمی سال کی مدت تقریباً آٹھ ماہ سے زائد نہیں ہوتی۔ زبان وادب کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ کوئی زبان سیکھنے کے لیے یہ مدت مضحکہ خیز ہے۔ لیکن استاذ مرحوم اپنی خداداد صلاحیت وجگر سوزی سے اس مختصر مدت میں طلبہ کے اندر عموماً اتنی صلاحیت پیدا کردیتے کہ انہیں اخذ وتعبیر کا سلیقہ آجاتا اور عربی زبان کی زمام کار ان کے ہاتھ میں آجاتی کہ آئندہ وہ اپنے عزم وہمت کے بقدر جتنی مسافت طے کرنا چاہیں طے کرسکیں۔ چنانچہ اُن کے تلامذہ میں بے شمار افراد ایسے ہیں جنہوں نے اپنے ذوق اور جدوجہد کے ذریعے اس میدان میں دست گاہ حاصل کی۔ استاذ مرحوم کی تدریس وتعلیم کی خاکہ نگاری بالکل ادھوری اور نامکمل رہے گی اگر اس میں ان کی مخصوص تربیت اور منفرد ذہن سازی کا تذکرہ نہ ہو۔ تعلیم اور تربیت کا ذکر ایک ساتھ اس لیے ضروری ہے کہ ان کی تدریس کا تربیت سے قطع نظر کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کے جسد تدریس میں روح تربیت اس طرح سرایت کئے ہوئے تھی جیسے برگِ گل میں بوئے گل۔

ان کی ذات سے وابستہ جس تاریخ سازی، ذہن سازی، افراد سازی اور مردم سازی کا غلغلہ ہے۔ اس کے لیے تدریس اور درس گاہ سے علیحدہ کوئی تربیت گاہ اور تربیتی پروگرام نہیں تھا۔ درس گاہ ہی تربیت گاہ تھی اور تدریس ہی تربیت۔ یہ فیصلہ کرنا ہم خوشہ چینوں کے لیے بھی سخت مشکل ہے کہ وہ مدرس زیادہ اچھے تھے یا مربی۔ غالباً یہ بات زیادہ قرین صواب ہوگی کہ وہ

بے نظیر مدرس اور بے مثال مربی تھے۔ وہاں تعلیم و تربیت لازم و ملزوم تھے اور دونوں کو یکساں اہمیت حاصل تھی۔ اسباق حیات کی تدریس پر وہ اس سے کم توجہ اور توانائی صرف نہیں کرتے تھے جتنی ابواب عربی ادب پر کرتے تھے [1]۔

مولانا کے طرزِ تدریس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ان کے دوست اور ایک بلند پایہ استاد پروفیسر بدرالدین سابق صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونی ورسٹی کے انٹرویو کے یہ اقتباسات بے حد اہم ہیں۔ اور درج کئے جارہے ہیں:

سوال:- مولانا! میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کے طلباء میں عربی تقریر و تحریر کی صلاحیت کیسے پیدا ہوئی؟ آخر عربی مدارس میں تو برسہا برس سے تعلیم ہوتی آرہی ہے مگر بولنے لکھنے کی صلاحیت شاید ہی کہیں کسی میں پیدا ہوئی ہو جبکہ یہاں سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ عربی کا ماحول نہیں اور گفتگو پر قدرت حاصل کرنے کیلئے ماحول نہایت ضروری ہے۔

جواب:- جی ہاں آپ کا فرمانا صحیح ہے۔ عربی تقریر و تحریر کے لیے ماحول بہت ضروری ہے مگر محترم ماحول خود نہیں بنتا' بنایا جاتا ہے کہ اس کے لیے ابتدا میں کوشش اور محنت کرنی پڑتی ہے پھر ماحول خود دعوت دیتا ہے کہ مجھ سے فائدہ اٹھاؤ۔

ماحول بنانے کے لیے میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں پختگی سے عمل کرتا ہوں مثلاً میں ادب کی تمام کتابیں چاہے مقامات ہو یا متنبی' حماسہ ہو یا سبعہ معلقہ سب عربی میں پڑھاتا ہوں۔ مشکل الفاظ کی تشریح اشعار کے مفہوم کی وضاحت سب عربی میں کرتا ہوں' پھر یہ نہیں کہ میں خود عربی کی دھواں دھار تقریر کر کے فارغ ہو جاؤں۔ طلباء کو کچھ آئے یا نہ آئے بلکہ خود طلباء سے اشعار کی تشریح و توضیح عربی میں کراتا ہوں' زبانی سنتا ہوں' کاپی پر لکھواتا ہوں' ابتداء میں ہر کام مشکل ہوتا ہے مگر جوں جوں الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے' مشکل حل ہوتی جاتی ہے' صلاحیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

---

[1] مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

درجہ میں اس کا التزام ہے کہ کوئی طالب علم اردو میں نہ بولے، خارج اوقات میں روز مرہ کی زبان بھی عربی ہو، شام کو طلباء ٹہلنے جائیں تو عربی میں بات کریں۔

جدید عربی ادب کی کتاب کا جو سبق جس دن پڑھا جائے اس کی نئی تعبیرات اور اصطلاحات لکھ کر ذہن نشین کر لی جائیں، پھر ان اصطلاحات کو گفتگو میں استعمال کیا جائے۔ جب ایک سبق پر اتنا کام ہوگا تو یقیناً وہ محفوظ ہو جائے گا۔[1] مولانا مرحوم نے جدید عربی کی ایسی ہوا چلائی کہ دیوبند سے عربی جریدہ شائع ہونے لگا اور طلبہ کے عربی زبان میں دیواری جریدے کئی کئی نکلنے لگے، عربی میں تقریر وتحریر کا عام رواج ہو گیا اور دیگر مدارس میں بھی جدید عربی پر خصوصی توجہ دی جانے لگی، آج دیوبند اور دیگر قدیم طرز کے عربی مدارس میں جو ایک اچھی خاصی تعداد عربی لکھنے اور بولنے والوں کی پائی جاتی ہے "یہ سب پودا ان ہی کی لگائی ہوئی ہے"۔ ان میں سے بہت سے عرب ممالک میں اونچی پوسٹوں میں اور عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عمومی تصور یہ ہے کہ استاد کا کام لیکچر دینا ہے اور پھر اپنے گھر سدھارنا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ استاد وہی ہے جو شاگرد کے ہر رُخ کو متاثر کرے اس سلسلہ میں یہ بیان ملاحظہ ہو:

"حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی میں زبان کی فصاحت کے ساتھ مزاج کی نفاست بھی بہت زیادہ تھی، اُن کے جسم کے کپڑے سے لے کر ذاتی رہائش گاہ تک ہر چیز سے سلیقہ اور قرینہ ظاہر ہوتا تھا جو طلبہ کے لیے ایک مستقل درس اور تربیتی کورس کی حیثیت رکھتا تھا۔ ادنیٰ درجہ کی بدنظمی اور بدسلیقگی بھی مولانا کے مزاج پر سخت گراں ہوا کرتی تھی۔ پھر مولانا کی جس طرح زبان نہایت شستہ تھی اسی طرح اُن کا خط بھی نہایت پاکیزہ اور نفیس تھا اور عربی کی خطاطی میں بھی اُن کی استادی مسلم تھی، مولانا کے حسنِ ذوق، حسن تکلم اور نفاستِ طبع سے مولانا کے تمام بھائیوں اور مولانا کی اولاد کو بھی حصہ وافر ملا ہے اور سبھی باصلاحیت اور باسلیقہ ہیں اور مولانا کی تربیت کا رنگ ان سبھوں پر نمایاں ہے۔"[2]

1۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

2۔ ترجمان دار العلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ۱۷۵

یہی وہ رخ ہے جو تمام طالب علموں کو ایک اعلیٰ ترین اخلاقی سانچے میں ڈھال دیتا ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی صفت اگر واقعی شخصیت کا جزو ہے تو اُسے ہر جگہ اور ہر میدان میں نمایاں ہونی چاہیے۔ مجموعی اعتبار سے تدریسی شخصیت کے جتنے گوشے تھے اُن سب پر ان کے شاگردوں نے روشنی ڈالی ہے جسے حتی الامکان تکرار سے بچتے ہوئے پیش کیا گیا ہے موضوع پر عبور زبردست قوتِ اظہار ذہنی تربیت اور زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے نقطہ سے شخصیت کی تصویر بنانا۔ کردار سازی اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو خلوص سے عمل میں لاتے ہوئے "رجال سازی" کا فریضہ انجام دینا...... ان تمام نکات کی تشریح و توضیح ان کے شاگردوں کے بیانات میں ملتی ہیں اور یہ وہ شاگرد ہیں جو آج کے اکابرین فضلائے دیوبند شمار ہوتے ہیں۔

دورِ حاضر میں تدریس کے ساتھ تنظیم کو ضروری قرار دیا ہے اور ایک اچھے اور اعلیٰ مدرس کے اندر تنظیمی صلاحیتوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن بات اگر صرف تنظیمی صلاحیت تک رہتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا ستم یہ ہے کہ تنظیم کو "انتظام" (Administration) سے مربوط کر دیا جاتا ہے اور ایک منزل وہ آتی ہے جب مدرس معلمی اور مدرسی کے بجائے منتظم ہو کر رہ جاتا ہے اور یہیں سے رفقائے کار سے اور طلاب سے تصادم کی صورت پیش آتی ہے۔

آئندہ باب میں مولانا کی شخصیت کا وہ رخ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق انتظام سے ہے اور جس نے آٹھویں دہائی میں ایسے منافشات پیدا کئے جس نے نہ صرف حضرت مولانا کی شخصیت کو مجروح کیا بلکہ طالب علموں کا نقصان ہوا۔ علمی دنیا بھی بہت سارے فیوض و برکات سے محروم ہوئی اور ان سب کے ساتھ دارالعلوم کی شخصیت بھی متاثر ہوئی۔

لیکن ایمان داری کا تقاضا ہے کہ سیرت نگاری کے اصولوں کے تحت ان گوشوں کی بھی نشاندہی کی جائے چنانچہ آئندہ صفحات میں تنظیم و انتظام کے ربط اور تدریس اور انتظامیہ کے آہنگ پر گفتگو کی جائے گی۔

❁❁❁❁❁❁

باب چہارم

مولانا وحید الزماں کیرانوی بحیثیت منتظم

مولانا وحید الزماں کیرانوی بحیثیت منتظم

مغربی فلسفہ کے زیر اثر جو نظام تعلیم وجود میں آیا تھا اس سے مشرقی اندازِ فکر نے لاکھ کنارہ کشی کی کوشش کی مگر

”بچا نہ گرد سے دامن بہت بچا کے چلے“

انجام کار یہ ہوا کہ مشرقی مدارس میں بھی صرف نام بدل گئے لیکن کرسی نہیں بدلی یہ درست ہے کہ مغرب میں رجسٹرار اور اس کے ماتحت کلرکی نظام میں اساتذہ ملوث نہ تھے لیکن ڈین (Dean) کو پورے فیکلٹی (Faculty) کا نظام دیکھنا پڑتا تھا اس نظام میں طلباء کے مسائل اور اساتذہ کے مسائل دونوں شامل تھے طلباء کو اگر کوئی وظیفہ ملتا تھا یا اگر کسی شعبہ کے لیے کوئی گرانٹ (Grant) آتی تھی تو وہ ذمہ داری بھی ڈین (Dean) کی تھی کلاسیں پڑھانے کے لیے اساتذہ کو Period کی تقسیم بھی ڈین کی ذمہ داری تھی اور جہاں اساتذہ کے درمیان شخصی اختلافات ہوتے تھے اسے بھی ڈین کو سلجھانا پڑتا تھا پھر ڈین کا اپنا عملہ ہوتا تھا ان کو بھی دیکھنا اور ان کی کارکردگی پر نظر رکھنا ڈین کی ذمہ داری تھی اور اگر کوئی فنکشن (Function) سمینار کانفرنس متعلقہ Subject کی طرف سے ہوئی تو وہ بھی ڈین کی ذمہ داری تھی چھوٹی سطح پر صدور شعبہ بھی اسی طرح کی انتظامی ذمہ داریوں سے دو چار رہتے ہیں۔

یہاں اس فرق کی وضاحت ضروری ہے کہ انتظامی امور تنظیمی امور میں فرق ہوتا ہے اور تنظیمی امور میں زیادہ تر وقتی ذمہ داری رہتی ہے مثلاً طلباء کی یونین (Union) کا جلسہ ہے جلسہ

ختم ہوا ذمہ داری ختم ہوگئی لیکن انتظامی امور کا سلسلہ اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک مدرس تدریس سے وابستہ ہے۔

تنظیمی امور میں مدرس کو رفقاء کار اور طالب علموں کے جذبات سے خود کو ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں اس موضوع سے ہوتا ہے جس کا وہ مدرس ہے یعنی اسے اساتذہ کی کانفرنس کرنی ہے تو وہی اساتذہ آئیں گے جو اس موضوع سے متعلق ہیں ان ہی طلباء سے بھی سابقہ پڑے گا حاضرین اور ناظرین بھی اسی موضوع کے افراد ہوں گے لیکن انتظامی امور میں بالکل غیر متعلق لوگ ہو سکتے ہیں انہیں Executive council (ایگزیکیٹیو کونسل) میں جواب دہی کرنی پڑ سکتی ہے۔ کبھی کبھی Audit آڈٹ کے تیز و تند تیروں کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور اکثر تو عوام کے سامنے بھی جواب دہی کرنی پڑ سکتی ہے اور جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے ان میں سے بیشتر اس کے موضوع سے متعلق نہیں ہوتے۔

یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ تنظیمی امور کسی نہ کسی شکل میں انتظامی امور کے تابع ہوتے ہیں اور ٹھیٹھ زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناظم کو ہر لحہ منتظم کا پابند رہنا پڑتا ہے اس لیے کہ شعبۂ مالیات منتظم کے پاس ہی ہوتا ہے۔

مشرقی طرزِ تعلیم میں بھی بالکل وہی صورت نظر آتی ہے جو مغربی طرزِ تعلیم میں ہے اس وقت کے مدارس میں مقیم مجلس شوریٰ شیخ وغیرہ کے الفاظ سے جگہ سنبھال لی ہے۔

کیمپ دارالعلوم کا قیام:

مولانا وحید الزماں کیرانوی غیر معمولی تنظیمی صلاحیتیں رکھتے تھے ان کی تنظیمی صلاحیتیں جن مواقع پر بروئے کار آئی اس کی طرف صرف اشارہ کیے جا رہے ہیں ان میں ''دارالفکر'' کا قیام النادی الادبی کی سرگرمیاں اور کیمپ قابل ذکر ہیں۔

کیمپ چلانا بہت مشکل کام تھا کیمپ کی پوری داستان اپنے پس منظر کے ساتھ تلخیوں

اور اختلافات سے وابستہ رہی ہے۔ظاہر ہے کہ کیمپ کا قیام ہی مختلف قصہ تھا راقمۃ الحروف کے لیے یہ بہت دشوار ہے کہ اس سلسلے میں وہ کوئی مثبت محاکمہ کر سکے اور یوں بھی یہ قصہ اب ختم ہو چکا ہے اور اس کی طرف جتنے بھی اشارے کئے جائیں گے وہ تکلیف دہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ مولینا کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور اس کے ہمہ جہتی رخ پر روشنی ڈالنے کے لیے ''کیمپ'' کے قیام پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔جن حالات کے تحت کیمپ کا قیام عمل میں آیا تھا ان حالات سے صرف نظر کرتے ہوئے حضرت مولینا خلیل امینی کے الفاظ نقل کئے جارہے ہیں یہ اقتباس طویل ہے مگر مجبوری ہے اور راقمۃ الحروف نے اس کی کوشش کی ہے کہ اختلافی پہلو سے بالکل گریز کیا جائے اور ماضی کے وہ واقعات جس طرح پیش آئے تھے اس طرح انہیں سامنے لایا جائے۔وہ کوہ کن کی بات میں مولینا تحریر کرتے ہیں ''کیمپ دارالعلوم میں اس وقت کے رکارڈ کے اعتبار سے ۱۸۰۸ طلبہ تھے اب اتنی بڑی تعداد کے شام کے کھانے کا مسئلہ تھا مولینا نے دیوبند کے مختلف محلوں میں جا کر لوگوں سے اپیل کی کہ وہ طلبہ کے لیے اپنے گھروں کا کھانا فوری طور پر پہونچا دیں اور اپنے بچوں کے لیے دوسرا کھانا پکالیں عشاء تک اتنا کھانا آگیا کہ سب طلبہ کے لیے کافی ہوگیا۔

کیمپ چلانا آسان نہ تھا اتنے سارے طلبہ کی رہائش اور جاڑے میں ان کیلئے اوڑھنے بچھانے کا سامان، خورد نوش کا انتظام، تعلیم کا نظم، طلبہ کو لمبے عرصے تک مطمئن رکھنا۔دوسری طرف پولیس اور سرکاری انتظامیہ سے نمٹنا، جو کیمپ کو کسی بھی لمحے ختم کر دینے کے درپے تھا۔پھر غلہ اور پیسوں کا اکٹھا کرنا۔مولاناؒ نے یہ سارا کام جس حسن وخوبی سے انجام دیا، اگر اس طرح انجام نہ دیا جاتا، تو نہ کیمپ چلتا نہ دارالعلوم کے آج وہ دن ہوتے، جو آج ہیں کیمپ کے قیام کے تیسرے ہی دن نقشہ اسباق بنا اور اساتذہ کو کتابیں تقسیم کر دی گئیں اور باقاعدہ کیمپ چل پڑا۔مولانا نے ان سارے مسائل کا ایک بے باک اور جری قائد کی حیثیت سے مقابلہ کیا، جو کیمپ کے زمانے میں پیش آئے۔اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تھک ہار کے بیٹھ جاتا[1]

---

[1] وہ کوہ کن کی بات۔مولانا خلیل امینی

اس پر مزید روشنی مولانا مزمل الحق قاسمی یوں ڈالتے ہیں:

وہ کیمپ کے پیچ در پیچ اندرونی و بیرونی مسائل کو حل کرتے' مقدمات سے نمٹتے' پولیس والوں سے نبرد آزما ہوتے' پریس والوں کو مطمئن کرتے' باہر سے بڑی تعداد میں آنے والے مہمانوں کا استقبال کرتے اور ان کو صحیح صورتِ حال سے مؤثر انداز میں آگاہ کرتے' شہر والوں سے رابطہ اور ان کو کیمپ کے ساتھ پیہم تعاون پر آمادہ رکھتے' کیمپ کے لیے شہر اور شہر کے باہر سے مالیات و اشیائے ضروریہ کی فراہمی کرتے' نکتہ چینوں اور بدخواہوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی افواہوں کے جوابات دیتے۔ گوناگوں مسائل اور مصائب کے اس ہجوم میں اور کیمپ کے حاسدوں اور دشمنوں کی کڑی نگاہ اور ریشہ دوانیوں کے باوجود' کیمپ کے پانچ ماہ کے طویل عرصے میں (جو ۳۰/ اکتوبر ۱۹۸۱ء کی شام سے ۲۳/ مارچ ۱۹۸۲ء کی رات تک کو تھا) کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں گزرا' جس سے لوگوں کو کسی بدنظمی یا بدمزہ احساس ہوا ہو۔ کیمپ کے سیکڑوں طلبہ' اساتذہ' کارکنان اور ہزار' معاونین' مولاناؒ کی وجہ سے ایک متحد الخیال خاندان نظر آتے' جو کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہو۔ مولاناؒ کیمپ کی جزئیات اور تفصیلات سے ہر وقت آگاہ رہتے' ہر روز دفتر کے کارگزاروں کی رپورٹیں سماعت فرماتے اور آئندہ کے لیے ہدایات دیتے' خاص طور سے حساب وکتاب پر گہری نظر رکھتے' ہر ہفتے اور ہر ماہ آمد و صرف کے واضح گوشوارے مرتب کرواتے۔[1]

۲۳/ مارچ ۱۹۸۲ء (۲۵/ جمادی الاخری ۱۴۰۲ھ) کی شب میں سابقہ منصوبہ بندی کے تحت ۲ بج کر ۲۰ منٹ پر' طلبہ کیمپ سے دارالعلوم میں در آئے۔ مولاناؒ شکر کے مرض کی شدت کی وجہ سے دو تین روز قبل سے جیون نرسنگ ہوم دہلی میں زیر علاج تھے۔ ۲۴/ مارچ کو دارالعلوم' کیمپ سے اندرون دارالعلوم آگیا۔ ۲۷/ مارچ کو باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ اسی روز ایک جلسہ ہوا' جس میں اساتذہ نے تقریریں کیں اور استاذ الاساتذہ مولانا معراج الحق نے فرمایا کہ مولانا وحید الزماں کے بغیر آج دارالعلوم ایسا لگ رہا ہے' جیسے جسم بغیر روح کے' ان

---

[1] مولانا مزمل الحق قاسمی سینی: "کیمپ دارالعلوم" ترجمان دارالعلوم

کی صحت کے لیے دعا کیجئے۔ طلبہ نے زار و قطار رو رو کے دعا کی۔ یکم اپریل ۱۹۸۲ء (۲/ رجب ۱۴۰۲ھ) کو مولانا دہلی سے تشریف لائے۔ باب الظاہر سے داخل ہوئے طلبہ کا ہجوم استقبال کے لیے ٹوٹ پڑا، پھولوں کی بارش کی گئی اور "مولانا وحید الزماں، زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

دارالعلوم کے باقاعدہ دوبارہ محو سفر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد آپ کو ناظم مجلس تعلیمی کا عہدہ تفویض ہوا اور حسب توقع آپ نے اس شعبے کو انتہائی سرگرم و فعال بنا دیا۔

پھر مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۲۵۔ ۲۷/ صفر ۱۴۰۵ھ میں آپ کو ان الفاظ کے ساتھ معاون مہتمم کے منصب پر فائز کیا:

> "رپورٹ اہتمام کے ضمن میں، دفتر اہتمام کی کارکردگی اور اس میں پائے جانے والے اضمحلال کے تدارک کا معاملہ زیر غور آیا۔ دارالعلوم کے وسیع شعبہ جات اور ان کاموں کے پھیلاؤ کے پیش نظر جب کہ ہر دو نائب مہتمم صاحبان، علالت اور ضعف و اضمحلال سے دوچار ہیں، مجلس شوریٰ ضرورت محسوس کرتے ہوئے معاون مہتمم کے منصب کی منظوری دیتی ہے اور اس منصب کے لیے، موجودہ وقت میں قوت کارکردگی اور انتظامی صلاحیت کی بنیاد پر، مولانا وحید الزماں صاحب کا تقرر عمل میں لاتی ہے[1]۔"

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان دنوں شدید علیل تھے؛ اس لیے وہ خود اور ان کے اہل خانہ اور محبین، معاون مہتمم کے اس منصب گراں کو قبول کرنے سے متردد تھے لیکن حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب حضرت کے گھر پر تشریف لے گئے اور مجلس شوریٰ کے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ مولانا نے معذرت کرنی چاہی، تو حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے فرمایا "دارالعلوم کا کباڑا ہو گیا ہے آپ اللہ کا نام لے کر اٹھیے اور دارالعلوم کی خدمت کیجئے ان شاء اللہ شفا ہو گی"۔ یہ جملہ سنتے ہی دارالعلوم کے اس عاشق نے، جو لحاف اوڑھ کے لیٹا ہوا تھا، لحاف اتار پھینکا اور دونوں

---

[1] مولانا مزمل الحق قاسمی حسینی: "کیمپ دارالعلوم" ترجمان دارالعلوم

مخدومان گرامی سے فرمایا کہ:

"اگر یہ بات ہے تو میں جس حال میں بھی ہوں تیار ہوں۔" چنانچہ اگلے روز سے دارالعلوم آنا شروع کر دیا اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے تمام دفاتر وشعبہ جات دارالعلوم کو ان الفاظ میں اطلاع فرمائی: "حسبِ تجویز اجلاس مجلس شوریٰ مؤرخہ ۲۵۔۲۷/صفر ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۰۔۲۲/نومبر ۱۹۸۴ء"

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب نے اپنے عہدے: "معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند" پر فائز ہو کر آج مؤرخہ ۷/ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق یکم دسمبر ۱۹۸۴ء سے کارہائے مفوضہ کی انجام دہی شروع کر دی ہے شعبہ جات متعلقہ کو بہ غرض اطلاع وضروری کارروائی ارسال ہے"۔

مولاناؒ نے حسبِ توقع اپنی لیاقت اور انتظامی صلاحیت سے تھوڑے ہی دنوں میں اہتمام اور ساتھ ہی تعلیمات...... کہ وہ اس وقت تعلیمات کی مجلس تعلیمی کے بھی ناظم تھے...... کی تمام کارروائیوں میں استحکام اور تیزی پیدا کر دی بہت سی اصلاحات کیں بہت سی رکاوٹیں دور کیں کام کی رفتار کی راہ میں آنے والے مسائل کو آسانی سے حل کر دیا۔ دارالعلوم کے فراشوں کے لیے "دفتر دار" کا خوب صورت نام وضع کیا۔ سند کے حصول میں فضلائے دارالعلوم کو جو تقریباً ایک ماہ لگانا پڑتا تھا اب صرف ایک ہفتے میں ملنے لگی۔ اساتذہ دارالعلوم کو تنخواہ لینے کے لیے دفتر محاسبی جانا پڑتا اور کبھی کبھی لائن میں بھی بیٹھنا پڑتا تھا آپ نے ان کی تنخواہ کی وصول یابی کا ایک نیا نظام قائم کیا اور دفتر تعلیمات میں لفافوں میں بند کر کے دیے جانے اور لفافوں پر تمام وضعات کے درج کیے جانے کا طریقہ رائج کیا جب کہ علیا کے اساتذہ کو تنخواہیں ان کے کمروں یا ان کے مکانات پر پہنچانے کا نظم فرمایا۔ اس کے علاوہ قلیل مدت میں بہت سی کارآمد تعمیرات کیں[1]

---

[1] اس دور کی مولانا کی تعمیر کردہ عمارتوں کو اجمالاً جاننے کے لیے پڑھیے کتاب کا عنوان "دارالعلوم کے نئے دور میں مولاناؒ کے تابندہ کارنامے"۔

اور ان کے لیے از خود مالیہ کی فراہمی کے لیے دورے کیے۔ ’’آئینہ دار العلوم‘‘ کے نام سے ایک پندرہ روزے کا اجرا فرمایا جو کچھ دنوں پیام ’’دار العلوم‘‘ کے نام سے نکلتا رہا۔ پھر ہر کام کو اپنے وقت پر کرنے کا دفتری عملے کو خوگر بنایا اور روزانہ کے کاغذات پر روز کے روز عمل درآمد کی روش کو مستحکم کیا۔ مولانا نے اس سلسلے میں شب و روز اتنی محنت کی کہ ایک دفعہ مولانا معراج الحق صاحبؒ نے غایت شفقت سے آپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ’’اتنی محنت نہ کیجئے‘‘ دار العلوم کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے‘‘۔ ممبران شوریٰ نے تحریری اور زبانی طور پر آپ کی خدمات کو سراہا۔ اس طویل اقتباس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت مولینا مستعد اور چست و چاق چوبند انتظامیہ کے قائل تھے، اور روز کا روز کام نپٹا دیتے تھے، اس سے پہلے جن حالات سے وہ دو چار ہوئے تھے وہ حالات نہایت ہی روح فرسا تھے۔ ایک نہایت ہی محترم شخصیت سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا اور یہ اختلاف اس حد تک پہونچا کہ لگ بھگ ۲۰۰۰ طلبہ نے ہڑتال کی۔ ان کے جذبات کو برافروختہ ہونے سے بچانے کے لیے اور مزید اشتعال انگیزی کو روکنے کے لیے اور انحراف پسند قوتوں کو تعمیری سمت دینے کے لیے کیمپ دار العلوم کا قیام ناگزیر تھا۔ ...... مولینا زبیر احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ:

’’مولینا کی خدمات کا دور علمی اور انتظامی دونوں اعتبار سے زریں عہد کہلائے جانے کا مستحق ہے‘‘ اس طرح مولینا کی علمیت کے ساتھ ان کی انتظامی صلاحیت کا تقریباً سب نے اعتراف کیا ہے یہ انتظامی صلاحیت کیمپ دار العلوم کا قیام اور اس کا انتظام و انصرام تھا وہ بقول مولینا محمد رفیق بستوی ’’دار العلوم کے بیتاج بادشاہ تھے‘‘ ان کا بحیثیت منتظم سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے دورہ انتظام و انصرام میں کسی کو بھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ دار العلوم طلبہ سے عبارت ہوتا ہے اگر طالب علم مطمئن نہیں اور اگر اسے درس حال کرنے کے لیے موقع نہیں مل رہا ہے تو یہ بھی انتظامی خرابی ہے اور اگر انتظامیہ کے افراد و اہلکار مطمئن نہیں تو یہ بھی انتظامیہ کی خرابی ہے‘‘۔[1]

---

[1] مولانا مزمل الحق قاسمی حسینی: ’’کیمپ دار العلوم‘‘ ترجمان دار العلوم

مولینا جتنے دنوں اہتمام سے وابستہ رہے اور معاون مہتمم رہے اتنے دنوں تک سارا کام بڑی لگن سے کرتے ہی رہے لوگ ان سے مطمئن تھے ان کی محرور الخراجی کی شکایت انتظامیہ میں مفاد پرست عناصر کی ریشہ دوانیوں کی رہین منت زیادہ تھی اس میں مولینا کے نقص انتظام کو کم دخل تھا۔

کیمپ دارالعلوم کے سلسلے میں مختلف لوگوں نے اسباب وعلل پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے اپنے زاویہ نظر سے واقعات کا تجزیہ کیا ہے مولینا محمد افضال الحق جوہر قاسمی بڑی تفصیل کے ساتھ پس منظر کو بھی پیش کیا ہے اور اپنے زاویہ نظر کے مطابق اس حادثہ کی ذمہ داری کس کے سر ڈالی جائے وہ بھی بین السطور میں دیکھی جا سکتی ہے اور کہیں کہیں براہ راست کچھ افراد کو ذمہ دار قرار دیا ہے لیکن راقمۃ الحروف ان واقعات سے دامن بچا کر نکلتے ہوئے صرف ان گوشوں پر روشنی ڈال رہی ہے جس کا تعلق حضرت مولینا کے حسن انتظام سے ہے۔

اس سلسلے میں مولینا افضال الحق لکھتے ہیں:

"دارالعلوم کھلنے کے بعد مولینا وحید الزماں صاحب نے دفتر اہتمام میں بیٹھ کر طلبہ کے قیام وغیرہ کا انتظام کیا۔ مطبخ کے ملازمین کو اشرف صاحب کی نگرانی میں متحرک کر دیا کتابیں تقسیم کروائیں اور اسباق کا انتظام کیا تنخواہیں اور فرائض مقرر کر کے دارالعلوم کا نظام باضابطہ بحال کر دیا اور جب مولینا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم نے مجلس شوریٰ بلائی تو اس میں سب اراکین محترم کے سامنے مولینا وحید الزماں نے پورے کیمپ کو مجلس شوریٰ کی سپردگی میں دے دیا مجلس شوریٰ نے مولینا کے مقرر کردہ ملازمین اور مدرسین کو پھر سے انٹرویو لے کر ان کی جگہوں پر مستقل کر دیا" [1]

یہ بڑے بڑے چھوٹے نقطے میں جن سے مولینا کے حسن انتظام پر روشنی پڑتی ہے انتظام کے معنی ہی یہ ہیں کہ منتظم اصولوں سے انحراف نہ کرے اور سب کو مطمئن بھی رکھے یہی طریقہ کار حضرت مولینا نے اختیار کیا ۲۴ / مارچ ۱۹۸۲ء کو دارالعلوم میں کیمپ سے لوگ آ گئے

[1] مولانا مزمل الحق قاسمی حسینی: "کیمپ دارالعلوم" ترجمان دارالعلوم

اور حضرت مولینا مرغوب الرحمن نے مہتمم کی ذمہ داری سنبھال لی مجلس شوریٰ نے طلبہ کی یونین کی اجازت دے دی حافظ محمد عثمان اس کے صدر مقرر ہوئے افضال الحق قاسمی لکھتے ہیں کہ:

"ان لوگوں نے جوش جوانی اور جوش فتح میں الھڑپن سے بعض کام کر کے دارالعلوم کو پریشانی میں ڈالدیا...... یہ مولینا وحید الزماں کا دل گردہ تھا کہ صدر جمعیۃ الطلبہ کو بلا کر سخت سے سخت تنبیہ کی اس وقت مولینا کے سامنے، نہ حافظ عثمان تھے نہ جمعیۃ الطلبہ تھی اگر تھا تو صرف دارالعلوم تھا اور اس کی آبرو تھی"[1]

آگے چل کر مولینا کے حسن انتظام پر افضال الحق قاسمی صاحب نے ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اسے من وعن پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۹۸۳ء آیا تو مولانا وحید الزماں صاحب ناظم تعلیمات بنا دیئے گئے۔ انہوں نے طلباء اساتذہ اور ملازمین کی اتنی سخت نگرانی کی کہ درس گاہیں طلباء سے اور اسباق سے آباد ہوگئیں، اور اگر کسی مدرس نے ۱۵ منٹ سے زیادہ تاخیر کی تو رجسٹر اٹھوالیا گیا۔ طلباء کی چھٹی کر دی گئی اور مدرس کو غیر حاضر مان لیا گیا۔ پھر انہوں نے افریقہ، انگلستان اور مصر کا سفر کیا اور وہ بہت کامیاب رہا مگر اس کی کامیابی بعض نگاہوں کو کھٹکنے بھی لگی۔

۱۹۸۵ء آیا تو مجلس شوریٰ نے مولانا وحید الزماں کو مددگار مہتمم کا عہدہ دے کر اہتمام کی ذمہ داریاں دے دیں۔ مولانا اہتمام میں آئے تو انہوں نے روز کا کام روزانہ نمٹا کر اور ہر کاغذ پر حکم اور جواب لکھ کر دفتر کو متحرک کر دیا۔ کسی کلرک، کسی دفتر یا کسی انچارج کی مجال نہیں رہ گئی کہ وہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں اگر مگر کر سکتا۔ انہوں نے عملی طور سے بتا دیا کہ مولانا نصیر احمد خاں کی نرمی، مولانا مرغوب الرحمن صاحب کی مروت اور مولانا محمد عثمان صاحب کی لاپروائی نہیں وحید الزماں کا حکم ہے اور اس کی تعمیل نہ ہونا اپنی ملازمت سے کھیلنا ہے، اس لیے پورا دفتر چاق و چوبند ہوگیا، ہر دفتر کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا۔ ہر شخص کی ذمہ داریاں اسے

---

[1] ترجمان دارالعلوم صفحہ ۳۷۹

بتا دی گئیں۔ میں ایک دفعہ ان کو دیکھنے دفتر اہتمام میں گیا تو بیٹھے درخواستیں لے رہے تھے' لائن میں لوگ بیٹھے تھے' قلم تیزی سے چل رہا تھا' کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا تو سلام دعا ہوئی' بہت شرمندہ سے ہوئے مگر میں نے معاون مہتمم کو مبارکباد دی کہ کام اسی طرح ہوگا۔[1]

معاون مہتمم بننے کے بعد انہیں بے تکے راستے سے دفتر اہتمام میں جانا گراں گذرا تو سامنے سے سیڑھیاں کھڑی کر کے راستہ بھی شاندار کر دیا۔ دفتر محاسبی میں پھاٹک لگا کر صاف ستھرا راستہ مہیا کر دیا۔ حالانکہ تعمیرات کا کام حافظ مولانا طیب صاحب کے دور اہتمام سے ہی مولانا وحید الزماں نے شروع کر دیا تھا اس سلسلہ کی کچھ تفاصیل مولانا محمد معروف قاسمی کے مضمون سے پیش کی جارہی ہیں تاکہ تعمیر و تزئین کے سلسلہ میں حضرت مولانا وحید الزماں کی عبقریت کا اندازہ لگایا جاسکے اس طرح دارالعلوم کی عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آپ سہارنپور والی سڑک سے گذریں تو دائیں طرف کا شاندار پھاٹک آپ کو بتادے گا کہ دارالعلوم آگیا' باادب' یا باتمیز ہو کر اتر جائیے' چونکہ تعمیری کام نئے انداز کے تھے اسلیے انہوں نے الگ سے اس کیلئے چندہ کیا اور نئی عمارتوں کیلئے ۴۱ لاکھ روپے جمع کر کے لگا دیئے۔[2]

انتظامی امور میں مولینا کی مہارت کا اندازہ ان تعمیرات سے لگایا جاسکتا ہے جو مولینا کی انجینیرنگ کی مہارت فن تعمیر سے دلچسپی اور عمارتوں کی تزئین و آرائش سے وابستگی کا شاندار نمونہ ہے اصل میں ان کی صحیح مہارت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۰ء سے قبل دارالعلوم کی اندرونی اور بیرونی صورت حال کا پورا نقشہ کسی کے سامنے رہا ہو ذہن میں محفوظ ہو اور پھر بعد میں جس طرح حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب کی خواہشات کی تکمیل کے سلسلے میں مولینا وحید الزماں نے تعمیر نو اور تزئین کا فریضہ انجام دیا ہے وہ بھی پیش نظر رہے تب صحیح معنوں میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے تصنیف کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقمۃ الحروف نے تصویریں دیں ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ان سے اس فرق کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا جو کہ قدیم اور جدید میں ہوا ہے۔

---

[1] ترجمان دارالعلوم صفحہ ۳۷۹ [2] وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۲۲۹

تعمیر نو اور تزئین کا عمل جن مراحل سے گذرا ہے اس میں جناب ڈاکٹر محمد معروف قاسمی نے ان کے تعمیری کاموں پر روشنی ڈالی ہے مولینا معروف پندرہ سال تک مولینا وحید الزماں صاحب کے ساتھ رہے اور انہوں نے ایک طویل مضمون میں مولینا وحید الزماں کی تعمیرات پر روشنی ڈالی ہے اس سلسلہ کی تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ان کے مضمون کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

بہر حال تعمیرات کا کام خوب تیزی کے ساتھ جاری رہا اور اپنے صحیح وقت پر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ آٹھ ماہ کی اس قلیل مدت میں "تعمیر و تزئین" کے نام پر تعمیرات کے اس ہمہ گیر کام نے لوگوں کو جس مغالطے اور اندیشے میں ڈال رکھا تھا، قلیل مدت کو دیکھتے ہوئے وہ واقعی صحیح تھا لیکن حضرت کی مسلسل محنت، جانفشانی، لگن اور ہمت کے ساتھ ساتھ دوسروں سے کام لینے کے طریقے سے سب لوگوں کے اندیشے اور مغالطے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ آج ہم لوگ دارالعلوم کو تعمیرات کے لحاظ سے جس طرح دیکھ رہے ہیں، جشن صد سالہ سے آٹھ ماہ پہلے دارالعلوم اس طرح کا نہیں تھا، پہلے "دار جدید" کے نام سے موسوم موجودہ عمارت ایسی نہیں تھی۔ بلکہ ہر بڑے ہال کمرہ کے درمیان اسی طرح کا بڑا خلا تھا۔ جس کو اسی کے ہم شکل ہال و کمرہ کی صورت دی گئی اور یہ تسلسل حضرت مولانا کی رہائش گاہ سے لے کر معراج گیٹ، پھر باب الظاہر پھر مدنی گیٹ سے گذرتا ہوا مولانا بہاری رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی رہائش گاہ تک اوپر چلا گیا۔ جو زینے ہر چہار جانب اسی بالائی عمارت سے اتارے گئے، وہ بھی پہلے نہیں تھے۔ کوئی بھی جانے والا معراج گیٹ سے اگر اوپر کی منزل پہ جاتا، تو اس کو باب الظاہر کے بڑے زینے سے ہی اترنا پڑتا تھا اور یہی انداز قبل از تعمیر ہر گیٹ کا تھا۔ ان زینوں سے اوپر کے فاصلے کم ہوئے اور آنے جانے والوں کو سہولت ہوئی [1]۔

تعمیرات میں مولینا کے حسن انتظام کی داستان جتنی دلکش ہے اس سے زیادہ دلچسپ

---

[1] وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۲۲۹

اور کئی جہت رکھنے والی کہانی اس پس منظر کی جس پس منظر میں حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے تعمیر و تزئین کی ذمہ داری مولینا کے سپرد کی۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولینا میں انتظامی صلاحیت کس قدر تھی اور اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے قاری صاحب کی جوہر شناس نظروں نے کس طرح ان کا انتخاب کیا تھا اور دونوں بزرگوں میں کتنا خلوص تھا اور قاری صاحب کو مولینا پر کتنا اعتماد تھا۔ حضرت مولینا وحید الزماں کی حیات کا ایک المناک پہلو یہ بھی رہا کہ آٹھویں دہائی کے آتے آتے انہیں اس کیمپ میں جانا پڑا جو قاری طیب صاحب کے خلاف تھا حالانکہ قاری صاحب قدس سرہ نے آپ کو سارے اختیارات سونپ دئے تھے اور یہ فرما دیا تھا کہ جس طرح بھی آپ بہتر سمجھتے ہوں کریں اور کسی کے اعتراض یا نکتہ چینی پر توجہ نہ دیں قاری صاحب تشریف لاتے تھے اور جو تعمیرات ہو رہی تھیں ان کا معائنہ بھی کرتے تھے، حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے اور آئندہ کا جو لائحہ عمل مرتب کرے اس کو اپنی منظوری بھی دیتے تھے ظاہر ہے کہ ہر تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے چنانچہ قدیم عمارتوں کی جب توڑ پھوڑ شروع ہوئی تو قاری صاحب سے شکایت کی گئی مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس سلسلے میں افضال الحق قاسمی لکھتے ہیں:

> اسی کے پیشِ نظر یہ بڑا اور پرشکوہ دروازہ بنایا گیا۔ یہ دروازہ سڑک کی تنگی اور زیادہ آمد و رفت کی وجہ سے مصلحتاً بند ہے پہلے اس جگہ ڈاک خانہ ہوا کرتا تھا۔[1]

اب آپ موجودہ دارالعلوم کا ماضی کی نگاہ سے موازنہ کیجئے اور اندازہ لگائیے کے دارالعلوم کی وہ کونسی جگہ ہے جہاں ''تزئین و ترمیم'' کے عنوان سے تعمیر کا سلسلہ نہ چھیڑا گیا ہو۔ وہ کونسی ایسی جگہ ہے جہاں حضرت نے دارالعلوم سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار نہ کیا ہو۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر انہوں نے حتی الامکان کوئی جگہ ایسی نہیں چھوڑی جس میں طلبہ کی رہائش، ان کی تعلیم کے لیے درسگاہیں اور انہیں سے متعلق دیگر اور ضروری عمارتیں نہ

---

[1] وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۲۲۹

بنائی ہوں۔ اندرونِ دارالعلوم آج جن راستوں پر آپ چل پھر رہے ہیں یہ سبھی راستے کچے اور محض ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے تھے۔ دارالعلوم کا موجودہ سبزہ زار چمن اور اس میں پختہ مختلف راستے اور اس کی چمن بندی کا نقشہ یہ سب حضرت ہی کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔

دارالعلوم کی مختلف گذرگاہوں پر جو لکڑی کے کتبے عربی اور اردو زبان میں ہدایتوں کے انداز میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سب حضرت کے جدت پسند ذہن کا ایک نمونہ ہے۔ دارالعلوم کی تمام تر تزئین وترمیم میں جو چیز حضرت نے اپنے پیش نظر رکھی وہ یہ تھی کہ قدیم تعمیرات کے ساتھ جدید تعمیرات کو اس طرح ضم کر دیا جائے کہ جس سے جدت کا دامن قدامت سے باہم مربوط رہے۔

دوسری چیز جس کو حضرت تعمیرات کی تکمیل کے بعد فرمایا کرتے تھے۔ یہ تھی کہ پہلے کوئی بھی ایسا بڑا راستہ جس میں کوئی گاڑی یا کار وغیرہ پاس ہو کر پورے دارالعلوم کو دیکھنا چاہے تو وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا بیٹھا گھوم پھر کر دیکھ سکتا ہے۔

یہی نہیں کہ اندرونِ دارالعلوم آپ کے کاندھوں پر تعمیرات کی اتنی عظیم ذمہ داری تھی، جس کو آپ بحسن وخوبی نباہ لے گئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جشنِ صد سالہ کی دوسری اہم ذمہ داریاں بھی آپ کے سر تھیں۔ جلسے گاہ کے اسٹیج سے لے کر پنڈال، پانی کا نظام، ضروری کیمپوں کا قیام اور ان کا جائے وقوع اور علمی نمائش وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب گو کہ عارضی ہی سہی، لیکن اہم ذمہ داریاں تھیں۔ اس وقت کوئی بھی ضرورت پیش آتی تو ہر شخص کی زبان پر حضرت مولانا کا نام ہوتا اور ان کی تلاش شروع ہو جاتی۔ غرضیکہ اندرونِ دارالعلوم اور بیرونِ دارالعلوم ایک ہی شخصیت رہتی تھی، جو پارہ کی طرح کبھی اس طرف تو کبھی اس طرف، کبھی یہاں تو کبھی وہاں دارالعلوم کے سبھی کاموں میں سرگرداں نظر آتی تھی، ذہانت کا یہ عالم کہ کسی بھی فنکار نے آپ کو ڈھونڈ کر جہاں بھی پالیا اور اپنے کام کی الجھن بیان کی تو اسے وہیں کھڑے کھڑے سمجھا دیا کہ ایسے نہیں، ایسے کرو، تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ ساتھ چلنے والے کو اپنی طبعی رفتار سے تیز گام ہونا پڑتا

تھا تب کہیں جا کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا تھا۔ بہر حال جیسے ہی تعمیرات کا یہ کام مکمل ہوا اور جشن صد سالہ کی بھی تیاریاں ہوگئیں تو وہ ساعت مسعود بھی آپہنچی۔ اس کے بعد بھی حضرت نے اپنا تعمیری پروگرام جاری رکھا اور دیکھتے دیکھتے دونوں طرف دو بڑے ہال تعمیر ہوگئے۔ تعمیری نوعیت کے حساب سے یہ کام چونکہ خاصا اہم تھا اور حضرت کی عقلمندی اور مہارت سے ہر دو جانب پُرشکوہ ہال بن کر تیار ہوگئے تو بعد میں ان ہی شکایت کرنے والے قدامت پسند لوگوں نے حضرت کی بہت تعریف کی اور حضرت کے اس کام کو بہت سراہا گیا اس کے علاوہ دارالعلوم میں جگہ جگہ تعمیر کا کام جاری تھا۔ مثلاً دارالعلوم کی بالائی مسجد اور مسجد کا ایک بڑا مشرقی گیٹ، اسی سے متصل مسجد کا حوض احاطہ باغ، دفتر تعلیمات کے قریب ایک بڑی عمارت یا بڑا دفتر تعلیمات وغیرہ جبکہ اس سے پہلے تعمیرات کا ایک بڑا مرحلہ جس میں ''دارِ جدید'' کے فوقانی حصوں میں بننے والے بڑے ہال کمرے شامل ہیں، طے ہو چکا تھا۔ جس پر دارالعلوم کے خزانے کا بڑا حصہ صرف ہو چکا تھا اور اب زیرِ تعمیر عمارتوں کے لیے مزید پیسہ دارالعلوم کے پاس نہیں تھا اس لیے اس موقع پر حضرت کے ذہن میں ایک زبردست الجھن رہا کرتی تھی، چنانچہ ایک روز کا واقعہ ہے کہ راج اور مستریوں کی ایک ٹیم بغرض ملاقات آئی۔ رسمی بات چیت کے بعد دارالعلوم کی تعمیرات سے متعلق گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت فرمانے لگے۔ بھائی مستری حضرات کام تو اس قدر لمبا چوڑا چھیڑ رکھا ہے اور دارالعلوم کا خزانہ خالی ہو چکا ہے۔ اب کیا کیا جائے، مستری حضرات کہنے لگے کہ حضرت ہم اسی پریشانی کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ کام اس قدر لمبا ہے، وقت بھی کم رہ گیا ہے، جگہ جگہ تعمیر کا کام چل رہا ہے، اب اگر پیسے کی کمی کی وجہ سے کام ایک دو روز بھی رک گیا تو کام کی جو رفتار آپ نے بنائی تھی اس کو بہت جھٹکا لگے گا اور معمار و مزدوروں کی اتنی بڑی تعداد بکھر کر رہ جائے گی۔ اس لیے ہم نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ کچھ بھی ہو، ہم انشاء اللہ کام جاری رکھیں گے ہمیں اپنی مزدوری کی کوئی پروا نہیں ہے، خواہ وہ ہمیں ملے یا نہ ملے۔ معمار حضرات کی اس ہمدردی پر حضرت خوش ہوئے اور فرمانے لگے، میں دارالعلوم کے تئیں آپ سب لوگوں کی اس قربانی اور جذبے کی قدر کرتا ہوں

اللہ آپ لوگوں کو جزاء خیر عطا فرمائے۔ لیکن میں آپ لوگوں سے یہ بھی عرض کروں گا کہ انشاء اللہ کام جس انداز اور جس تیز رفتاری سے چل رہا ہے اسی طرح چلتا رہے گا' کام رکنے کا تو کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا' البتہ یہ ضرور ہے کہ کام بہت بڑے پیمانہ پر چھیڑ دیا گیا ہے' اس لیے یہ ایک وقتی پریشانی لاحق ہوگئی ہے۔ آپ سب حضرات مطمئن رہیں' اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں' توکل علی اللہ ہی ہمارا پیسہ ہے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ آپ حضرات اسی محنت اور اسی جانفشانی سے کام کرتے رہیں اور بھائی اس بات کی جتنی فکر ہم سب کو ہے' اس سے زیادہ تو حضرت مہتمم صاحب کو ہے۔

اس طرح معمار حضرات کی یہ مجلس تقریباً بارہ بجے تک جاری رہی اور پھر یہ سب حضرات رخصت ہو گئے۔ اس کے معاً بعد دروازے سے سلام کی آواز آئی۔ یہ حضرت کے شاگرد مولوی حفظ الرحمن اور مولوی شبیر احمد تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں کچھ فائلیں اور کچھ دیگر کاغذات تھے۔ انہوں نے اپنی کاپیاں اور فائلیں کھولیں اور حضرت کو پورے ہفتے کا حساب سمجھایا اور حضرت سے مختلف کاغذات پر دستخط لیے' دراصل حضرت نے بہت سے کام اپنے ان شاگردوں کے ذمے کر رکھے تھے جو حساب کتاب کے معاملے میں بہت ہوشیار تھے۔ یہ دونوں حضرات رات گئے دیر تک تھے حضرت کے ساتھ بیٹھے کام کرتے رہے' میں نیند کے غلبے کے باوجود کسی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا' اس خیال سے کہ حضرت شاید کوئی حکم کریں۔ اتنے میں حضرت نے مجھ سے کہا کہ معروف تم بیٹھے کیا کر رہے ہو' بھائی بہت دیر ہوگئی ہے تم سو جاؤ۔ حضرت کے کہنے پر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا فوراً نیند آگئی۔ درمیان میں نہ جانے کس وقت آنکھ کھلی تو دیکھا تینوں حضرات قلم لیے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

صبح اُٹھ کر میں نماز کے لیے چلا گیا۔ واپس آیا تو دیکھا کہ حضرت اسی طرح بیٹھے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے' کیا نماز ہوگئی؟ میں نے کہا جی' تو جلدی سے اُٹھے اور نماز کے لیے چھتہ مسجد چلے گئے کہ وہاں قدرے تاخیر سے جماعت ہوتی ہے۔ ان کے جانے کے بعد ابھی میں نے تلاوت شروع ہی کی تھی کہ دروازے کی سمت سے کسی

کے سلام کرنے کی آواز آئی' تو مجھے کچھ عجیب سا لگا' ایسا لگا جیسے کہ یہ آواز قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی ہے' میں دروازہ کھول کر باہر آیا دیکھا تو واقعی حضرت مہتمم صاحب دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا' حضرت یہاں تشریف رکھیں (میری مراد اس گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھنے سے تھی) لیکن حضرت مہتمم صاحب اسی طرح بیٹھے رہے اور تسبیح پڑھتے رہے۔ میں بھی دوزانو ہو کر حضرت مہتمم صاحب سے ذرا فاصلے پر پیچھے کی جانب بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب اتنی صبح صبح اور تن تنہا مولانا کے کمرہ پر تشریف لائے ہوں' آخر کیا بات ہو سکتی ہے مگر میری یہ مجال بھلا کب ہو سکتی تھی کہ میں کچھ لب ہلاتا اور حضرت مہتمم صاحب سے ان کی تشریف آوری کی وجہ دریافت کرتا۔ میری منتظر نظریں دروازے پر گڑی ہوئی تھیں کہ اچانک حضرت مولانا تشریف لے آئے۔ میں ان کو دیکھ کر کھڑا ہوا اور تیزی سے حضرت کے قریب ہو کر حضرت مہتمم صاحب کے تشریف فرما ہونے کی اطلاع دی۔ مولانا نے نسبتاً ذرا بلند آواز سے سلام کیا' حضرت مہتمم صاحب فوراً کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا اور حضرت مولانا نے بھی مصافحہ کیلئے فوراً اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسی طرح حضرت مہتمم صاحب کے ہاتھوں کو پکڑے پکڑے گاؤ تکیہ کی سمت لے جاتے ہوئے کہا حضرت یہاں تشریف رکھیں۔ پھر حضرت مولانا نے میری طرف دیکھا' اشارہ تھا کہ چائے بناؤ۔ میں سمجھ گیا اور بہت جلد چائے وغیرہ تیار کر کے دسترخوان پر رکھ دیا۔ حضرت نے کچھ میٹھا و نمکین کھانے کے لیے عرض کیا تو مسکرا کر فرمایا کہ آج تو آپ جو کچھ بھی کھلائیں گے۔ میں ضرور کھاؤں گا گو کہ میرا بڑا سخت پرہیز چل رہا ہے [1]

بیرونی اسفار:

وحید الزماں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ فراہمی چندہ کے لیے معتمد اور معتبر افراد سے بھی کام لیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے اپنے ہونہار شاگردوں کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں کا سفر کیا اور ان اسفار میں کبھی ناکامیاب نہیں رہے۔ دارالعلوم کے لیے مالیہ

---

[1] ترجمان دارالعلوم ص ۲۲۵

کی فراہمی کے لیے یوپی کے مشرقی علاقوں کا طویل دورہ کیا۔اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں۔عوامی جلسے بھی اپنے دورہ میں کرتے رہتے تھے۔چندی گڑھ کولھاپور مہاراشٹرا کے علاقوں میں بسا اوقات قیام بھی کیا۔اور اپنے معاون مہتمم ہونے کی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے۔تعمیرات کے سلسلے میں جس مقصد کو لے کر چلے تھے اور جس ولولے کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔اس پر کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔

اس کے علاوہ بیرون ہندوستان آپ نے حجاز (۱۹۵۶ء مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے وفد میں شامل تھے) یورپ' جنوبی افریقہ' ماریشس' ای یونین' انگلینڈ (۱۹۸۲ء)' ریاض (ستمبر ۱۹۹۲۔۱۹۹۴) سعودی عرب' بحرین متحدہ عرب امارات (۱۹۷۷ء)' کویت (جنوری ۱۹۹۲ء)' قطر (۱۹۹۲۔ ۱۹۹۴ء)' دبئی (۱۹۹۴ء) کے درمیان سفر کیا۔کبھی تنہا کبھی اپنے شاگردوں کے ساتھ تو کبھی وفد کے ساتھ دورہ کرتے۔

نتائج الاسفار:

مولانا خلیل امینی' اپنی کتاب ''دکوہ کن کی بات'' میں کہتے ہیں۔ان اسفار کے نتائج ثمر آوردہ تھے۔آپ جہاں جاتے دارالعلوم کی مالی مدد کے لیے لوگوں کو راغب کرتے۔خصوصاً ہندی نژاد بیرون مسلمانوں نے بڑی مدد کی۔وہاں کے متعدد اخبارات میں آپ کے دعوتی و ادبی انٹرویو شائع ہوتے۔ان میں اہم ''لواءِ اسلام'' بھی ہے (۱۹۸۲ء) مختلف سر برآوردہ شخصیتوں سے ملاقات کرتے اور علمی و ادبی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے باہمی اتفاق و اتحاد پر زور دیتے اور دینی و ملی خدمت کی طرف متوجہ کرتے۔سنہ ۱۹۹۲ء ۱۹......۱۲ جنوری کو جب آپ نے کویت کا دورہ کیا تو وہاں وزارت اطلاعات ونشریات کی طرف سے' بغداد میں قید کویتی افراد کی رہائی پر زور دینے کے لیے ایک کانفرنس المؤتمر العالمی للإفراج عن ألاسری والمعتجزین الکویتیین وغیرھم فی سجون النظام العراقی کے

عنوان سے منعقد ہوئی تھی۔ ان میں خود خلیل امینی صاحب کے علاوہ مولانا سید احمد ہاشمی اور متعدد اہل علم شامل تھے۔ جو ہوٹل میریڈیان میں قیام کیے تھے۔ قطر میں چوں کہ آپ کے بڑے صاحب زادے مولانا بدر الزماں کیرانوی رہتے تھے۔ اس لیے وہاں دو مرتبہ جانا ہوا[1]۔

ان اسفار سے مولانا کو دیگر مدرسوں و اداروں کو سمجھنے اور ان کے طریقہ کار سے واقفیت حاصل ہوئی۔ نیز علمی و غیر علمی پروگراموں کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے ان اسفار میں بے شمار علمی، دینی، ثقافتی، دعوتی، اجتماعی، سیاسی و اقتصادی مسائل، مسلمانان ہند و مسلمان عالم موضوعات پر نہ صرف معلومات حاصل کیں بلکہ انھیں عملی زندگی میں بھی بہ حسن خوبی استعمال کرنے کی کوشش کی مولانا نے بجنور، نجیب آباد اور مہاراشٹرا کے بہت سے علاقوں کا دورہ بھی کیا[2]۔

مولینا نے وزرات حج و اوقاف سعودی عرب کی دعوت پر جون ۱۹۹۰ء کو حج و زیارت سے سرفراز ہوئے۔ ان اسفار میں آپ نے اچھی خاصی رقم جمع کی۔ جتنا مشکل کام رقم جمع کرنا تھا۔ اس سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ان رقوم کا صرفہ اور حساب کتاب باقاعدہ رکھنا اور عوام میں اعتماد پیدا کرنا.............۔

چنانچہ تادم تحریر اور مولینا کی حیات میں بھی مالیات میں خورد برد کا کوئی الزام ان پر نہ لگ سکا وہ دیگر مدرسوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ طلبہ کے سرپرست تو تھے ہی اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ ایک شخص جس کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہو وہ ہر رقم کو اسی اعتبار سے خرچ کرتے جس اعتبار سے وہ مختص کی گئی ہو۔ اس طرح مولینا کی شخصیت و کردار کا یہ اہم ترین پہلو سامنے آتا ہے کہ وہ مالیات کے سلسلے میں بھی دیانت کا پیکر تو تھے ہی اسے خوش سلیقگی اور تدبر کے ساتھ صرف کرنے کا بھی سلیقہ رکھتے تھے۔

چندہ جمع کرنے کے لیے ان کے دورے، ان کے اسفار، ایک پوری ٹیم کا ان کے

---

[1] دہ کوہ کن کی بات ص ۲۸۷ [2] دہ کوہ کن کی بات

ساتھ رہنا ان سارے گوشوں کی طرف اشارے کئے جا چکے ہیں۔ مولانا کا ایک زبردست کارنامہ صرف ۸ ماہ کی قلیل مدت میں مالیہ کی فراہمی کے لیے اندرونِ ملک کے طوفانی دورں کے ساتھ دارالعلوم کی طویل وعریض عمارتوں کی تزئین وترمیم اور نئی عمارتوں کی تعمیر کا کام تھا......
اس موقع سے نہ صرف بوسیدہ اور مرمت طلب عمارتوں کی تزئین وترمیم کی بلکہ بہت سی نئی عِمارتیں تعمیر ہوئی بلکہ مسجد قدیم کا صدر دروازہ دارالعلوم کے صدر دروازہ کی بالائی منزل احاطۂ قطب خانہ کا دو منزلہ برآمد دفترِ تعلیمات' دارِ جدید کی بہت سے کمرے بالائی منزلیں۔ جو ہر دو کمرے کے بیچ میں ایک کمرا بہ قدر خالی جگہ میں بنائے گئے۔ دارالحدیث فوقانی کی دائیں اور بائیں جانب دو درس گاہیں اور ان کے (تین) طرف برآمدے قابل ذکر ہیں [1]

تعمیرات میں مولینا کا حسنِ انتظام اور فنِ تعمیر سے اُن کی زبردست مناسبت تاریخی حیثیت کی مالک ہیں جو عمارتیں انھوں نے بنوائی یا جن کی تزئین اور تعمیرِ نو سے دلچسپی لی اس کا کچھ تذکرہ ہو چکا ہے تطویل سے گریز کرتے ہوئے مختصراً ان عمارات کی فہرست پیش کی جارہی ہے جو مولینا کی زیرِ نگرانی منشائے منصبا شہود پر آئی۔ ملاحظہ ہوں:

۱۔ دارالعلوم دیوبند کا تاریخی صدر دروازہ ''باب قاسم''

۲۔ سہارن پور روڈ پر واقع دارالعلوم کا ایک مرکزی دروازہ

۳۔ بابِ امداد'' جس کا بالائی جدید بال'' (جس میں دفترِ اہتمام واقع ہے)

۴۔ دارالعلوم کی قدیم مسجد کا جدید دروازہ

۵۔ دارالتفسیر' دارالحدیث

اس تفصیل کے بعد مولانا کے حسنِ انتظام کے سلسلہ میں کوئی اور گوشہ نہیں رہ جاتا سوائے اس کے کہ راقمۃ الحروف نے کیمپ دارالعلوم کے سلسلہ کے واقعات کا اشاراتی ذکر کیا ہے

---

[1] وہ کوہ کن کی بات صفحہ ۲۷۲ مولانا خلیل امینی

تفصیلی ذکر میرے خیال میں اب فراموش کر دینے کے قابل ہے اب نہ قاری حضرت طیب صاحب قدس سرہ گئے اور نہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی ۔حضرت مولانا اسعد مدنی حیات ہیں پروردگارِ عالم اُن کا سایہ سلامت رکھے ۔ بالفرض اُن پر اگر کوئی اعتراض کیا بھی جائے اور وہ اُس کا جواب بھی دے دیں تو بھی اب واقعات کی وضاحت اور صفائی قطعاً غیر ضروری ہوگی اور خواتین میں رائج ایک مخصوص محاورہ "مردہ کے چہرے سے جتنی بار چادر ہٹائی جائے گی رونا آئے گا" اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ گزرے ہوئے واقعات کی لاش کو ماضی کے مزار میں دفن کر دوں اور صرف یہ عرض کر دوں کہ کیمپ کے زمانے میں جو واقعات پیش آئے تھے ان میں مولانا وحید الزماں کیرانوی کی بے لوث خدمات یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔ طلباء سے اُن کی وابستگی ان کا حسن انتظام اُن کا تدبر اور ان کی معاملہ فہمی نے ایک بہت بڑے آتش فشاں کو بھٹی کی آگ میں بدل دیا اور اس طرح معاملات کو نبھایا کہ غیروں کو مداخلت کا موقع نہ مل سکا اور اٹھارہ سو ستاون میں جس روایت کا آغاز مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کیا تھا اور جس روایت کو اسیرانِ مالٹا نے پروان چڑھایا تھا۔ اور جس روایت میں مولانا حضرت اشرف علی تھانوی کے خونِ جگر کی سُرخی شامل تھی اور جو روایت ۴۷ء میں خونی آندھی کی جھکڑ سہہ گئی تھی وہ روایت آج بھی زندہ اور سربلند ہے۔ مستقبل کا مورخ جب بھی اس روایت کا تذکرہ کرے گا تو وہ ان لوگوں کا ذکر کرے گا ہی جنہوں نے روایت سازی کی مگر ان کا تذکرہ بھی کرنے پر مجبور ہوگا جنہوں نے ان روایات کا دفاع کیا اور رگِ گلو میں آخری قطرۂ خون تک اس کے دفاع کے کوششوں میں تاریخ کے اوراق کو سنوارتے اور سجاتے رہے۔

❁❁❁❁❁❁

باب پنجم

مولانا وحید الزماں کیرانوی بحیثیت مصنف

مولانا وحید الزماں کیرانوی بحیثیت مصنف

کسی بھی شخصیت کے مختلف ابعاد یا Dimensious یا جہتیں ہوتی ہیں۔ اسکی زندگی کے حالات' اسکی جہد و عمل کی صلاحیت' اسکے مشاغل' اس کے شب و روز' اسکی پیشہ وارانہ مصروفیات' اس کی سماجی حیثیت' اس کی کارکردگی وغیرہ بہت اہم ہوتی ہیں اور اہم سمجھی جاتی ہیں۔

لیکن یہ بھی اس سرائے فانی (جسے دنیا کہتے ہیں) کی تلخ حقیقت ہے کہ مادی پیکر کے فنا ہوتے ہی دھیرے دھیرے اس سے وابستہ یادیں بھی ماضی کے اندھیروں میں گم ہوتی جاتی ہیں۔

البتہ ایک شئے باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے انسانی تخلیق...... جو الفاظ کے سہارے اس کے خیالات کو محفوظ رکھتی ہے۔

پروردگار نے انسان کی تخلیقی صلاحیت کو تبارک اللہ احسن الخالقین کہہ کر سند عطا کی ہے کہ بیشک وہ احسن الخالقین ہے مگر اس دنیا میں اس کا خلیفہ بھی جوہر تخلیق سے آراستہ ہے۔

مولانا وحید الزماں بھی جوہر تخلیق سے آراستہ تھے! اُن کی تخلیقات میں زندہ باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ اُن کی تخلیقات تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

عربی کتب درسیہ (۲) اردو کتب (۳) لغات و معاجم۔ پہلے ان کی عربی کتب درسیہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس جائزہ میں پس منظر کے طور پر عربی زبان و ادب کے تہذیبی ثقافتی پہلو کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخی اعتبار سے عربی کا نقطۂ آغاز اور اس کے ارتقاء کی کہانی بیان کرنا سنگلاخ وادیوں کے سفر کے مترادف ہے کہا جاتا ہے کہ حضرت سام بن نوحؑ اس زبان کے خالق ہیں لیکن اس کے عقلی یا کلی دلائل وشواہد پیش کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لیے یہ زبان جب طفولیت کی منزل میں تھی تو اس وقت تک دنیا اس سے متعارف نہ ہوئی مگر جب عالم شباب میں آگئی اور اس کے اصول وقواعد منضبط ہو گئے تب دنیا نے اس زبان کو جانا۔

عربی کے سلسلہ میں سماجی لسانیات کے کچھ اہم نکات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اس زبان کے پاس صحرا کے ریتیلے مزاج کا ظرف بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ نخلستانوں کی نرم ٹھنڈی' خوشگوار چھاؤں اور بہتے ہوئے پانی کی نغمگی بھی...... ظاہر ہے کہ اس ماحول میں زندگی گزارنے والوں کا ایک مخصوص مزاج تھا عربوں کے بارے میں یہ شہرت عام ہے کہ عرب قبائلی نظام کے پروردہ تھے اور اس نظامِ معاشرت میں متمدن اور ثقافتی عناصر کا پایا جانا مشکل تھا۔ اور ایک واحدہ یا اکائی کے طور پر عرب تہذیبی اعتبار سے مربوط ومنسلک نہ تھے اور اسی بناء پر ان کی زبان بھی سایہ تخیل کی طرح منقسم رہی عربی زبان میں باہمی اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عرب زیادہ تر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے' اور قبائلی شکل میں زندگی گذارنے کے عادی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی زبان حالات وماحول سے بالکل نابلد اور ناواقف تھے' انہیں وجوہات کی بناء پر عربی زبان مختلف بولیوں اور زبانوں میں تقسیم ہوگئی اور مختلف طریقے کے لب ولہجہ وجود میں آگئے۔ نتیجتاً ایک ہی زبان بہت سی زبانیں معلوم ہونے لگی یہاں تک کہ ایک قبیلہ کی زبان دوسرے قبیلے والوں کے لیے ناقابل فہم بن گئی۔ اور ہر قبیلہ والا اپنی زبان کو بہتر سمجھنے لگا اور دوسری زبان میں نقص تلاش کرنے لگا۔

عربی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) شمالی عربی زبان (۲) جنوبی عربی زبان ان دونوں زبانوں میں اتنا فرق اور بُعد پایا جاتا تھا کہ ابوعمرو بن العلاء نے یہاں تک کہنے کی جرأت پیدا کرلی اور کہہ دیا کہ ''حمیر کی زبان نہ ہماری زبان ہے اور نہ ہی ان کی لغت

ہماری لغت ہے" اس قول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دونوں کی زبان میں بہت فرق پایا جاتا تھا اور دونوں زبانیں آپس میں بہت زیادہ دور تھیں۔ اور آپس میں ظاہراً کوئی باہمی ربط بھی نہیں رکھتی تھیں۔

لیکن ان تمام اختلافات، دوری اور باہمی ربط نہ رکھنے کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں زبانوں میں کوئی ربط و تعلق نہیں پایا جاتا تھا۔ اور نہ ہی اس بات سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں آپس میں کوئی تعلق نہیں رکھتی تھیں اور دونوں زبانوں کی اصل و بنیاد ایک نہیں ہے...... دونوں زبانوں کی اصل اور ابتداء ایک ہی ہے صرف مختلف قبائل کی شکل میں رہنے کی وجہ سے اور بُعد مکانی کی بنیاد پر جداگانہ اور الگ الگ زبانیں معلوم ہونے لگیں تھیں۔ اگرچہ دونوں زبانیں ایک اصل کی دو فرع تھیں۔ عربی زبانوں کو آپس میں قریب لانے اور ایک دوسرے سے مربوط کرنے میں سب سے زیادہ میلے اور بازار کا ہاتھ رہا ہے۔ چونکہ عرب میں یہ دستور تھا کہ سال کے مختلف موسموں میں عرب کے مختلف خطے اور علاقوں میں میلے اور بازار لگتے تھے۔ جس میلے اور بازار سے عرب اپنے لیے سال بھر کا اثاثہ اور ضروریات خرید کر رکھ لیتے تھے۔ مختلف جگہوں کے تاجر اور متعدد علاقوں کے خریدار ایک ہی جگہ پر جمع ہو جاتے تھے۔ جب عرب کے مختلف قبیلہ والے ایک جگہ پر جمع ہونے لگے اور ایک دوسرے سے قریب آنے لگے لوگوں کے ساتھ ان کی زبانیں بھی قریب آنے لگیں اور دوسرے کے زبان کے لب ولہجہ پہچاننے لگے۔ ایک دوسرے الفاظ کی ساخت اور محل استعمال سے بھی واقف ہونے لگے۔ وہ زبانیں جو ابھی تک انفرادی زبانیں تھیں اب وہ اجتماعی زبان بن گئی...... اس طرح سے عربی زبان کی ترقی ظہور پذیر ہوئی۔ اور عربی زبان ارتقائی منزلیں طے کرنے لگی۔ دنیا کی ہر زبان کا یہی حال ہے کہ نثر کا استعمال زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت نظم کے اس لیے کہ ہر زبان میں روزمرہ کی زندگی اور گھریلو بول چال میں نثر ہی وسیلۂ اظہار بنتی ہے۔

دنیا کی ہر زبان میں اور خاص کر عربی زبان میں اس قسم کی نثر میں بہت زیادہ مواد ہوتا ہے۔اور اسی نہج کی نثر سے دنیا کی ہر زبان مالا مال ہوتی ہے۔اس طرح کی نثر میں عرفان ومعارف تصنیف وتالیف ترجمہ وتبصرہ اور حکایات وکہانیوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔عربی زبان میں علوم کے متعلق بھی قابل اعتنا مواد پایا جاتا ہے۔عربی زبان میں دنیا کے ہر علوم کے بارے میں وافر مقدار میں مطالب ومفاہیم پائے جاتے ہیں۔ جیسے علم نحو وصرف لغت وعروض منطق وفلسفہ معانی وبیان فقہ واصول کہانیاں وحکایات محاورے وضرب الامثال پر عربی زبان میں ایک قیمتی ذخیرہ پایا جاتا ہے۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عربی زبان دنیا کے بیشتر علوم سے آراستہ ومالا مال ہے۔عربی زبان میں اسی وقت سے وہ حکایات جو پند ونصائح اور مواعظ پر مشتمل ہوتی تھیں ان حکایتوں اور کہانیوں پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔لوگوں کی ان حکایات سے دلچسپیاں بڑھیں اور لوگ ایسی کہانیوں کی طرف متوجہ ہونے لگے تو اہل قلم نے بھی دل کھول کر اس فن پر لکھنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں عربی زبان میں حکایات اور کہانیوں پر مشتمل ایک قابل قدر سرمایہ جمع ہوگیا۔اور اس فن پر بے تحاشہ کام کیا گیا۔اور ایسی حکایات وکہانیاں دو فائدہ پہنچا رہی تھیں۔ایک تو حکایات سے علم وآگہی دوسری ذہنی اخلاقی اور فکری تربیت مل جاتی تھیں۔ یہ حکایات جہاں وقت گزاری کے اسباب فراہم کرتی تھیں۔وہیں پر روحانی ومعنوی سکون کا ذریعہ بھی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ اس فن کی طرف ہر خاص وعام توجہ دینے لگا۔جب علمائے اخلاق نے یہ دیکھا کہ اخلاقی تربیت کیلئے حکایات ایک آسان اور مفید راستہ اور طریقہ ہے تو انہوں نے بھی اس فن کی طرف خصوصی توجہ دی۔

یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں حکایات سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں، ۲۸۰۰ قبل مسیح میں مصر میں شکستہ ملاح کی کہانی بہت مشہور تھی، چین میں شفتالو کے پھول کی کہانی یا ہندوستان میں سوم دیو کی کتھا ''سرت ساگر'' یا گناڈیہ کی ''برہت کتھا'' یا ان سب سے قبل رگ وید میں اپالا کی کتھا ملتی ہے۔یہ کتھائیں اور قصے اس اعتبار سے بہت اہم ہوتے ہیں

کہ ان میں تحریر، تجسس، مہم آزمائی اور آخر میں کوئی اخلاقی نتیجہ ضرور نکلتا ہے مثلاً چین کی ایک مشہور حکایت درج کی جاتی ہے۔ جس کا قصہ یہ ہے کہ بادشاہ کے وزیر کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے ایک لڑکا گود لیا، پال پوس کر بڑا کیا، جب وہ لڑکا بڑا ہو گیا تو وزیر اس کو اپنی جگہ بیٹھا کر خود گوشہ نشیں ہو گیا، لڑکے نے بادشاہ کو قید کر لیا خود بادشاہ بن بیٹھا اور وزیر کی تلاش شروع کی وزیر بہت منجھا ہوا گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس نے لڑکے کی پوری بساط الٹ دی اور گرفتار کیا، اور بادشاہ کو پھر سے تخت پر بیٹھایا اور اس لڑکے کو عجیب وغریب سزا دی اسے ایک عالیشان محل میں قید کیا اس کے آمد و رفت پر پابندی لگا دی۔ ایک آدمی دونوں وقت آتا تھا اور صبح و شام نصیحت کرتا تھا۔ ہفتہ بھر بعد وزیر کا یہ متبنی نصیحتیں سنتے سنتے مر گیا۔

احیقار کی یہ مشہور کہانی بے شمار اخلاقی نکات تو رکھتی ہی ہے یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ کوئی شئے اگر ناگوار ہے تو وہ نصیحت ہے۔ اس طرح کی کہانیاں کتب درسیہ میں اسی لیے شامل کی جاتی تھیں۔ کہ ان کی وجہ سے ابتداء ہی سے طالب علم کی ذہنی تربیت اور اس طرح کے قصوں اور حکایات میں ذخیرۂ الفاظ کی مصرف بھی ہوتا ہے۔

مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی نے درسی کتابوں کے لیے قلم اٹھایا اور درسی کتابیں مرتب کرنے لگے تو انہوں نے بھی اپنی درسی کتابوں میں ان حکایات اور کہانیوں کو منتخب کیا جو زبان کی تعلیم کے ساتھ اخلاقی وفکری تربیت پر مشتمل ہوں یا وہ واقعات جو اخلاقی قوانین کو اجاگر کرتے ہیں ان واقعات کو اپنی کتابوں میں جگہ دی تاکہ طلباء کو بزرگوں کے واقعات سے رشد فکری بھی حاصل ہو اور زبان کے لب ولہجہ کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ کی ساخت سے بھی واقف ہو جائیں۔ اور حکایات و واقعات کے ضمن میں آسانی کے ساتھ طلبہ عربی زبان کو سیکھ لیں۔

کتاب وہی کامیاب اور مقبول ہوتی ہے جو زمانے کے حالات اور ماحول کو دیکھ کر مرتب اور تالیف کی جائے۔ خاص کر درسی کتابوں میں ہر بات کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے کہ کتاب طلبہ کی سطح ذہنی سے اتنی بلند نہ ہو کہ وہ اصل مفہوم ومطالب سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ اور نہ کتاب کی عبارت

اتنی پست ہو کہ طلباء کے لیے قابل استفادہ نہ ہو۔ جو کتاب موجودہ زمانے کے حالات ثقافت کلچر اور موجودہ نسلوں کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھ کر لکھی جاتی ہے۔ وہی کتاب مورد استفادہ قرار پا سکتی ہے۔ درسی کتابوں کے لیے ضروری ہے کہ جن طلبہ کے لیے لکھی جارہی ہے ان کی علمی لیاقت اور فکری صلاحیت کو ذہن میں رکھ کر مرتب کرنا چاہیے تا کہ طلباء کے درمیان زیادہ سے زیادہ مورد استفادہ قرار پائے۔ وہ کتابیں جو مقفّیٰ ومسجع ہوں یا لغات اور الفاظ غریبہ بھرمار ہوں۔ علم معانی و بیان کا مخزن ہوں۔ فلسفیانہ ومنطقیانہ نظریات کی زیادتی ہو۔ ایسی کتابوں کو علم ادب کے ماہرین اور فن ادب کے کمالات کے مالک حضرات فن وادب کا شاہکار سمجھ سکتے ہیں۔ اور ایسی کتابوں کی تعریف اور توصیف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر سکتے ہیں۔ جب کہ ایسی کتابیں صرف اور صرف خواص کے لیے مورد استفادہ قرار پا سکتی ہیں۔ اور چند مخصوص لوگ ہی ایسی کتابوں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ کتابیں جو حالات و ماحول کے مطابق سادہ اور آسان زبان میں لکھی جاتی ہیں۔ موجود دور کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ایسی کتابیں آیندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ اور مستقبل کو سنوارنے اور سدھارنے کے لیے کارآمد ثابت ہوتی ہیں جبکہ ایسی کتابوں کی طرف اہل فن حضرات نہ ہی کوئی خاص توجہ دیتے ہیں نہ ہی ایسے مولفین ومرتبین کی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور نہ ہی ایسی کتابوں کو کوئی خاص اہمیت دیتے ہیں...... جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہی کتابیں وہ جو عام ہیں لوگوں کے لیے قابل استفادہ ہوتی ہیں اور کتابیں کہلانے کی حقدار ہیں۔

کتاب اُس عبارت کو کہتے ہیں جن کے ذریعہ مصنف و مولف اہل نگارش حضرات اپنے نظریات خیالات افکار اور ذہن میں موجودہ مضامین ومفاہیم کو قارئین حضرات کے ذہن کی طرف منتقل کرتے ہیں صاحب رائے ونظریات حضرات ان عبارتوں کے ذریعہ اپنے خیالات ونظریات کی اشاعت کرتے ہیں۔ اگر یہ الفاظ نہ ہوں تو ہر اک نظریات وخیالات اس کے موت کے ساتھ دفن وختم ہو جاتے اور ان کا جاننے والا کوئی نہ ہوتا۔ کوئی کسی کے افکار و

خیالات سے واقف و آگاہ نہ ہوتا اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ الفاظ و تحریریں ہیں جو لوگوں کے ذہن میں موجود مفاہیم و مضامین کو منتقل کرنے کا ذریعہ واقع ہوتی ہیں۔ ہر کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہر کتاب کے مضامین و مفاہیم اور معانی و مطالب سے ہی لگایا جاتا ہے۔ جس کتاب کے مطالب و معانی میں جتنی بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ ہر کتاب کی اہمیت ہوتی ہے. جس کتاب کے مفاہیم و مطالب تشنہ انسانیت کے لیے سیرابی کا سبب بنیں وہی کتاب زیادہ قابل قدر ہے. جس کتاب کے مضامین دنیائے انسانیت کو کمال کی منزل تک پہونچانے کا ذریعہ بنیں اور انسانیت کو اس کے منزل مقصود تک پہونچانے کا وسیلہ بنے وہی کتاب کہلانے کی حقدار ہے۔

درسی کتابیں در حقیقت دنیائے انسانیت و آدمیت کے مستقبل کی ضامن اور نسل نو کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہوتی ہیں اور اخلاقی اقدار کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں...... درسی کتابیں متعدد جہت سے فائدہ مند اور منفعت بخش ہیں اور کئی عنوان سے مفید ہے۔

اور ان کتابوں ہی کہ سبب طلبہ کسی زبان کے اسرار و رموز سے واقف ہو جاتے ہیں' اس زبان کی نزاکت' ساخت الفاظ اور اس کی شائستگی سے واقف و آگاہ ہوتے ہیں۔ زبان کی چاشنی و حلاوت سے بہرہ مند ہوتے ہیں...... ماہر نفسیات نے کسی فن کے سیکھنے اور حصول کمال کے لیے سب سے بہترین وقت صغرسنی اور کم سنی کو مانا ہے' بچپنا انسان کی تربیت کا زمانہ ہے' علماء اخلاقیات نے اسی تربیت کے لیے صغرسنی پر زیادہ زور دیا ہے۔

تربیت کے معاملے میں بھی زبان اہم کردار ادا کرتی ہے' علمائے نفسیات کے مطابق جس زبان کے الفاظ سخت ہوتے ہیں اور جن الفاظ کے ادا کرنے میں سختی درپیش ہوتی ہے۔ زبان بھی سخت ہو جاتی ہے اور مزاج پر بھی الفاظ کی سختی کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے ابتدائی مراحل میں سخت اور مشکل لب و لہجہ سے بچوں کے لیے اجتناب کرنا چاہئے۔ مزاج کی سختی آگے چل کر

اس کے اخلاقیات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔اس لیے تربیتی ماحول میں ایسی زبان سے پرہیز کرنا چاہیئے......کم سنی زبان کے سیکھنے میں ایک اہم وقت اگر بچے نے کم سنی میں صحیح تلفظ اور اچھا لب ولہجہ حاصل کرلیا تو آخر عمر تک وہ صحیح تلفظ باقی رہتا ہے بچوں کے درسیات میں انتخاب الفاظ بندش لفظ اور ترکیب وغیرہ میں خاص توجہ دینی چاہیئے تاکہ مافی الضمیر کو احسن طریقے سے ادا کر سکیں اور سامعین ومخاطبین کو کلام کے سمجھنے میں پریشانی اور مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے نیز معانی کلام کو سمجھنے میں پریشانی اور مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔اور نہایت آسانی کے ساتھ باہمی گفتگو کے دوران ایک دوسرے کے مفاہیم سے آگاہ ہو سکیں اور ابلاغ وترسیل کا حق ادا ہو سکے۔ان ہی باتوں کی بنا پر یہ کہنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ ادبی اور فنی کتابیں لکھنا آسان ہے اور درسی کتابوں کا مرتب کرنا بہت مشکل امر ہے۔

ادبی وفنی کتابیں لکھتے ہوئے لوگوں کے سطح ذہنی کو نظر میں رکھنا ضروری نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کی ذہنی سطح مختلف مراتب و درجات میں منقسم ہوتی ہے۔کائنات عالم میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو تمام طبقوں کے لیے یکساں طور پر مورد استفادہ قرار پائے۔لیکن درسی کتابوں کو لکھتے وقت اور مرتب کرتے وقت طلباء کی ذہنی سطح اور ان کی صلاحیت اور لیاقت کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔درسی کتابوں میں سالفاظ اور تراکیب کے استعمال میں احتیاط کی جاتی ہے۔لغات مشکلہ ومشکل عبارتیں اور تراکیب پیچیدہ کے استعمال میں بھی احتیاط برتی جاتی ہے مضامین بھی سادہ وآسان نہج پر مشتمل ہونا چاہیئے۔تاکہ طلبہ بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔اور اساتذہ کرام نہایت اچھے طریقے سے مضامین اور مفاہیم کو طلبا کے ذہن میں منتقل کرا سکیں اور کتاب پڑھانے کا جو حق ہے۔اسے آسانی کے ساتھ ادا کر سکیں۔

ان تمام باتوں اور نکات کو ذہن میں رکھ کر مولینا وحید الزماں نے بھی اپنی تمام درسی کتابیں مرتب کیں ہیں۔ان کتابوں میں آسان وسادہ زبان پائی جاتی ہے۔تراکیب بہت آسان اور مختصر استعمال کی جاتی ہے۔نحوی وصرفی قوانین کی رعایت کی گئی ہے۔لغات مشکلہ اور

غریب الفاظ سے خاص طور سے پرہیز کیا گیا۔ مفاہیم اور مضامین کے لحاظ سے نہایت بلند اور اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ کتابیں نہایت سلیس اور جدید اسلوب پر لکھی گئی ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کتابوں کے اسباق آپس میں متصل اور مربوط ہیں۔ اور معیاری کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا موصوف کی درسی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مرتب کرنے والا کوئی عربی نژاد ہے۔ عربی زبان میں مہارت رکھنے والا ہے۔ اور عربی زبان پر قادر الکلام شخص ہے اور عربی زبان کی تمام باریکیوں سے بہ خوبی واقف و آگاہ شخص نے ان کتابوں کو مرتب کیا ہے یہ کتابیں اس طریقے و نہج پر لکھی گئی ہیں کہ اگر طلباء تمام درسی کتابوں کا مطالعہ کر لیں تو بہت آسانی کے ساتھ عربی زبان بولنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ اور عربی زبان سیکھنے کے لیے الگ سے کوئی محنت مشقت اور سعی و کوشش نہیں کرنی پڑے گی۔ تمام درسی کتابوں میں کہیں بھی اور کوئی بھی ادبی یا نحوی و صرفی غلطی نہیں پائی جاتی ہے۔ اور نہ ہی پورے نظام درسی میں کوئی لچر یا پست عبارت نہیں پائی جاتی ہے۔ پوری کتاب ہر قسم کی اغلاط سے محفوظ و مامون اور تمام خامیوں سے یکسر خالی نظر آتی ہے۔ کتابیں درسی لحاظ سے نہایت معتبر اور مستند پائی جاتی ہیں۔ جب کہ دوسری کتابوں میں ہر طرح کی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے طلباء کو مشکلات و پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

ان کے اندر قدیم زبان کا بہت زیادہ زور پایا جاتا ہے۔ پرانے دور کی تحریروں کو بنیاد بنا کر کتابیں تحریر کی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جدید اسلوب اور روش پر کتابوں کو مرتب کیا جاتا ہے اور نئے طریقے اور نہج پر کتابوں کی تالیف کی جاتی ہے۔ ایسی کتابوں میں قدیم اسلوب کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسی کتابوں کو پڑھنے والا اور ایسی کتابوں سے استفادہ کرنے والا بہت مشکلات اور پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح کی کتابوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ قارئین حضرات زبان کی ایک ہی روش اور طریقے سے واقف ہو پاتے ہیں۔ دوسرے طریقے اور روش سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ اگر قدیم قسم کی عبارتیں پڑھی ہیں

تو جدید قسم کی زبان اور اس کی باریکیوں سے لاعلم رہتے ہیں۔ اور اگر جدید اسلوب ولب ولہجہ کو پڑھا ہے اور نئی روش کو یکھا ہے تو قدیم زمانے کی طرز نگارش سے یکسر بے خبر رہتے ہیں۔ درسی کتابوں کا یہ سب سے بڑا عیب ہے۔ اگر کسی کتاب میں ایک اسلوب کو مرکز مان کر مرتب کیا گیا ہے۔ تو حقیقتاً عربی زبان کی نزاکت کو نہیں محسوس کیا جا سکتا۔ ایسی کتابیں نہ ہی ہدف ومقصد کتاب نویسی کو پورا کر پاتی ہیں۔

عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی کتابیں مرتب کی جائیں جس میں طرز قدیم کی بھی جھلک ہو اور اسلوب جدید بھی پایا جاتا ہو زبان قدیم کی چاشنی بھی اور عہد جدید کی لسانی اور فکری چمک بھی پائی جاتی ہو تا کہ طلباء اچھے طریقے سے بہرمند ہوسکیں۔ قدیم عربی کے بھی الفاظ کی ساخت کا تعارف کرایا جائے اور اس میں نئے اور جدید الفاظ کے ذخیرہ بھی موجود ہوں تا کہ طلاب قدیم اور جدید دو قسم کے الفاظ اور اس کے لب ولہجہ کو جان سکیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ قدیم اور جدید زبان کے الفاظ کے ایسی بھول بھلیاں تیار ہو جائیں کہ طلبہ اسی میں گم ہو کر رہ جائیں۔

دور قدیم کے کتابوں اور عبارت میں ایک بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ مضامین اور مفاہیم پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ اسلوب اور طرز اظہار کی آرائش مطلوب ہوتی تھی۔ ادباء اور مولفین حضرات کا کلام حد ایجاز پر پہونچ جاتا تھا۔ الفاظ کی قلت اور مطالب کی کثرت۔ جس میں غریب ترکیبیں' قاموسی بندشیں نادر لغات اور تشبیہات وتلمیحات بعیدہ کا استعمال بہت کثرت سے پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے کلام کے معانی ومطالب اخذ کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے لفظی ومعنوی محاسن کی بہتات مفاہیم کو بہت زیادہ گنجلک بنا دیتی تھیں۔ اس امر کے برخلاف بہت سی ایسی کتابیں تھیں جو حد اطناب کا شکار ہو کر رہ گئیں ان کتابوں میں صرف اور صرف عبارت آرائی پائی جاتی تھی فقط لفظوں اور عبارتوں کا مخزن ہو جاتی تھیں ان کے اندر مفاہیم اور مطالب بہت ہی کم ہوتے تھے۔

آپ کی کتاب کی تالیف وترتیب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کتاب کی عبارت ایسی نہ ہو کہ ایجاز گنجلک بنا دے اور نہ ہی عبارت میں اتنی وسعت ہے کہ وہ اطناب عمل کا نمونہ بن کر رہ جائے بلکہ کتاب کی عبارت درمیانی ہے اور طلبہ کے لیاقت وصلاحیت کے اعتبار سے کتاب ترتیب دی گئی ہے اور طلبہ کماحقہ استفادہ کر سکتے ہیں اور کتابوں میں اپنی دلچسپی برقرار رکھ سکتے ہیں ذرک مطالب میں دشواری نہیں محسوس کریں گے۔ مولینا نے اپنی درسی کتابیں اس نکتہ پر توجہ دے کر ترتیب دی ہیں اور مفہوم کے مناسبت سے الفاظ کا انتخاب ہے اور انتخاب الفاظ بہت ہی خوشنما اور اظہار مطلب کے لیے نہایت ہی دل آویز طریقہ اپنایا ہے تا کہ عربی زبان کو سیکھنے میں کوئی زحمت وپریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

کسی بھی کتاب کی تصنیف وتالیف پر حالات وماحول کا کافی اثر پڑتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں طرز تحریر میں بھی تبدیلی آجاتی ہے جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے ویسے ویسے سماج ثقافت اور کلچر بھی تبدیل ہوتا جاتا ہے۔

کلچر وثقافت کے بدلنے سے طرز گفتگو اور نہج تحریر بھی بدلتا رہتا ہے کہا جاتا ہے کہ ادب ماحول اور کلچر کے زیر سایہ پروان چڑھتا ہے جیسا کلچر ہوگا ویسی ہی عبارت استعمال ہوگی۔

کتاب وہی قابل استفادہ اور مفید ہوتی ہے جو ثقافت اور کلچر کے اتار چڑھاؤ کو مد نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہو بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ادب ہی کلچر وثقافت کا ترجمان ہوتا ہے...... دور قدیم میں عرب قوم جنگ وجدال کی رسیا تھی۔ لوٹ ماران کے ہنر اور قتل وغارت گری اس قوم کمال کا سبب تھا۔ حرب وضرب کی دلدادہ قوم تھی۔ گھوڑے اور تلوار کو سرمایہ حیات جانتی تھی۔ اس وقت دنیائے عرب میں شہد کھجور اور بھیڑ و بکریاں ان کی سرمایہ وملکیت ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ دور قدیم میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف کو شعراء اپنا افتخار سمجھتے تھے رزم گاہ کے مناظر کی عکاسی کو ادباء اپنا کمال جانتے تھے۔ فنون جنگ اور ہتھیار کی تعریف وتوصیف پسند کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ قارئین اور سامعین حضرات بھی ایسی تحریروں کو بہت پسند کرتے

تھے۔اور ایسی نظموں کو بہت ہی شوق سے پڑھتے تھے۔دورِ جاہلیت میں شعراء اور ادباء عوام کے سامنے اپنے کلام پیش کر کے داد و تحسین وصول کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ بازار اور میلے میں بغیر بلائے ہوئے سامعین فراہم ہو جاتے تھے۔اور وہیں پر ادباء دانشور حضرات اپنے کلام کو پیش کر کے لوگوں کے دلوں پر اپنے کلام کی چھاپ چھوڑ دیتے تھے۔اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ عربی ادب بازار اور میلے کا مرہونِ منت ہے۔

آج کل کے دور میں یہ ساری باتیں اوہامی معلوم ہوتی ہیں۔امن پسند شہری جنگی باتوں کو دلچسپی کے بجائے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اِس زمانے میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف و توصیف توجہ کا سبب بننے کے بجائے ہنسی مذاق کا وسیلہ بن کر رہ جائے گا۔اگر آج کے دور میں تلوار کی اقسام پر بحث کی جائے تو قارئین کیلئے یہ مضامین اجنبی محسوس ہوں گے۔آج کل ایسے مضامین کو لوگ پسند کرنے کے بجائے ایسے مضامین کو اعتبار سے ساقط جانتے ہیں۔

مولانا وحید الزماں صاحب نے ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر کتابیں مرتب کی ہیں۔جن کتابوں میں دورِ قدیم اور دورِ جدید دونوں تقاضوں کو مدنظر رکھ کر مرتب کی ہیں۔ان کی کتابوں میں دورِ قدیم کے زبان کی رعایت بھی موجود ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے تقاضے کو بھی پورا کرتی ہیں ایک طالب علم کے لیے اور بہتر امر اور کیا ہو سکتا ہے اسے ایک ہی کتاب میں دورِ قدیم اور دورِ جدید دونوں کی جھلک مل جائے اور دونوں دور کے حالات و ماحول سے واقف و آگاہ ہو جائے۔اور قارئین حضرات دورِ قدیم کے لب ولہجہ اور دورِ جدید کے لب ولہجہ میں فرق پیدا کر سکتے ہیں۔دوسری جگہوں پر بہت آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ زبان دورِ قدیم سے تعلق رکھتی ہے یا اس زبان کا تعلق موجود دور سے ہے۔

مولانا موصوف کی کتابوں میں جہاں شوکت الفاظ پائی جاتی ہے وہیں پر نحوی وصرفی قوانین کی رعایت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔نہ ہی کوئی نحوی وصرفی لغزش پائی جاتی ہے اور نہ ہی غرابت الفاظ پائی جاتی ہے۔تراکیب تعقید سے خالی ہیں۔عبارت پیچیدگیوں سے بالکل

عاری ہیں۔مولانا موصوف نے مفردات و مرکبات بالکل سادہ انداز وطریقے سے استعمال کیا ہے تاکہ طلاب کو پڑھتے وقت کوئی پریشانی و دشواری نہ پیش آئے۔عبارت میں نحوی وصرفی قانون کی ایسی رعایت کی گئی ہے کہ طلبہ عبارت کے ساتھ ساتھ ابتدائی نحوی وصرفی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں۔بہت ہی آسانی کے ساتھ کتاب کے مضامین ومفاہیم کو درک اور مغز مطلب کو بہت آسانی سے حاصل کرسکیں۔

خصوصیاتِ کتب:

مولینا وحید الزماں کی درسی کتابیں ہندوستان کے ماحول اور ہندوستانی ثقافت و کلچر کے مطابق ترتیب دی گئی ہیں۔ان کتابوں میں ایک خاص رعایت رکھی گئی ہے کہ ان کتابوں کے مطالعہ سے ایک قاری مختلف معلومات کے ذخیرہ سے مالا مال ہو جاتا ہے۔اور اسلامی شخصیتوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوجاتی ہے۔گذشتہ شخصیتوں کے واقعات اور حالات ان کے کردار ورفتار وگفتار کے بارے میں خاطر خواہ علم حاصل ہو جاتا ہے۔ سیرت کی کوئی الگ سے کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان ہی کتابوں کے ذریعہ سے طلبہ بزرگوں کے حالات وواقعات سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔اور اسی کے ساتھ زبان عربی کو بھی سیکھ لیتے ہیں۔ان کی کتابوں میں تاریخ سیر واقعات اور اخلاقیات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے طالب علم کو تمام درسی کتابوں کو پڑھنے کے بعد جہاں عربی زبان ولغات کے بارے میں معلومات حاصل ہوجاتی ہیں وہیں اخلاقیات اور اسلامی علوم اور سیر اصول وقواعد سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔

اگر چہ ہندوستان میں متعدد درسی سلسلے مرتب کیے گئے ہیں۔اور بے شمار اور لاتعداد درسی کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔مرتب ومولف نے اپنی امکانی کوشش یہ کی ہے کہ ایسی کتابیں ترتیب دی جائیں کہ طلبہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مورد استفادہ قرار پائیں۔سوائے انبیاء کرام علیہم السلام پیغمبروں کے جنکی عصمت ثابت ہے کائنات کا ہر انسان خطاونسیان کا پتلا ہے۔ہر

انسان سے غلطی کا امکان ہے۔اور کسی معلم کا کوئی شاہکار ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی طرح کی کمی اور نقص نہ پایا جائے۔اسی طریقے کی کتابیں بھی غلطی وخطا اور نقص سے محفوظ نہ رہ سکیں جدید کتابوں میں بہت سی درسی کتابیں مولفین نے مرتب کی ہیں۔جس میں جدید اسلوب اور نیا طرز دور جدید کے کلچر و ثقافت کی عکاسی نئے الفاظ کا کثرت سے استعمال موجود ہے لیکن موجودہ دور کی سبھی کتابوں میں سب سے بڑا عیب ونقص یہ پایا جاتا ہے کہ اس میں بھر پور اور مکمل تمرین ومشق طلبہ سے نہیں کرائی گئی ہیں۔اول تو بہت سی کتابوں میں تمرین ومشق کی طرف توجہ ہی نہیں دی گئی ہے اگر چند کتابوں میں تمرین کی طرف توجہ دی گئی ہے تو بہت معمولی۔جن تمارین سے طلباء کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے بس برائے نام مشق کر لیتے ہیں۔تمرین درسی کتابوں کی بنیاد ہوتی ہے۔بغیر تمرین کے کوئی بھی درسی کتاب کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔درسی کتابوں میں تمرین ومشق کا ایک خاص مقام و درجہ ہے۔اگر تمرین نہ کرائی جائے تو ممکن ہے کہ عربی زبان سے واقفیت حاصل ہو جائے اور کچھ معمولی تراکیب سے بھی آگاہی ہو جائے۔لیکن صحیح طریقے پر عربی زبان کی لغت سے واقفیت نہیں حاصل کی جا سکتی۔

تمرین ومشق کرانے میں طلباء کو دو قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔جیسا کہ ہر زبان اور لغت کی بنیاد اس کی گرامر اور قواعد ہوا کرتی ہے۔بغیر تمام قوانین وقواعد کی رعایت کیے ہوئے زبان تو بولی جا سکتی ہے لیکن نہ ہی اس کو ادب کی دنیا میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو سالم زبان کہا جا سکتا ہے۔اس لیے کہ جس میں قاعدہ وقانون کی رعایت نہ کی جائے اسے درحقیقت زبان ہی نہیں کہا جا سکتا ہے۔اور اہلِ فن وادب اس کو کوئی درجہ دینے کو تیار نہیں ہوتے جبکہ عربی زبان کی گرامر وقواعد تو شہرہ آفاق ہے اور تمام زبانوں سے وسیع ہے۔عربی زبان ہی کی صرف یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اس میں واحد تثنیہ وجمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ہر زبان میں صرف واحد وجمع کے صیغے ہوتے ہیں۔

عربی زبان دنیا کی وہ زبان ہے جس میں قواعد کی بہت سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی

ہے۔عربی زبان کے لیے جو گرامر پائے جاتے ہیں۔صرف گرامر کئی علوم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں اور عربی گرامر کے لیے کئی علوم معین کیے گئے ہیں۔جیسے علم نحو وصرف معانی و بیان اور علم عروض ولغت وغیرہ۔اگر چہ یہ تمام چیزیں عربی زبان کی مقدمات سے تعلق رکھتی ہیں۔اور عربی زبان کی مبادیات ہیں یعنی زبان عربی کا سیکھنا موقوف ہے ان چیزوں کے جاننے پر۔یہ تمام چیزیں مبادی و مقدمہ ہونے کے باوجود اپنی وسعت اور اہمیت کی بنیاد پر مستقل علوم کی شکل اختیار کر چکی ہیں اب اگر کوئی عربی زبان سیکھنا چاہتا ہے تو ان علوم کا جاننا اور ان علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔بغیر ان علوم کو حاصل کیے ہوئے کوئی عربی زبان ولغت سے واقفیت حاصل نہیں کرسکتا ہے۔

مبتدی حضرات کے لیے بالخصوص نحو وصرف کے قانون سے واقف ہونا ضروری لازمی ہے۔اسی بنا پر درسی کتابوں میں سے وہ کتابیں کامیاب یا مفید ثابت ہوتی ہیں جس میں زبان کے ہمراہ قواعد یعنی نحو وصرف کی بھی رعایت کی جائے۔وہی کتابیں کامیاب اور مقبول ہیں جن کتابوں میں ایسی تمرینیں موجود رہتی ہیں اور ایسی مشق کرائی جاتی ہے جن کے ذریعہ طلباء نحو و صرف کے قانون کو پہچان کرسکیں اور قواعد عربی کو پیادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوسکے۔اور عبارت میں عربی قواعد کی رعایت کرنے کا سلیقہ ولیاقت پیدا ہوسکے۔موجودہ کتابوں میں سب سے بڑی خامی ونقص یہی ہے کہ ان کتابوں میں طالب علموں سے تمارین ومشق نہیں کرائی جاتی ہے جس کی وجہ سے طلباء مضمون کتاب کو تو آسانی سے پڑھ سکتے ہیں لیکن اپنی طرف سے ایک بھی جملہ وضع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں اور اگر کوئی طالب علم عربی زبان میں دو چار جملہ وضع کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ان جملوں میں بے انتہا غلطیاں ہوتی ہیں......جدید کتابیں اگر چہ نئے قواعد و دستور کے مطابق لکھی گئی ہیں جدید نحوی وصرفی قانون کا لحاظ کرکے کتابوں کو ترتیب دیا گیا ہے لیکن تمارین ومشق نہ کرانے کی وجہ طالب علموں کی عربی زبان پر مکمل گرفت نہیں حاصل ہو پاتی ہے۔اور نہ ہی خاطر خواہ فائدہ ہی حاصل کرپاتے ہیں۔

اسی بناء پر درسی کتابوں کو مرتب کرتے وقت ان تمام باتوں کا لحاظ و خیال رکھنا ضروری ہے۔ مولانا وحید الزماں صاحب نے ان تمام نکات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنی تمام درسی کتابوں کو مرتب کیا ہے جو طالب علموں کے لیے مفید اور منفعت بخش ہو سکتی ہیں۔ اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے طلباء ان درسی نظام کو مکمل اور تمام کرنے کے بعد اتنی لیاقت اور صلاحیت پیدا کرلیں کہ غیر درسی کتابیں جو عربی زبان میں پائی جاتی ہیں ان سے استفادہ کرسکیں اور کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں۔ ان درسی کتابوں کو مکمل کرنے کے بعد طلباء کو دوسری درسی کتابوں کی احتیاج باقی نہ رہے۔ ابتدائی عربی سیکھنے کے لیے یہی کتابیں طالب علموں کے لیے کافی ثابت ہوں۔

مولانا موصوف نے اپنی درسی کتابوں میں ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور ہر درس کے بعد کتاب میں تمرین کا بھی خاص حصہ رکھا ہے جس میں قانون نحوی و صرفی کے رعایت کے لیے ہدایت کی ہے اور اساتذہ کو بھی بہت ہی شدومد کے ساتھ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ طلباء کے ذہن میں نحوی و صرفی قانون کی رعایت کو ذہن نشین کردیں اور طلباء کو جملہ سازی کی ہدایت کریں۔ تاکہ طلباء کے اندر جملہ سازی کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ اور یہی جملہ سازی آگے چل کر طلباء کو کلام سازی اور انشاپردازی میں مرکزی کردار ادا کرے گی۔ تمرین میں اشارہ کردیا گیا ہے بقیہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ ویسے ہی جملے طلبہ سے بنانے کے لیے ہدایت کریں۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو ترکیب درس میں استعمال کی گئی ہے صرف وہی ترکیب کے جملے طلاب سے بنوائے جائیں بلکہ مختلف قسم کی ترکیبوں کو جملہ سازی میں استعمال کیا جائے تاکہ طلباء ہر قسم کی ترکیبوں کو استعمال کرنا سیکھ جائیں۔ اور آگے چل کر ان کو دوسری کتابوں میں نئی تراکیب سے دوچار نہ ہونا پڑے کہ اخذ مطلب و معانی میں دشواری و پریشانی محسوس کریں۔ عام طور سے درسی کتابوں میں یہ خامی پائی جاتی ہے کہ ان کتابوں میں مطالب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بہ نسبت عبارت و تحریر کے عموماً درسی کتابوں میں مبتدی اور غیر مبتدی کا خیال

رکھا جاتا ہے۔ درسی کتابوں کے مرتب و تالیف کرنے والے آگے چل کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مبتدی حضرات کے لیے کتابیں مرتب کر رہے ہیں۔ درسی کتابوں کو مرتب کرنے والے عموماً مفہوم اور مضامین پر زیادہ زور اور توجہ دیتے ہیں اور اس امر کا زیادہ خیال رکھتے ہیں کہ جیسے درسی کتابوں کے اسباق ختم ہوتے جاتے ہیں مضامین میں بلندی آتی جاتی ہے۔ اور مفاہیم میں باریکی اور پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ علم و عرفان کی باتیں شروع کر دیتے ہیں منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی جانے لگتی ہے۔ اخلاق کے دقیق مسائل پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اخلاقیات کے اعلیٰ مسائل کے سلسلے میں بحث و تمحیص کی جانے لگتی ہے۔ اور آخر کتاب تک پہنچتے پہنچتے افلاطون اور یونانی فلسفہ کی خبریں شروع کر دیتے ہیں۔ سقراط اور ارسطو کے فلسفہ کی دھجیاں اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دنیا کے مختلف علوم پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔ دوسرے علوم کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں ایک طالب علم عربی زبان کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد ارسطو و افلاطون کے نظریات کو جان لیتا ہے۔ اخلاقیات و سیاسیات کے بارے میں علم حاصل کر لیتے ہیں۔ منطق و فلسفہ کے مسائل سے واقف ہو جاتے ہیں۔ دوسرے علوم کے بارے میں اچھی معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اصل شے یعنی زبان سے باخبری اس سے وہ بے بہرہ جاتا ہے۔ زبان سیکھنے کے اعتبار سے طالب علم کو واقعی کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو پاتا ہے نہ ہی ان کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کر پاتا ہے۔ یہ عیب ایسا ہے جو عربی زبان سیکھنے کے لیے مرتب کی گئی بیشتر کتابوں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ چیزیں (دیگر علوم و فنون) تو مادری زبان کے ذریعہ اور اپنی زبان کے توسط سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اصلاً ان مسائل کا تذکرہ درسی کتابوں میں نہ ہونا چاہئے۔ نہ ہی درسی کتابوں میں ان مفاہیم کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ درسی کتابوں میں ان مسائل کی ضرورت ہے۔ لیکن ثقیل اور دقیق مسائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ سادہ اور عام فہم عبارت میں وہ مسائل کو بیان کیے جائیں اور جملات

عبارات اور تراکیب میں قوانین نحوی وصرفی کی رعایت پر زیادہ زور دیا جائے تاکہ طلباء کو نحوی و صرفی قوانین کی اہمیت معلوم ہو سکے۔ مفردات اور مرکبات کے استعمال میں احتیاط کو بروئے کار لایا جائے تاکہ آسانی کے ساتھ طلباء علم معانی و بیان کی نزاکتوں کو سمجھ سکیں۔ اور آسانی کے ساتھ محاسن لفظی ومعنوی کو بروئے کار لاسکیں۔ اور ایسی عبارت انشاء کر سکیں جس میں نحوی وصرفی قانون کی رعایت کی جائے اور اس میں محاسن لفظی ومعنوی بھی پائے جاتے ہوں...... یہی وہ سب کمالات اور احتیاط ہوتی ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ اور وہی کتابیں قابل قدر ہوتی ہیں جن کے اندر یہ سارے کمالات پائے جاتے ہیں۔

مولانا وحید الزماں صاحب کی مرتب کردہ کتابوں میں یہ تمام کمالات بطور احسن پائے جاتے ہیں اور ان کتابوں میں تمام لوازمات اور قواعد وقانون کی رعایت پائی جاتی ہے۔ اگر مولانا کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھا جائے اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو قارئین کے اوپر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی کتابوں میں نحو وصرف معانی و بیان اور لغت پر کافی توجہ دی گئی ہے خاص کر نحوی وصرفی قوانین کی پابندی بدرجہ اتم کی گئی ہے اور موقع بموقع اور مناسب جگہوں پر ابتدائی قوانین واصول کی تشریحات بھی کر دی ہیں تاکہ مبتدی حضرات ابتدائی اور ضروری قانون سے واقف و آگاہ ہو جائیں۔ اور طلباء جملہ سازی میں کوئی وقت اور پریشانی نہ محسوس کریں اور بہت ہی آسانی کے ساتھ عربی زبان بولنا اور لکھنا سیکھ لیں۔ اور ان درسی کتابوں کے پڑھنے کے بعد اور ان کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلباء کو کسی دوسرے درسی نظام یا دوسرے سلسلہ دروس کو پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اور دوسری کتاب کے مطالعہ کی احتیاج باقی نہ رہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد طلباء کے اندر اتنی صلاحیت اور لیاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ عربی زبان بول اور لکھ سکتے ہیں اسی خوبی کی بنیاد پر مولانا موصوف کی درسی کتابیں مقبول خاص وعام قرار پائیں۔ اور طلباء کے درمیان اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔

عربی زبان اپنی وسعت کی بنیاد پر ساری زبانوں میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔ اس زبان میں گوناگوں قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ایک ہی معنی کے لیے کئی کئی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مجازات کا استعمال اس زبان میں بدرجہ اتم ہے' عربی زبان کا ادیب مجازات کے ذریعہ ہی اپنے کلام میں ندرت پیدا کرتا ہے۔ تشبیہات' کنایات اور تلمیحات اللہ کی پناہ! ایسی ایسی تشبیہات کہ عام انسان کے سمجھ سے پرے ہوتی ہیں اور علم سطحی ذہن کو اصل مطالب تک پہنچنے میں کافی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔

عموماً تشبیہ استعارہ کنایہ مجاز کا استعمال لکھنے والے کی قوت اظہار کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے اور موضوع کے اعتبار سے ان کا استعمال کیا جاتا ہے یہ بہت معمولی سا بیان ہے جس میں "لومڑی" کا تعارف کرایا گیا ہے لیکن اس تعارف میں سادگی بیان قابل تعریف ہے یہ چند سطریں ملاحظہ ہو......

"الثعلب حیوانٌ ذواشانٍ حادّةٍ ومخالب قویةٍ له قدرہ علی العدواسریع والقفز بخفةٍ ویسبح فی الماء بمهارةٍ هومعروف بذ کائه ودهائه ادراکه قوی مکرہ شدیدٌ وبذلك ینجو من الفخاخ التی یضعُها الانسان فی طریقه لصیده"[1]

تلمیحات کے سمجھنے کے لیے قاری کو تمام مستند ادبا اور دانشور کے کلام سے واقف ہونا ضروری ہے' جبکہ مبتدی حضرت کا دامن ان تمام کمالات سے خالی ہوتا ہے...... یہی وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے مبتدی حضرات درسی کتابوں میں وہ لطف و چاشنی محسوس نہیں کر پاتے ہیں' بلکہ وہ درسی کتابوں سے ان ہی وجوہات کی بنا پر دل برداشتہ ہو جاتے ہیں' اور ان ہی درسی خامیوں کی وجہ سے ایسی درسی کتابوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے' اور طالب علم کے لیے قابل استفادہ نہیں قرار پاتی ہیں' اور کچھ دنوں کے بعد نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ درسی کتابوں

---

[1] القراءة الواضحة۔ جز ثالث ص ۹۳

کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اول کتاب میں آسان الفاظ کا استعمال ہونا چاہیے۔ مفردات ایسے ہوں جو کہ عام فہم ہوں بلکہ انتخاب الفاظ میں ہر بات پر خاص توجہ دینی چاہیے کہ اوائل کے دروس میں ایسے الفاظ کا انتخاب ہو جو الفاظ انسانی زندگی میں روزمرہ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اور انسان کو ان الفاظ کی ضرورت بھی زیادہ پڑتی ہے طلبہ کے درمیان وہی کتاب بہت زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ جن کتابوں میں الفاظ کا انتخاب بہتر اور اچھا ہوتا ہے مولانا وحید الزماں کی درسی کتابوں میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کتابوں میں الفاظ کے انتخاب میں بہت باریک بینی سے کام لیا گیا۔ ایسے الفاظ کی کثرت اور زیادتی پائی جاتی ہے جن الفاظ کی روزآنہ کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے اور ان الفاظ کا استعمال بہت کم کیا گیا۔ جو الفاظ ثقیل ہیں یا کہ روزمرہ کی زندگی میں ان کا استعمال بہت کم ہے یا جن الفاظ کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسے الفاظ جو کہ طلباء کے غیر شنیدہ ہوں یا کہ ان کے سطح ذہنی سے بلند ہوں اگر چہ وہ الفاظ دنیائے ادب کے لیے شاہکار ہی کیوں نہ ہوں۔ ادبی دنیا میں ان الفاظ کی قدر و قیمت چاہے جتنی ہو لیکن اگر طلبہ کی سطح ذہنی کا حساب لگایا جائے تو ان کے رتبہ کے لحاظ سے یہ الفاظ غرابت کی منزل رکھتے ہیں، ہر ابتدائی کتابوں کو مرتب و جمع کرنے والے کو ان باتوں پر ضرور دھیان دینا چاہیے۔ مولانا وحید الزماں نے اس کا لحاظ و خیال رکھا ہے کہ مبتدی کے لیے کتاب اس کی ذہنی اور ان کی سطح سے ہم آہنگ ہوں اگر یہ ہم آہنگی نہیں ہوتی تو عام طور سے طالب علم اجنبیت محسوس کرنے کے سبب سے عربی زبان سے ہی متنفر ہو جاتے ہیں۔ اور کتابیں دیمکوں کی خوراک بن جاتی ہیں یا الماریوں کی زینت بن جاتی ہیں۔ بنیادی طور پر درسی کتابوں میں نہ اشتراک کی کثرت ہونی چاہیے اور نہ ہی مرادفات کی بہتات ہونی چاہیے۔ نہ ہی تشبیہات اور کنایات کا ایسا استعمال ہو کہ کلام میں تنقید پیدا ہو جائے کہ طالب علم کے سطح ذہنی سے کلام ماوراء ہو جائے۔ مولانا وحید الزماں کی تصنیفات ان عیوب سے عاری ہیں اور صرف ناگزیر حالات میں ہی اشتراک و مترادف کو استعمال کیا گیا ہے ہاں جہاں پر ضروری تھا وہاں

انہوں نے ترک بھی نہیں کیا ہے بلکہ اس انداز میں بیان کیا ہے وہ طالب علموں کو بار بھی نہ گزرے اور طالب علموں میں کلام کے اندر حسن پیدا کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے۔ مولانا موصوف کے یہاں تشبیہات کی کثرت نہیں ہے' یہ درست ہے کہ تشبیہ حسن کلام کے لیے زیور کا کام کرتی ہے لیکن مبتدی کے لیے سادگی میں جو حسن ہے وہ رنگینی میں نہیں اگر کہیں تشبیہ ہے تو دور از کار نہیں تا کہ طالب علم تشبیہ کو بھی سمجھ لے اور کلام کے معانی و مطالب سمجھنے میں اس کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے مجاز کے استعمال میں بھی احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اگر چہ کلام عرب میں مجاز ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ لیکن مبتدی حضرات کے لیے مجازات کے سمجھنے میں بہر حال مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے درسی کتب میں مجاز کے زیادہ استعمال سے بھی بہر حال پرہیز کرنا چاہیے یہ بات دوسری ہے کہ بلحاظ حسن کلام کے طالب علم کو معلوم ہونا چاہے تا کہ آگے چل کر انکو مجاز کا استعمال بالکل نئی چیز نہ معلوم ہو۔ مولانا موصوف نے اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ کلام میں مجاز کے استعمال کی کثرت نہ ہو اور تمام دروس صرف اور صرف مجاز پر منحصر نہ ہوں۔ پوری کتاب میں بہت ہی کم مجازات کا استعمال کیا گیا ہے اور مجازات میں بھی ہر بات کا خیال رکھا گیا کہ کلام میں قبح نہ پیدا ہو سکے۔ اور آسانی کے ساتھ طلباء معنی مجازی کا درک کر سکیں۔ اگر چہ اس بات کی طرف اکثر افراد جو کہ درسی کتابوں کو مرتب کرنے والے ہیں بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ ابتدائی کتابوں میں ضروری ہے کہ عبارات کی انشا میں ہر بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ ضمائر اور اسم اشارہ کی کثرت نہ پائی جاتی ہو۔ ضمائر کی کثرت اور اسم اشارہ کی زیادتی طلباء کو مطلب میں بہت زیادہ دشواری پیدا کر دیتی ہیں اور طلباء اصل مفہوم تک بہت ہی مشکل سے پہنچ پاتے ہیں۔ قدیم کتابوں میں ضمیر کے استعمال کو ایک فن سمجھا جاتا تھا جس کتاب میں جتنا زیادہ ضمائر کا استعمال ہوتا تھا۔ وہ کتاب ادب کی دنیا میں اتنی زیادہ بلند درجہ جانی جاتی تھی کہ ہر کتاب کا مصنف کوشش کرتا تھا کہ ہر فن کو ضرور آزمایا جائے تا کہ لوگ کتاب کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اسم اشارہ میں تو بہت سے لوگوں نے حد ہی کر دی ہے وہ

کتاب لکھ رہے ہیں مبتدی حضرات کے لیے اور اشارات بعیدہ سے کتاب کو مزین کرتے ہیں جس کی وجہ سے مبتدی عربی زبان کی چاشنی اور حلاوت کو محسوس نہیں کر پاتے اور مرتب حضرات کی یہ خواہش کہ کتاب تمام طبقات میں یکساں طور پر مقبول ہو کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتی ہے۔ اس کے برخلاف جن درسی کتابوں میں ضمائر اور اسم اشارات بعیدہ کو بہت کم استعمال کرتے ہیں یا صرف ناگزیر حالات میں ہی ایسی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کتابیں بہت جلد مقبول عام و خاص بن جاتی ہیں۔ مولانا وحید الزماں صاحب نے اپنی درسی نظام کی کتابوں میں ہر نکتہ پر خاص توجہ دی ہے اور ضمائر کو کثرت کے ساتھ استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ضمائر کے جگہ خود اسماء کا تذکرہ زیادہ کیا ہے۔ تاکہ طالب علم کو مطلب خیزی میں دشواری نہ محسوس ہو اور آسانی کے ساتھ اصل مطلب کو درک کر سکیں۔ اگرچہ ضمائر کی شناخت ضرور کرواتی ہے تاکہ کلام حد اطناب سے بھی خارج نہ ہو جائے۔ اور تطویل کی منزل پر پہنچ جائے مولانا کی درسی کتابوں میں ضمائر کی مشق خوب کرائی جاتی ہے تاکہ طلبہ کو ضمائر کے استعمال کرنے میں دشواری و پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اسماء کی جگہ جہاں ضمائر کا استعمال ناگزیر بن جاتا ہے وہ ضمائر کو بحسن وخوبی تصرف میں لاسکیں اور کلام کا حسن باقی رہے۔ اور مخاطب کے لیے کلام قبیح نہ محسوس ہونے پائیں۔ اور متکلم کے مافی الضمیر کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں اسی طریقے سے مولینا موصوف نے اشارات بعیدہ کو بہت کم اور شاذ و نادر ہی استعمال کیا ہے' تاکہ مبتدی حضرات آسانی کے ساتھ مطالب و مفاہیم درک کر سکیں۔ اگر بطور فن و ادب دیکھا جائے تو اشارات بعیدہ کا استعمال بہت اہمیت کا حامل ہے' اور ایسی کتابیں عوام کی نگاہ میں بے بہا قدر و قیمت کی مالک ہوتی ہیں۔ لیکن درسی کتابوں میں یا مبتدی حضرات کے لیے لکھی جانے والی کتاب ایسی نہ ہونی چاہیئے کہ مطلب برآری میں طلبہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ مولینا نے دشواری کو محسوس کر کے ہی ایسی کتابیں مرتب کی ہیں جن میں اشارات کی بہتات نہ ہو۔

مولینا ایک وسیع نظریہ کے مالک تھے ان نظریات کا اظہار ان کی کتابوں میں جا بجا نظر

آتا ہے۔ کبھی ان نظریات کا اظہار عمداً کیا ہے اور کہیں لاشعوری طور پر ہو گیا ہے لیکن اگر وہ اپنی کتاب میں عمومی مضامین کا تذکرہ کرتے تو بہتر ہوتا۔

مثلاً مولینا کے یہاں اسلامی شخصیات کا ہی تذکرہ ہے اب کوئی مسیحی یا غیر مسلم یا مولینا کے مسلکی عقیدے سے ہم آہنگ نہیں ہے تو اسے زبان کی تفہیم میں دشواری ہوگی اور وہ مولینا کی کتاب سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکے گا۔ بلاشبہ ان کی کتاب ندوہ یا دیوبند یا دوسری جگہ کے ان مدارس کے لیے لکھی گئی ہیں جہاں طلبہ اور طالبات صرف مسلمان ہیں۔ لیکن درس کتاب مرتب کرتے وقت اگر یہ لحاظ بھی رکھا جائے تو بہتر ہے کہ زبان سیکھنے کے لیے مذہب یا مسلک کی قید نہیں ہے[1] (میں اس سلسلہ میں اپنی زبان اردو کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گی کہ جس کے بولنے والے پڑھنے والے مختلف مذاہب اور ممالک کے لوگ ہیں اور یہاں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ رب کا شکر بھی ادا کرنا ہے کہ اس نے ہماری گائے بنائی ہے اور اندھیری رات کے جگنو کے چمکنے سے جو سماں پیدا ہوتا ہے اس کا بھی ذکر کیا جائے مختصر ترین لفظوں میں بصد ادب عرض کرنا ہے کہ درسیات کو زبان سیکھنے کی حد تک سیکولر ہونا چاہئے البتہ اعلیٰ تعلیمی مدارس کے لیے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ یہ بات صرف عربی کے لیے نہیں ہے بلکہ ہماری درسگاہوں میں جس موضوع یا ڈسپلن کی نصابی کتب ہوں وہ اسی نکتہ پر مبنی ہوں۔ یہ ایک نظریہ سوچنے کا ڈھنگ ہے اس سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

کتاب کے مضامین اگر وقت و حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں تو یہ کتاب سب سے زیادہ مورد استفادہ قرار پا سکتی ہے دور جدید کی کتابوں میں قدیم مضامین صرف تعارف کے حد تک تو بہت عمدہ رہتے ہیں لیکن کتاب کی اساس و بنیاد نہیں بن سکتے ہیں۔ اگر کسی زبان میں کوئی کتاب ترتیب دی جائے اور اس کتاب میں ایسے مضامین ہوں اور وہ عبارتیں نقل کی جائیں جو بہت زیادہ قدیم ہوں اور اس زبان میں یہ تحریرین تقریباً متروک ہو چکی ہوں یا

---

1. القراءة الواضحة نفحة الادب۔

متروک ہونے کے قریب ہوں تو کتاب کی وہ حیثیت اور افادیت ختم ہو جاتی ہے جس کے تحت یہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ کتاب ایک بامقصد کتاب نہیں بن سکتی ہے۔خاص کر عربی زبان تو اس بات کی متحمل ہی نہیں ہے اس لیے کہ قدیم زمانے کی روشن بول چال اور طریقہ تحریر میں کافی حد تک فرق پایا جاتا ہے۔قدیم زبان کی اسلوب تحریر دوسری تھی اور موجودہ روشس بالکل بدل ہوتی ہے موجودہ زبان میں جدید الفاظ بہت کثرت کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں عربی زبان میں کافی وسعت پیدا ہو چکی ہے قدیم زمانے میں یہ زبان خود اتنی وسیع دامانی کے باوجود اس زبان کو کوتاہ دامانی محسوس کی جانے لگی تھی اور عربی زبان سے تعلق رکھنے والے ادباء و دانشور محسوس کرنے لگے تھے کہ اگر اس زبان میں دوسرے زبانوں سے الفاظ مستعار نہ لیے گئے تو مافی الضمیر کا ادا کرنا مشکل ہو جائے گا۔خاص کر جدید ایجادات کے لیے عربی زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں مجبوراً دوسری زبانوں سے الفاظ لینے کی احتیاج آن پڑی تھی۔حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ادباء و دانشوروں نے دوسری زبانوں کے الفاظ کو عربی زبان میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ہاتف کی جگہ تلفن استعمال ہونے لگا۔اسی طرح ہزاروں اور لاکھوں الفاظ ہیں جن کو عاریتہً عربی زبان میں داخل کرلیا ہے اور اس کو عربی زبان میں باقاعدہ استعمال کیا جانے لگا اور عربی زبان کو بول چال میں شامل کرلیا گیا۔لغات پر بہر حال اثر پڑتا ہے اور زبان میں جدید الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔اور انسانوں کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اپنی زبان میں الفاظ کا اضافہ کیا جائے لیکن مولانا موصوف جو درسی کتابیں مرتب کی ہیں اس میں یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ اس میں شامل اکثر دروس واسباق پر قدیم کتابوں کا شائبہ ہے۔

مثلاً الف لیلہ سے بہت سے کہانیاں نقل کی گئی ہیں اور بہت سے تاریخی واقعات اسی طرح کے ہیں۔علاوہ ازیں درسی کتب میں جدید الفاظ و نئے لہجہ کا استعمال بھی بہت کم ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں ہندوستان میں عربی زبان پر لکھی جانے والی درسی کتابوں

میں اضافہ کا باعث بنیں ۔علاوہ ازیں عام طور سے ان ہی کتابوں کی شرح اور وضاحت کی جاتی ہے جو کتابیں طلباء کے سطح ذہنی سے بلند تر ہوتی ہیں ۔ان ہی کتابوں کی تشریح وتوضیح کی جاتی ہے جو کتابیں عام طور پر طلباء کے فہم سے بالاتر ہوتی ہیں ۔ان ہی کتابوں پر حاشیہ بھی لکھا جاتا ہے ۔اور اسی کتاب کی شرح لکھی جاتی ہے جو کتاب عام نہیں ہوتی ہیں اور اسی کتاب کا ترجمہ کیا جاتا ہے جو کتاب طلباء کے سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کتاب کوئی اور لکھتا ہے اور شرح کوئی اور لکھتا ہے ۔ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن کی شرح خود مصنف ومؤلف نے کی ہوں ۔اس کا نمونہ ہندوستان میں مولانا موصوف کی صورت میں دکھائی دیتا ہے ۔ پہلے خود درسی کتاب تحریر کی اور جب محسوس کیا طلباء کی سطح ذہنی سے بالاتر ہے اس کا خود ترجمہ کر ڈالا تاکہ طلباء اس سے بطور احسن استفادہ کر سکیں [1]

(۱) القرآءۃ الواضحۃ:

یہ عربی کتاب تین حصوں میں ہے ۔اول، ثانی، ثالث کتب خانہ حُسینیہ دیوبند یو۔ پی سے چھپی جزاول میں عربی زبان کے ابتدائی کلمات مع قواعد کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جملہ ۴۳ اسباق ہیں ۔ان میں سلسلہ وار دی گئی تمارین بھی خوب ہیں ۔زبان سہل ہے جیسے:

هذا مسجدٌ. بابُهٗ كبيرٌ. قِنَاؤهُ واسِعٌ. سَقْفُهٗ مُرتَفِعٌ [2] طالب علم کو بتدریج زبان سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

جز ثانی جملہ ۴۱ دروس پر مشتمل ہے ۔اس میں مختصر مضامین اسباق کی شکل میں دیئے گئے ہیں جیسے فی السوق ۔ الزمن ۔القطار ۔العبادۃ وغیرہ اسباق میں فعل ماضی فعل مضارع ضمائر ۔اسماء ۔اشارہ وغیرہ قواعد کو پیش کیا گیا ہے جیسے:

---

[1] نفحۃ الادب القراءۃ الواضحۃ وغیرہ۔

[2] القراءۃ الواضحۃ اول ص (۱۹)

راشِدٌ واقف امام مکتب التذا کر اخو راشد جالسٌ فی قاعةِ الانتظار[1]

جزء ثالث میں دروس کا معیار تھوڑا اونچا ہے جوکہ کتاب کی ترتیب کے لحاظ سے ضروری بھی ہے۔ جملہ ۶۰ اسباق ہیں۔ جو مختلف موضوعات پر سبق آموز ہیں۔ جیسے:

انشاط المدرستی۔ البترول۔ المراکب الارض۔ المدینة المنورة۔ اسرة الفلاح وغیرہ۔ واتخذہ الرسول ﷺ له دارًا وبلاسلام مرکزاً الی ان لحق بالرفیق الاعلیٰ وصارت حاضرة الخلافة الاسلامیة فی عهدا الخلفاء الراشدین.......

القراءة الواضحة کی اردو شرح بھی مولانا نے خود لکھی ہے۔ اور ہندوستان کے بیشتر مدارس میں یہ پڑھائی جاتی ہے۔

(۲) نفحة الادب:

یہ عربی زبان میں ہے۔ مکتبہ حسینیہ دیوبند سے چھپی۔ جو دیوبند کے سال سوم کے تلامذہ کے لیے ترتیب دی گئی۔ اس میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں جملہ ۹۱ دروس پر مشتمل ہے۔ جو مختلف عنوانات کے تحت ہے جیسے: نشید الصباح۔ الولد الأمین۔ شجاعة حمزہ بن عبد المطلب۔ فضل الکریم وغیرہ۔ تمام اسباق نصیحت آموز ہیں۔ اس کی شرح بھی آپ نے خود لکھی ہے۔ یہ کتاب نفحة الیمن کی جگہ پر آئی۔ قال إنه لم یفعل ذلك إلا لِقلةِ ماله[2]

(۳) جواهر المعارف:

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے لیکن اس کی صرف ایک جلد چھپ چکی ہے۔ اس میں مولانا نے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی معارف القرآن سے اہم علمی و تحقیقی مباحث کو کئی جلدوں میں "جواہر المعارف" کے نام سے مرتب کیا ہے۔

---

[1] القراءة الواضحة اول ص (۱۹)   [2] نفحة الادب۔ فضل الکریم ص ۶۵

(۴) سلسلة الدروس العربية:

یہ غیر مطبوعہ نایاب کتاب ہے جو مولانا نے دوران طالب علمی طلبہ کو عربی زبان سکھانے کے لیے لکھی تھی۔ اس کے اسباق دار العلوم کی دیواروں پر آویزاں کیے جاتے تھے۔

(۵) تقسیم الهند والمسلمون فی الجمهوریه الهندية:

یہ عربی ترجمہ ہے جو مولانا نے سعودی عرب سے واپسی پر ۱۹۵۶ء میں محمد احمد کا مرحوم ممبر پارلیمنٹ کی کتاب کا عربی ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بھی نایاب ہے۔

اس جائزہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولینا وحید الزماں میں یہ وصف بھی تھا کہ وہ اپنی شخصیت کو پس منظر میں رکھ کر اس بات کی کوشش زیادہ کرتے تھے کہ طلبہ کو فائدہ پہنچ سکے اور وہ درسی کتب سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

کتب کا جائزہ:

درسی کتاب کے علاوہ مولینا نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے کچھ اردو میں ہیں۔ یہاں مقصد زبان کی تدریس نہیں ہے بلکہ دینی مسائل کو اور اخلاقیات کے اہم نکات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں تو مولانا نے درسی کتابوں اور ان کی شرح اور لغات کے علاوہ اردو عربی میں بھی کتابیں لکھی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) انسانیت کا پیغام

(۲) اچھا خاوند/ اچھی بیوی

(۳) خدا کا انعام ...... رمضان/ ۱۳۷۷ھ

(۴) اسلامی آداب

(۵) شرعی نماز　　۱۸/ دسمبر ۱۹۵۰ء

(۶) آخرت کا سفرنامہ　(نایاب)

(۷) القراءۃ الواضحۃ: اول تا ثالث مع شرح (عربی۔اردو)　۱۹۶۶۔۱۹۷۰ء

(۸) نفحۃ الادب: مع شرح　(عربی۔اردو)

(۹) جواہر المعارف: اول دوم۔مع شرح　-　اکتوبر/۱۹۹۴ء دارالمولفین

(۱۰) سلسلۃ الدروس العربیۃ (عربی)۔　(نایاب)　-　۱۹۴۸۔۱۹۵۲ء

(۱۱) تقسیم الہندوالمسلمون فی الجمہوریہ الہندیۃ　(مترجم عربی)

(۱۲) القاموس الجدید　(اردو عربی)　۱۹۵۲۔۱۹۵۹ء

(۱۳) القاموس الجدید　(عربی اردو)　۱۹۵۲۔۱۹۵۹ء

(۱۴) القاموس الاصطلاحی　(عربی اردو)　۱۹۸۸ء

(۱۵) القاموس الاصطلاحی　(اردو عربی)　۱۹۸۸ء

(۱۶) القاموس الوحید　(عربی اردو)　مارچ/۲۰۰۱ء

(۱۷) القاموس الموضوعی　(نایاب/غیر مطبوعہ)

(۱۸) نخبۃ الاحادیث　(نایاب/غیر مطبوعہ)

ان میں اردو کتابیں رسالہ شمع کے بانی۔مدیر و مالک حافظ محمد یوسف دہلوی مرحوم کی فرمائش پر لکھی گئیں۔انہوں نے ایک مکتبہ دینیات بھی قائم کیا تھا اور اس مکتبہ سے اس طرح کی کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں۔حافظ محمد یوسف دہلوی بہت ہی زیرک اور کاروباری امور میں بے پناہ تجربہ رکھتے تھے اس لیے جو کتابیں انہوں نے شائع کرائیں ان کے پہلے ایڈیشن فوری طور پر فروخت ہو گئے۔

بقول عمید الزماں کیرانوی (چھوٹے بھائی) بھائی صاحب نے اصلاح معاشرہ اور

دینی خدمت کے پہلو کے لحاظ سے مختلف موضوعات پر تقریباً سو عنوانات پر تالیف وتحریر کا کام کیا تھا اور ہر ماہ ایک کتاب کا مسودہ تیار کر کے ارسال کرتے اور مینیجر صاحب موصوف فوری طور پر اس کا معاوضہ ادا کر دیتے۔ ان میں بعض کتابیں خاصی مقبول ہوئیں اور بعض مطبوعہ کتابیں تو عرصہ ہوا نایاب ہو گئیں۔

ان کی فرمائش پر لکھی گئیں یہ کتابیں دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں' (الف) اسلام کا تصور اخلاقیات اور (ب) فقہ چنانچہ ابتدائی تینوں کتابیں اخلاقیات سے متعلق ہیں۔

(۱) ''انسانیت کا پیغام'':

ایسی کتاب ہے جس میں ایک طرح سے حقوق و فرائض کا تذکرہ ہے۔ کتب خانہ حینیہ دیوبند یوپی سے چھپی۔ آج دنیا میں بے شمار انسانی حقوق Human Rights کمیشن بنے ہوئے ہیں اور ہیومن رائٹس کا چرچہ صبح و شام ہوتا ہے اور سب سے زیادہ وہی لوگ چرچا کرتے ہیں جو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

مولانا نے کتاب کے آغاز میں حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلے سرکار دوعالم ﷺ کے ان حقوق کا ذکر کیا ہے جو ہر امتی پر لازم اور فرض ہے' اس میں اطاعت' فرمان برداری' عدم مخالفت' اتباع سنت' احترام ازواج مطہرات' ایذا نہ دینا استہزا اور مذاق اڑانا' حمایت ونصرت' درود وسلام' زیارت قبر مبارک' جھوٹ بات کو آپ کی طرف منسوب نہ کرنا' ادب میں افراط وتفریط نہ کرنا۔

یہ ساری باتیں بہت اچھی ہیں لیکن اس کی زمرہ بندی دو طرح سے ہونی چاہئے تھی یعنی ایک حصہ میں مثبت جیسے اتباع اور احترام ازواج' حمایت ونصرت' درود وسلام وغیرہ ہوئے اور دوسرے حصہ میں منفی رخ سے بحث کی گئی ہوتی جیسے اسہتزا کرنا' منسوب نہ کرنا وغیرہ۔

جہاں تک اتباع سنت کا سوال ہے یہ وجوب کی غزل ہے اس لیے کہ قرآن حکیم کے

ارشادات نظری Theory ہیں اور حضور کی سنت کا (Practical) کا اتباع کرنا عملی ہے اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ اگر ان حقوق کی اہمیت پر بھی کچھ سطریں ہوتیں تو خوب ہوتا ......!

دوسرے عنوان میں انبیاء کے حقوق اور اس کے بعد علماء کے حقوق بیان کئے گئے ہیں اور علماء کے بعد حقوق نفس ہیں اور اس میں ایک اچھے انسان کو زندگی گذارنے کے لیے جن اصولوں پر عمل کرنا چاہیے وہ بتائے گئے ہیں۔ اس کے بعد حاکم کے حقوق بتائے گئے ہیں اور یہاں مولانا نے آیت شریفہ "اطیعو اللہ واطیعو الرسول وأولی الامر منکم" کے حوالے سے حاکم کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے اور بغاوت وشور وشر اور فساد سے روکا ہے۔[1] یہاں بجا طور پر مولانا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ صرف اسی حاکم کی اطاعت کی جا سکتی ہے جو اسلامی اصولوں کے مطابق حاکم ہوا ہو اور اس کے مطابق کام کرتا ہو ورنہ ظالم جور وجب مسلمانوں کے حقوق کو غصب کرنے والا' بندگان خدا پر ظلم کرنے والا' اور فرعون کی طرح فساد پھیلانے والا قابل اطاعت نہیں ہو سکتا' فرض کیجئے کہ حاکم شراب کا حکم دیتا ہے اور قمار کو جائز قرار دیتا ہے اور کھلے عام محرمات کے سلسلہ میں غفلت برتتا ہے تو ایسے حاکم کی اطاعت نہیں ہو سکتی' بیشک پروردگار نے "لا تفسدوا فی الارض" کہا ہے لیکن اس کے ساتھ شرک کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے بندوں کو اس سے روکا ہے۔ اب جو حاکمان جور ہیں اگر وہ شرک پھیلاتے ہیں تو کیا ہوگا؟ مولینا سے یہاں تسامح بھی ہوا اس لیے کہ حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی وحضرت مولینا محمود الحسن دیوبندی نے اپنے دور کے حاکمان کے خلاف بغاوت کی تھی چونکہ مولینا نے مطلق طور سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ حاکم کے احکام کی اطاعت کی جائے اور اسی لیے حضرت مولینا سے اختلاف کرنے کی جرأت کی گئی۔[2]

مولینا نے حاکم پر رعایا کے حقوق بیان کرتے ہوئے دو پہلو پیش کئے ہیں مثلاً صفحہ پینتالیس پر صحیح طور پر فیصلہ نہ کرنے کی صورت میں حکم کا مردود ہونا اور حاکم بننے کی خواہش نہ

---

[1] خدا کا انعام۔ ص ۱۱۔ پیش لفظ وحید الزماں کیرانوی　　[2] انسانیت کا پیغام۔ ص ۳۸'۴۵

کرنا' پھر اس کے بعد والدین کے حقوق' اولاد کے حقوق' شوہر کے حقوق' بیوی کے حقوق' ہمسایہ کے حقوق مہمان و میزبان کے حقوق و مسائل۔ غلاموں کے حقوق کا تذکرہ کیا ہے' ان میں بعض حقوق و فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق حسن معاشرت سے ہے جیسے مہمان و میزبان وغیرہ کے حقوق اور بعض شرعی حیثیت رکھتے ہیں جیسے میراث یا والدین کے حقوق' اگر ان کی بھی زمرہ بندی ہوتی تو بہتر تھا۔

اس طرح ان تمام باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اسلامی آداب میں ضروری ہیں اور استدلال کے طور پر قرآن کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ جہاں عورت کے حقوق بیان کئے گئے ہیں وہ اگر زوجہ کے حقوق کے ساتھ ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

زبان کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ صفحہ ۸۳ پر نکاح کرنا کے ذیلی عنوان کے تحت ''درج ہے!'' مسلمانوں تم میں جو رانڈ ہوں ان کا اور اپنے غلاموں اور باندیوں میں نیک بختوں کا نکاح کر دو[1]۔ یہاں لفظ رانڈ غیر فصیح اور غیر سلیس ہے اردو محاورہ میں رانڈ بیوہ عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ رنڈوا اس مرد کو کہتے ہیں جس کی بیوی مرگئی ہو' عموماً یہ لفظ اشراف میں مستعمل نہیں ہے یہاں کنوارے اور بے نکاح کا لفظ استعمال ہو سکتا تھا' صفحہ ۱۰۶' ۱۰۷ پر عنوانات سے مندرجہ عبارت میل نہیں کھاتی۔ ۱۰۷ کی عبارت ۱۰۶ پر اور ۱۰۶ کی عبارت ۱۰۷ پر ہونی چاہئے اس طرح صفحہ ۱۲۰ پر لکھتے ہیں' 'اس پاپ میں مبتلا ہونا'' جو فضا عبارت کی ہے اور جن احکامات کا شرع کی روشنی میں مولینا بیان کر رہے ہیں اس میں لفظ پاپ غیر فصیح ہے۔ یہاں گناہ ہی بہتر تھا۔ اس لیے کہ بعد میں آیتِ شریفہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں چونکہ حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے اس لیے راقمۃ الحروف کے خیال میں پہلے حقوق اللہ کا عنوان قائم کر کے عبادات کا تذکرہ ہونا چاہئے تھا۔ اور پھر فی العباد کا' جہاں تک حق النفس کا سوال ہے وہ صفحہ ۲۹ پر ہے اسے آخیر میں ہونا چاہئے[2]۔

---

[1] انسانیت کا پیغام۔ ص ۸ [2] انسانیت کا پیغام۔ ص ۱۰۶۔ ۱۰۷/ ۲۹۔ ۱۲۰

(۲) اچھا خاوند/ اچھی بیوی:

اس کتاب میں مولانا نے میاں بیوی کے حقوق و فرائض پر روشنی ڈالی ہے۔ اور بہت سہولت بخش طریقے سے ہر دو کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے۔ صحت مند معاشرہ کی بنیاد صحت مند خاندان سے ہی پڑتی ہے۔ اچھے اور مطمئن خاندان کے لیے ضروری ہے کہ خاوند اور بیوی اپنے اپنے حدود میں رہ کر پہلے اپنے فرائض ادا کریں پھر حقوق کے متقاضی بنیں۔ ہوتا یہ آرہا ہے کہ شوہر تو یہ امید کرتا ہے کہ ہر عورت بی بی فاطمۃ الزہراؓ کی سی صفات کی حامل ہو۔ لیکن خود حضرت علیؓ جیسا کردار نہیں نبھا پاتے۔ نتیجہ تعلقات میں دراڑ اور رشتوں میں تلخی آجاتی ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے دونوں کو ان کا بھولا سبق یاد دلایا ہے۔

اصل کتاب تو مہیا نہ ہوسکی۔ زیراکس مل جائے اس پر لکھا جارہا ہے۔

(۳) خدا کا انعام:

اخلاقیات کا سب سے بڑا اصول جو تمام مذاہب اور ہر طرز فکر میں تسلیم شدہ ہے وہ صرف ایک جملہ ہے یعنی:

"جو کچھ اپنے لیے نہ پسند کرتے ہو اسے دوسروں کے لیے پسند نہ کرو"

اسی بنیاد پر ہر زبان میں اخلاقیات پر ضخیم کتابیں لکھی گئیں اور فلسفہ کی ایک شاخ کا نام ہی Ethics یا اخلاقیات رکھا گیا۔ اس سلسلہ میں امام غزالی کی "احیاء العلوم" دنیاوی کتابوں میں اخلاق فاضلہ کے اکتساب کا سرچشمہ ہے' مولینا وحید الزماں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے اور تمہید میں اپنے ماخذات کی فہرست میں اس کا ذکر بھی فرمایا ہے' ان کی دو کتابیں "خدا کا انعام" اور اسلامی آداب دراصل اسی ایک موضوع یعنی اخلاق پر منحصر ہے چنانچہ "خدا کا انعام" مذہبی زاویہ نظر سے اخلاقیات کی تعبیر پیش کرتی ہے' مولینا نے ۴۷ عنوانات کے تحت اللہ تعالیٰ کی نعمات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان انعامات میں ایک مومن کی صفات گنوائی گئی ہیں یعنی

جو فروع دین پر مکمل طور سے عمل کرتا ہو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا تفصیلی بیان ہے، یہ انعامات پوری شرائط کے ساتھ ہیں اور ان کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے قرآن شریف سے استدلال کیا گیا ہے یوں اگر سچ پوچھیے تو اس کائنات میں ہر شئے اللہ کا انعام ہے یہاں تک کہ زندگی کی ہر سانس اور سارے سماجی روابط خدا کا انعام ہیں یہ بھی اس کا انعام ہے کہ اس نے ہمیں اچھی شکل وصورت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ہمیں عقل وشعور کی دولت سے نوازا ہے اور ہمارے فائدے کے لیے دوسری مخلوقات بھی خلق کی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس دنیا میں قیام کی مدت اور پھر اس دنیا سے سفر آخر یعنی موت بھی خدا کا انعام ہے اگر انسان غور کرے تو جو کچھ اللہ کی طرف سے ہے وہ اپنے بندہ پر فضل وکرم ہے اور یہی اس کا انعام ہے۔

مولینا نے ان نکات پر روشنی نہیں ڈالی لیکن اس کتاب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ عام ذہنی سطح رکھنے والا ہر مسلمان اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اعمال صالحہ کے ذریعہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے اور عبادات میں ہر رکن کی جو فضیلت ہے اس کو بڑے حسن وخوبی کے ساتھ...... ترغیب المومنین بنا کر پیش کیا گیا ہے، زبان کے سلسلہ میں یہ لکھے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ مولینا اکثر اہم ترین مسائل کو بڑی سلاست سے بیان فرماتے ہیں مثلاً بندگی اور عبادت کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"بندگی اس چیز کا نام ہے کہ آدمی اپنے مالک آقا کو سچے دل سے اپنا آقا سمجھے ہر وقت اس کی اطاعت کرے۔ کسی کام میں اس کی خلاف ورزی نہ کرے" [1]

دراصل اس مختصر سے جملہ میں عبدیت کا مکمل مفہوم پنہاں ہے، مولینا نے آخری صفحات میں اسلامی اخلاقیات کے کچھ ایسے اصولوں پر روشنی ڈالی ہے جو حقیقی معنوں میں انسانی اعمال کے مجموعی رخ سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً توبہ......

توبہ ایسا عمل ہے جو ہر انسان کر سکتا ہے اور دراصل توبہ کی منزل کی عظمت اور بلندی اس

---

[1] خدا کا انعام۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص ۵۲

سے ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن حکیم نے اس وصف کو ایک سورہ کا سرنامہ قرار دیا ہے۔ [1]

یہ بات ہر معلم اخلاق جانتا ہے کہ کسی بھی غلطی کی اصلاح کے لیے بہترین عمل توبہ کا ہے سگریٹ نوشی حرام نہیں ہے لیکن مضر ہے اگر ترک کرنا چاہے تو یہ اس سے توبہ ہے' توبہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس کام کو ترک کرے پھر اسے نہ کرے۔ اس طرح مولینا نے صبر کی فضیلت بیان کی ہے۔ صبر کے سلسلہ میں وہ آیت کریمہ بھی ہوتی تو بہت بہتر ہوتا جس میں کہا گیا ہے کہ "یاایھا الذین آمنو ا استعینو ابالصبر والصلوۃ" تو اور بہتر ہوتا' صبر کی تعریف بھی مولینا نے بہت ہی عمدہ طریقہ سے کی ہے۔ لکھتے ہیں جس چیز کو صبر کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو دین کا پابند بنا کر رکھے۔ [2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر پابندی عائد کرنا ایک اختیاری عمل ہے اور اسی لیے صبر مجبوری کا نام نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں' اللہ کی راہ میں اس کی رضاء کے حصول کے لیے اپنے کو ڈھال دینا صبر ہے اور اس بناء پر یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ صبر انسانی کمالات میں حقیقی اصفیا کا نام ہے' اور اسی بناء پر حدیث شریف میں آیا ہے کہ "صبر نصف ایمان ہے" جب بھی انسان کسی طرح کی مصیبت میں مبتلا ہو تو اسے صبر و صلوٰۃ کی امانت سے مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

انسان کے اندر جو بھی صفات ہوتی ہیں اسے حضرت مولینا نے خدا کا انعام قرار دیا ہے چنانچہ انسانی صفات میں صدق اور شکر اور اکل حلال کو صبر اور توبہ کے ساتھ جگہ دی گئی ہے بے شک یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر انعامات ہیں۔

ظاہر ہے کہ اللہ کے تمام انعامات کے بعد شکر واجب ہے اس لیے کہ اگر مزاج شکر بنتا ہے تو سماج میں بھی انسان میں خود بخود بے شمار خوبیاں اور محاسن پیدا ہو جاتے ہیں [3] اور خالق کا

---

[1] خدا کا انعام۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص۔ ۱۱۴ [2] خدا کا انعام۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص۔ ۱۲۱
[3] جیسا کہ کہا گیا ہے کہ "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ"

شکر گزار بندہ دنیاوی سماج میں سعادت مند بیٹا فرض شناس بھائی قدر شناس شہری اور احسان شناس فرد ہو جاتا ہے... مولینا نے ان تمام گوشوں پر حسن وخوبی اور عام فہم انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب کتب خانہ حسینیہ دیوبند یوپی سے چھپی۔

(۴) اسلامی آداب:

ان کی کتاب "اسلامی آداب" بھی اخلاقیات کے ضمن میں شمار کی جائے گی اس میں کوئی شک نہیں کہ جن اخلاق وعادات کا تذکرہ مولینا نے کیا ہے ان میں سے بیشتر ایسے ہیں کہ جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم کو بھی اختیار کرنا چاہئے اور اگر اس کے یہاں ہے تو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ مثلاً سلام کرنا، صدق، ایفائے وعدہ، شرم وحیا، احتیاط وہوشیاری، نرم مزاج، کشادہ دلی، زبان کی پاکیزگی، شجاعت، تواضع یہ ایسی خصوصیات ہیں جو انسانی اقدار میں شامل ہیں۔ مولینا نے ان خصوصیات کی تعریف بھی کی ہے جو بہت ہی مناسب ہے مثلاً سچائی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"اپنے علم واعتقاد اور یقین کے مطابق کوئی بات کہی جائے تو اسے صدق کہتے ہیں" [۱]

"حیا انسان میں ایک ایسی قوت کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ خیر کی طرف بڑھتا ہے" [۲]

صبر کی وہی تعریف درج ہے جو "خدا کی انعام" میں بیان کی گئی ہے:

احتیاط اور ہوشیاری کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"ایک مومن کی شان یہ بھی ہے کہ "نہ کسی کو دھوکہ دے اور نہ کسی سے دھوکہ کھائے" [۳]

نرم مزاجی کے سلسلہ میں تحریر فرمائے ہیں کہ:

"ایک سچے مومن کے اندر سختی اور بے رحمی کا مادہ ہرگز نہیں ہوسکتا" [۴]

زبان کی پاکیزگی کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

۱، ۲، ۳، ۴۔ اسلامی آداب۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی۔ ص ۲۴۔ ۳۳۔ ۴۷

"اگر آدمی کے پاس زبان نہ ہوتی تو اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ ہوتا"[1]

شجاعت کی تعریف اس سے بہتر الفاظ میں ممکن نہیں ہے لکھتے ہیں:

"مصیبت اور خطرہ کے وقت انسان کا نہ گھبرانا اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا نام شجاعت ہے" [2]

مولینا نے عفت و عصمت کی تعریف بلاشبہ اس طرح کی ہے کہ بذات خود انتہائی قابل تعریف ہے لکھتے ہیں:

"دنیا میں جو نعمتیں اللہ نے انسان کو دی ہیں خواہ وہ جسمانی ہوں یا روحانی ان کے استعمال میں اعتدال کا نام عفت ہے"۔[3]

یہ ساری تعریفیں مجردات کی ہیں اور مجردات (Abstract) کی تعریف کرنا اور اس طرح تعریف کرنا کہ وہ عام فہم بھی ہو اور منطقی شرائط کو بھی پورا کرے بہت مشکل کام ہے' مولینا کا یہ ہنر ہے کہ انہوں نے منطقی اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا اور اس کا لحاظ بھی رکھا کہ جو تعریف وہ کر رہے ہیں کہ قرآن و حدیث سے متعارض نہ ہو۔

کہیں کہیں مولینا کی گرانقدر رائے پر اضافہ کیا جا سکتا ہے مثلاً صفحہ[30] پر تحریر فرماتے ہیں:

"زبان سے کسی بات کا اقرار کرنا وعدہ اور عہد کہلاتا ہے"[4]

یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ وعدہ شخصی ہوتا ہے یعنی میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی خدمت میں فلاں تاریخ کو نذرانہ پیش کروں گی۔

لیکن اگر اس وعدہ میں اللہ کی گواہی شامل ہو جائے تو پھر یہ عہد ہو جاتا ہے وعدہ وفا نہ کرنا اخلاقی کمزوری ہے عہد کا پورا نہ کرنا گناہ ہے۔

اس طرح غیرت کی تعریف میں تحریر کرتے ہیں:

---

[1]، [2]، [3]، [4] اسلامی آداب۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی ص۔ ۵۱۔ ۵۵۔ ۵۷۔ ۶۰۔ ۳۰

''عزت وناموس کے تحفظ اور اس کی بقاء کے لیے انسان میں غیظ وغضب کا جو جوش ہوتا ہے اسے غیرت کہتے ہیں''[1]

راقمۃ الحروف یہ عرض کرنا چاہتی ہے کہ غیظ وغضب اور جوش کا تعلق اضطراری عمل سے ہے،اور اسلام ارادہ اور اختیار کا مذہب ہے غیرت کا احساس صرف انفرادی نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی بھی ہوتا ہے۔غیرت کا اصل تعلق مذاہب اور پشیمانی سے ہے۔جب بھی قانون اور حدود الٰہیہ متاثر ہوں انسان کو غیرت آنی چاہیئے۔

میانہ روی کی تعریف بھی بہت واضح نہیں ہوسکی حالانکہ یہ کہا گیا ہے کہ ''خیر الامور أوسطھا'' مگر یہ اوسط کیا ہے؟ کیا ریاضی کے فارمولے کے اعتبار سے سترہ رکعات کا اوسط نکال لیا جائے یا تیس روزہ کا اوسط یا کسی کو قتل ہوتا دیکھ کر یوں میانہ روی اختیار کیا جائے کہ آدھا قتل کرنے دیں اور آدھا چھوڑ دیں۔

دراصل میانہ روی کے معنی ہیں کہ نفاذ قانون الٰہی میں انسان کی فطری کمزوریوں کا لحاظ وخیال رکھا جائے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ اجتماعی فضائل واخلاق سے تعلق رکھتا ہے اس میں عدل و انصاف،رازداری،عیب پوشی،رحم وشفقت،کسی کو تکلیف نہ پہنچانا،امر بالمعروف،نہی عن المنکر مظلوم کی امداد وغیرہ ہیں ان میں سفارش کرنا بھی غصہ پر قابو پانا وغیرہ کو بھی شامل کیا ہے۔

جو باتیں گذشتہ سطور میں کہی گئیں وہ ان باتوں پر بھی صادق آتی ہیں مولینا نے استدلال کے ساتھ سادگی بیان کا لحاظ رکھتے ہوئے ان پر روشنی ڈالی ہے۔البتہ یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ خصوصیات کس اعتبار اور نہج سے اجتماعی فضائل واخلاق کے زمرہ میں آتی ہیں اور ابتدائی اوصاف میں کیوں اجتماعیت نہیں ہے۔اسلئے کہ جن اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب شخصی بھی ہوسکتے ہیں اور اجتماعی بھی ہوسکتے ہیں،اور جنہیں اجتماعی کہا گیا ہے وہ شخصی بھی ہوسکتے ہیں۔

---

[1] اسلامی آداب۔مولانا وحید الزماں کیرانوی ص۔۷۔۳۔۴۲

اس طرح صفحہ ۱۰۱ سے مولینا نے آداب زندگی کے تحت ۴۰ آداب گنائیں ہیں آداب مجلس میں ۱۶ اور آداب دستر خوان میں سترہ آداب ضیافت اور مہمان نوازی میں ۹ اور مہمان کے آداب میں ۱۶ نکات بیان کئے گئے ہیں۔

اس طرح آداب ملاقات اور آداب لباس، آداب صحت، آداب سفر پر روشنی ڈالی ہے۔ آداب جہاد کے تحت مولینا نے صرف ۸ نکتے بیان کئے ہیں جس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور تفصیل چاہتے تھے اس طرح آداب نظم ونسق بھی اور تفصیل چاہتے تھے۔ حسد، غصہ، کبر، تعصب، مکروفریب، کینہ، بخل، لالچ، جاہ طلبی وغیرہ پر بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ تھوڑی اور تفصیل کے ساتھ ان پر اور روشنی ڈالی گئی ہوتی تو بہت بہتر ہوتا۔

یہ تمام کمزوریاں مسلمان یا غیر مسلم سبھی کے لیے ضرر رساں ہیں مولینا نے انہیں اسلامی آداب کے دائرے میں رکھ کر یہ بھی سمجھا دیا ہیکہ اسلام کا دائرہ عمل اور دائرہ کردار کتنا وسیع ہے۔ اور ایک سچا مسلمان ہی اچھا انسان ہوسکتا ہے اقبال نے جب یہ کہا تھا:

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ

گفتار کا وہ غازی تو بنا
کردار کا غازی بن نہ سکا

ان کا مطلب یہی تھا کہ مسلمانوں کو ان صفات سے آراستہ ہونا چاہئے جو جہاد زندگانی میں مردوں کی شمشیریں ہیں۔ اور ان برائیوں سے اجتناب ضروری ہے جو راہ مستقیم میں گڑھے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی کتب خانہ حسینیہ دیوبند یوپی سے چھپی۔

(۵) شرعی نماز:

نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کا وجود آدم علیہ السلام کے وجود سے ہے، کسی بھی نبی کی

شریعت اس اہم ترین عبادت سے خالی نہیں باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ "اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" یعنی بلاشبہ نماز مومنین پر فرض ہے جن کے اوقات مقرر ہیں۔ صلاۃ کے معنی دعا کے ہیں اور شریعت میں اس عبادت کا نام ہے جو مخصوص اعمال و اقوال کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا! "بھلا و بتاؤ اگر کسی کے دروازہ پر نہر ہو اور وہ اس سے دن بھر میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن میں ذرا بھی میل رہ جائیگا؟ لوگوں نے کہا کہ:

ذرا بھی میل نہیں باقی رہے گی! تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "پانچ نمازوں کی مثال ایسی ہی ہے جن سے تمام خطائیں مٹ جاتی ہیں"[1]

مولینا موصوف نے دین کے اس اہم رکن پر ایک مختصر مگر جامع اور عام فہم کتاب "شرعی نماز" کے نام سے تحریر فرمائی۔ جس میں نماز سے متعلق ہر طرح کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آسان اسلوب میں اہم پیچیدہ نکات بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب اسلامی تبلیغی مشن ۴۱۹ مٹیا محل۔ دہلی سے چھپی ہے۔

اس کتاب میں اولاً مولینا نے نماز کی فضیلت قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کی ہے پھر اس کے اقسام اور ادا کرنے کے طریقے، پاکی کا ذکر، نماز کے اوقات وارکان مکروہات ومفسدات مبطلات، اذاں واقامت کے مسائل، امامتیں واقتدار کے مسائل، احکام مسجد، مسائل جمعہ اور آخر میں نماز کے بعد کے وظائف وادعیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولینا کی یہ کاوش عام فہم زبان میں دین کے عظیم رکن نماز کے بارے میں ضروری مسائل واحکام تحریر کر کے مصلی کو پیش آنے والے روزمرہ مسائل کے لیے مطولات اور بڑی بڑی کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے نجات دلادی۔ البتہ مضامین کی ترتیب میں پہلے نماز کی شرائط پاکی کا بیان اور وضو تیمم وغیرہ کے مسائل واحکام بیان کئے

---

[1] صحيح البخاری۔ باب الصلوٰة

جاتے تو بالترتیب معلوم ہوتا کیونکہ جب تک نماز کی شرائط اور وضو کے طریقوں کا علم نہ ہوگا نماز پڑھنے کا طریقہ معلوم کر کے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

مولینا اپنی کتاب میں بہت سہل اور عام فہم زبان کا استعمال کیا اور دقیق و باریک مسائل کو سہل و آسان بنا کر پیش کیا ہے جیسا کہ صفحہ ۲۹ پر نجاست حقیقی و حکمی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نجاست حقیقی وہ کہلاتی ہے جو دکھلائی دیتی ہے نجاست حکمیہ وہ کہلاتی ہے جو دیکھی نہ جاسکے"[1]

اس طرح صفحہ ۳۱ پر "وضو کی سنتیں" عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

"جن چیزوں کے چھوٹ جانے سے وضو تو ہو جاتا ہے مگر کم درجہ کا ہوتا ہے ان کو وضو کی سنتیں کہتے ہیں"[2]

مولینا مندرجہ بالا تعریفات بڑے فصیح و بلیغ انداز سے کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ قاری آسانی سے سمجھ سکے اسی کی کوشش کی ہے۔

صفحہ ۳۰ پر مولینا فرماتے ہیں:

"دھونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر عضو پر اتنا پانی ڈالا جائے کہ وہ ٹپکنے لگے کم سے کم مقدار یہ ہے کہ دو قطرے ٹپک جائیں۔ اگر پانی بالکل نہیں ٹپکا تو اس کو دھونا نہیں کہا جائے گا"[3]

دھونے کی تعریف کے سلسلے میں جس آسانی سے اس باریک اور اہم مسئلہ پر مولینا نے روشنی ڈالی ہے اس سے بجا طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ایک عالمگیر شہرت کے مالک ادیب ہی نہ تھے بلکہ مسائل فقہیہ پر بھی آپ کی نظر تھی۔

مولینا میں اللہ نے یہ خاص جوہر ودیعت کیا تھا کہ بڑے سے بڑے مسائل خواہ وہ کتاب سے متعلق ہوں یا خارجی امور سے مولینا ان کا حل ایسا نکالتے تھے گویا کہ ان کو ان امور

---

[1]، [2]، [3] اسلامی آداب۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی۔ ص ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱

میں مہارت تامہ حاصل ہو۔

مولینا کی یہ تصنیف (شرعی نماز) ہر اس شخص کے لیے جو دین و ایمان سے تعلق رکھتا ہو ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ جو بھی شخص اپنی نماز بالکل ویسی ہی ادا کرنا چاہتا ہے جیسی شریعت کو مطلوب ہے تو بلا شبہ یہ کتاب اس کے لیے کافی ہے دیگر کتابوں کی طرف رجوع کی کوئی خاص ضرورت نہیں شرعی نماز کے افادہ سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ مولینا کو اجر جزاء سے نوازے کہ نماز جیسے دین کے عظیم رکن پر ایک آسان اور سہل الفہم کتاب تصنیف فرمائی۔

مولانا کی خودنوشت:

حضرت مولانا کے اردو کے تعانیف کے ضمن میں ان کی خودنوشت کا تذکرہ ضروری ہے حالانکہ یہ خودنوشت نہ تمام ہے اور مولانا نے اس کے لیے جو منصوبہ تیار کیا تھا اسکے مطابق نہ لکھ سکے انہوں نے ۱۰ دس ابواب قائم کئے تھے جو خاندانی حالات سے شروع ہو کر تلامذہ اور محبین کے تذکرہ پہ ختم ہوتے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اس آپ بیتی کو مکمل نہ کر سکے۔

اردو میں خودنوشت کی روایت جعفر تھانیسری سے شروع ہوتی ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد لکھی گئی زیادہ تر تراجم ہے اور ایسے تراجم ہیں جو تصانیف کی منزل تک شمار کئے جاتے ہیں مثلاً گاندھی جی کی خودنوشت کا تذکرہ "تلاشِ حق" کے عنوان سے ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے مگر آپ بیتی راقمۃ الحروف کے خیال میں صرف دو ہیں۔ "تذکرہ" جو مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور جو نامکمل رہا اور "نقش حیات" جو مولانا حسین احمد قدوی نے لکھا اور جو اُن کی زندگی کے تقریباً ساٹھ برسوں پہ محیط ہے اور نقش حیات میں ہندوستان کے سیاسی حالات معاشرتی کیفیت رسم و رواج و بدعت وغیرہ کا تذکرہ بھی تفصیل سے مل جاتا ہے۔

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے حالاتِ زندگی کا بڑا حصہ اس کتاب میں جگہ جگہ درج کیا گیا ہے اور اس کے اقتباسات پر تبصرہ بھی ہے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ابتدائی

حصہ میں حضرت مولانا نے اُس علاقہ کے بارے میں سرسری طور سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اسی کے پہلے باب میں بہت تفصیل سے کیرانہ کے ساتھ نانوتہ اور تھانہ بھون کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ جہاں تک رشتہ داریوں کا سوال ہے کہ وہ خاصی پیچیدہ اور کبھی کبھی الجھاد دینے والی انداز میں ملتی ہے لیکن جہاں مولانا نے اپنے والد مرحوم سے اپنی والہانہ عقیدت بھری محبت کا ذکر کیا ہے یا اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے شفقت آمیز خلوص کا ذکر کیا ہے وہ معرکہ خیز ہے۔ بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

میرے لیے سب سے اہم حصہ وہ ہے جو حیدرآباد سے متعلق ہے جو ان پچیس صفحات میں آٹھ صفحات پر ملتے ہیں جو بڑی دردمندی کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ایک معلومات آفرینی پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے ایک فارمولہ کا ذکر کیا ہے جو اس دور کے Stand Stils ایگریمنٹ سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ مسلم لیگ حضرات کی ذہنیت پر بھی بڑی دردمندی سے روشنی ڈالی ہے۔

مولانا نے اپنی سبکدوشی کے سلسلہ میں تقریباً ستر صفحہ کا ایک مکتوب یا عرض داشت لکھی ہے جو بہت ہی باریک حروف میں ہے اور جس کا انداز کہیں مدافعانہ ہے لیکن زیادہ تر مُجادِلانہ ہے [1]

مولانا اردو کے ادیب نہ تھے ان کا میدان عربی تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے یہاں طرزِ تحریر میں روانی بھی ہے اور سلاست بھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت کے بہت سارے گوشے ان کی خودنوشت سے اور اس عرض داشت سے روشن و منور ہوتے ہیں جن پر اپنے اپنے مقام پر آپ کو ان پر تبصرہ ملے گا۔ [1]

حدیث کی خدمات:

آخر میں مولانا کی حدیث کے لیے خدمات کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۹۹۵ء مولانا نے مشکوٰۃ شریف سے اخلاق و آداب و معاشرت پر مشتمل منتخب احادیث

---

[1] خودنوشت۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی

کا ایک زرین مجموعہ مرتب فرمایا۔ اس غیر مطبوعہ عربی کتب کا نام "نخبۃ الاحادیث" ہے۔ جس میں انہوں نے منتخب احادیث کی مختصر تشریح بیان کی ہے[1]۔ مولانا کو زندگی نے کاش مہلت دی ہوتی تو یہ بیش قیمت سرمایہ منظر عام پر آ کر لوگوں کے لیے ہدایت کا سبب بنتا۔ ضرورت اور امید ہے کہ مولانا کے چہیتے شاگرد اور نامور عالم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب اس کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائیں۔

سنہ ۱۹۹۴ء میں وحید الزماں نے قرآن پاک کے اردو ترجمے کا آغاز کیا تھا لیکن وہ کونسے مراحل میں ہے اس کا پتہ نہ چل سکا۔

یہاں تک مولینا کی درسیات اور اردو کی کتابوں کا تذکرہ کیا گیا آئندہ باب میں ان کی لغات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

[1] ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر ص ۵۷۔۵

مولانا وحید الزماں کیرانوی بحیثیت مدون لغت

وحید الزماں بحیثیت مدونِ لغت

مولینا وحید الزماں کی تصنیفی و تالیفی زندگی کے بارے میں انکی کتابوں کا جائزہ لیا جاچکا ہے۔ اب ان کا اہم ترین کارنامہ انکے لغات ہیں۔ اس سلسلہ میں مولینا عبد اللہ طارق لکھتے ہیں:

> ''مرحوم کا سب سے عظیم کارنامہ جو انھیں رہتی دنیا تک زندہ رکھے گا وہ ان کی عربی ادب کی لٹریری خدمت ہے۔ ان سے پہلے عربی سے اردو لغت میں سب سے معروف خدمت مولانا عبد الحفیظ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی مصباح اللغات ہے جو بہت جامع لغت ہے۔ لیکن اردو سے عربی لغت کے موضوع پر کچھ مختصر لغات بہت عرصہ قبل شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک فیروز اللغات کے نام سے زمانہ طالب علمی میں میرے پاس بھی رہا ہے لیکن وہ بہت مختصر اور ناکافی تھا۔
>
> مولانا مرحوم نے عربی سے اردو لغت میں بھی جو کام کیا ہے وہ مصباح اللغات سے بالکل الگ اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے لیکن اردو سے عربی میں جو کام انھوں نے کیا ہے ہم بڑی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ان کو مقام اولیت حاصل ہے دونوں طرح کے لغات میں ان کی امتیازی شان یہ ہے کہ انہوں نے دور حاضر کی ترقی پذیر جدید عربی زبان، جدید استعمالات و محاورات اور عالمگیر صنعتی و اقتصادی اور سائنسی انقلاب کے بعد کی لسانی تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کئے ہیں۔ اس میدان میں مصباح اللغات کی اہمیت کے بھرپور اعتراف کے باوجود وہ مولانا کے مرتب کردہ لغات کی جگہ نہیں لیتی۔ وہ ایک بالکل اچھوتا میدان اور خالی جگہ تھی جس کو انھوں نے پُر کیا ہے، وہ کسی چلے ہوئے راستے پر نہیں چلے بلکہ انھوں نے اپنے لئے الگ راستہ بنایا ہے ایسا راستہ جس کی شدید ضرورت بھی تھی۔

مزکورہ دونوں لغات (القاموس الجدید عربی اردو و اردو عربی) کی اشاعت کے بعد انھوں نے ان دونوں کا ضمیمہ بھی تیار کیا جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ پھر ان ضمیموں اور کچھ نئے اضافوں کو شامل کر کے دونوں لغات کو مزید جامع بنا کر شائع کیا۔ ایک لغت عربی زبان کی جدید اصطلاحات کا الگ سے 'القاموس الاصطلاحی' کے نام سے ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ لیکن زندہ زبانیں ہمیشہ انسانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی ہیں اور ان میں نمود و ارتقاء اور ترمیم و اضافات کا عمل برابر جاری رہتا ہے اس لئے ان سے متعلق لغات کا کام بھی کبھی بند نہیں ہوتا۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اخیر میں ایک بہت جامع لغت تیار کیا تھا اور اس کی کتابت و تصحیح کا کام بھی بڑی حد تک پورا ہو چکا تھا اور کچھ کام ابھی باقی تھا کہ اس سے پہلے ان کا جام حیات لبریز ہو گیا اور وہ اپنی حقیقی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون [1]"

اس سلسلہ میں مولینا نور عالم خلیل امینی مایہ ناز تصنیف 'وہ کوہ کن کی بات' میں القاموس الجدید کے بارے میں لکھا کہ ۱۹۸۸ء میں اپنے مشغول اوقات کو فارغ کر کے ایک ضخیم قاموس مرتب کر اس سال اسے شائع کر دیا جو 'القاموس الاصطلاحی' کے نام سے معروف ہے۔ مولینا خلیل امینی نے مولینا وحید الزماں کے مکتوب اور اپنے جواب کا بھی ذکر کیا ہے لیکن مولینا نے لغت پر کوئی گفتگو نہیں کی ہے [2]

دراصل لغت نویسی ایک فن ہے اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ہشت پہل شخصیت اور عبقریت کے مالک ہوں۔ مدون کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سماجی لسانیات سے ضرور واقف و باخبر ہو اس لئے کہ الفاظ خلاء سے وجود میں نہیں آتے بلکہ سماج میں جو افراد کے درمیان باہمی تفاعل کا عمل ہوتا ہے وہی عمل الفاظ کو جنم دیتا ہے۔ اس طرح زبانوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ بھی داخل ہوتے ہیں مثلاً آج سے کچھ برس پہلے ٹیلی ویژن کا کوئی تصور نہیں تھا گذشتہ بیس برس سے اس کا چلن بڑھا تو ہندی والوں نے اسے بہت خوبصورت نام دوردرشن کا دے دیا اسی طرح ٹیلی فون کی ایجاد نے ایک نئی دنیا وجود میں لانے کا کارنامہ

---

[1]، [2] مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر۔ ترجمان دارالعلوم۔ ص ۲۷۵

انجام دیا اور اب اس کا چلن اتنا بڑھا کہ عام طور سے مکتوب نگاری کا رواج ختم ہو گیا اور چند لمحات میں ہزاروں میل کی دوریاں ختم ہو گئیں۔ عربی میں اس کے لئے لفظ "ہاتف" استعمال کیا جانے لگا۔

اس گذارش سے مراد یہ ہے کہ ایجادات، اکتشافات، سماجی لین دین، کاروبار بازار جنگی اسلحے الفاظ کی تخلیق کرتے ہیں۔ مدون لغت کو مشہور جرمن فلسفی وٹگنسٹین wittgienstien جو لسانیات کا ماہر تھا اس کے نظریات سے بھی باخبر ہونا چاہئے اور یہ جاننا چاہئے کہ لفظ مرکب ہو یا مفرد محل استعمال سے اپنے معانی آشکار کرتا ہے، شہر قالین کا مطلب یہ نہیں کہ قالین پر شہر بنا ہوا یا بیٹھا ہوا ہے بلکہ ترکیب اپنے محل استعمال سے جو معنی دیتی ہے اس میں ان دونوں لفظوں کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

اسی طرح سائیسر saucere مدون لغت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون سے نہ صرف یہ کہ باخبر ہو بلکہ ان کے محل استعمال سے بھی آگاہ ہو، ساتھ ہی ساتھ اصطلاحات سے بھی آگہی لازم اور ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ ان اصطلاحات کے ذریعہ سے ایک مخصوص مزاج اور فضا کی نشاندہی ہوتی ہے اور ان اصطلاحات سے مخصوص ادوار کے سماجی ڈھانچہ کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے' اصطلاحات کا معاملہ یہ ہے کہ عام بول چال میں جو الفاظ ہوتے ہیں وہ اصطلاحات میں پہنچ کر بالکل نئے معنی دینے لگتے ہیں اس لئے لغات کی تدوین میں اصطلاحات سے باخبر ہونا بہت ضروری ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک لفظ سے بہت سارے محاورے وجود میں آتے ہیں اور یہ محاورے روزمرہ میں بدل جاتے ہیں اور یہ روزمرہ کہاوتوں اور ضرب الامثال کی تخلیق کرتا ہے مثلاً "للباطل جولةُ وللحق دولةُ"

یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سنسکرت کی طرح عربی ایک باقاعدہ منظم اور مرتب زبان ہے اس کی قواعد میں زیر، زبر، پیش بھی اہم ہوتے ہیں مثلاً:

مُفرَط = 'ر' پر زبر کے ساتھ - وہ شخص جسے آگے بڑھا دیا جائے

مُفرِط = 'ر' پر زیر کے ساتھ - خود حد سے آگے بڑھ جانے والا

مُفرّط = 'ر' پر تشدید کے ساتھ - کوتاہی کرنے والا

اسی طرح مسحور کے معنی سحر زدہ کے بھی ہیں اور ساحر بھی ہو سکتے ہیں۔

ہم اردو والے نجم کے ایک ہی معنی جانتے ہیں اور وہ ہے ستارہ لیکن عربی پڑھنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ شجر کے ساتھ بوٹی بھی کھل رہی ہے اور قرآن نے بڑھ کر سمجھایا کہ کبھی "والنجم" کہا جائے گا تو ستارہ شام مسکرائے گا اور کبھی سورہ رحمن میں شجر کے ساتھ آئے گا تو بوٹی بن کر کھلے گا کسی بھی مدون لغت کے لئے ان نکات پر غور کرنا اور نظر رکھنا بہت ضروری ہے اور ساتھ ہی یہ بھی نا گزیر ہے کہ الفاظ اور ان کے معنی کی صحت تحریر پر بھی نظر ہو اور اس کا خیال بھی رکھا جائے کہ لفظ کی قرأت کس طرح ہونی چاہئے اور جس طرح انگریزی لغات میں حروف پر stress کی علامتیں بنی ہوتی ہیں اس طرح مشرقی زبانوں میں الفاظ کی صحیح مخارج کے ساتھ ادائیگی کے لئے اس طرح کی ہدایت بھی ہو تو بہتر ہے۔

الفاظ کا ایک رخ وہ ہوتا ہے جس کا تعلق سماجی لسانیات سے ہے یا اصطلاحات اور روزمرہ سے ہے الفاظ کا دوسرا پہلو علاقائیت سے متعلق ہے ہر علاقہ کا اپنا ایک مخصوص ذہن ہوتا ہے اور اسی ذہن کے اعتبار سے لفظ کی ادائیگی ہوتی ہے۔ معیاری لفظ لکھنے کے لئے اس پہلو پر نظر رکھنی ضروری ہے مثلاً، آذربائیجان کا رہنے والا کاف کی صوت نہیں ادا کر پاتا وہ اللہ اکبر کو اللہ اچبر کہتا ہے یا حیدر آباد میں اکثر افراد 'ق' کی جگہ 'خ' کو استعمال کرتے ہیں اور 'تقریب' کو 'تخریب' کر دیتے ہیں اس طرح معیاری لفظ کی اس طرح کی تقلیب بھیانک ہو سکتی ہے۔ لغات کی تدوین میں اس نکتہ کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

ایک اور اہم پہلو زبان کی قواعد اور صرف ونحو سے باخبری کے ساتھ کسی زبان کے علم

بدیع سے آگہی بھی ضروری ہے یہ وہ رموز ہیں کے جن کیے بغیر لغت کی تدوین ممکن نہیں ہے یہ بھی ایک حقیقت نہیں بلکہ اس کے لئے آگہی باخبری اور ایک چوکنے دماغ کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں عربی لغات نویسی کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولینا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا:

''ہندوستانی مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ عربی زبان کی اہمیت محسوس کی اور اس کو ہر دور میں سینے سے لگائے رکھا بلکہ اس کی خدمت واشاعت اور توسیع وترقی میں اپنا مخصوص کردار ادا کیا۔ اور انھوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہمسری ورفاقت کی بلکہ کبھی کبھی ان کی رہنمائی اور رہبری کا فرض بھی انجام دیا۔ اور نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہم زبانی اور ہم نوائی کی جرأت کی جو ایک عجمی قوم کے لیے سرمایہ فخر ومباہات ہے۔ بلکہ کبھی کبھی جدت واجتہاد سے بھی کام لیا۔ شاہرہ عام سے ہٹ کر نئی روشیں پیدا کیں اور قصر ادب میں بعض نئے نئے دریچے اور نئے روزن بھی کھولے۔ مثال کے طور پر اس جدت وجرأت کا سہرا ایک ہندوستانی عالم ہی کے سر ہے کہ اس نے ایک مستند ترین معجم (لغت) کی شرح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں زبان کی ایسی اداشاسی اور نکتہ سنجی کے نمونے پیش کئے کہ اہل زبان نے بھی اس کی زبان دانی اور دقیقہ رسی کا اعتراف کیا۔ میرا اشارہ علامہ مجدالدین فیروز آبادی کی شہرہ آفاق لغت ''القاموس المحیط'' کی عربی شرح ''تاج العروس'' کی طرف ہے جو تیرھویں صدی کے مشہور ہندوستانی فاضل علامہ مرتضیٰ بلگرامی معروف بزبیدی (م ۱۲۰۵ھ) کے قلم سے دس ضخیم جلدوں میں نکلی ہے اور پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ میرے علم میں نہ صرف عربی زبان بلکہ کسی دوسری زبان میں بھی کسی عظیم وضخیم لغت کی شرح کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات پر سب سے زیادہ مستند ومفصل کتاب ایک ہندی عالم کے قلم سے کشاف اصطلاحات الفنون کے نام سے نکلی اور پوری علمی دنیا میں مقبول ہوئی۔ اس کے مصنف قاضی محمد علی تھانوی بارھویں صدی کے علماء میں ہوئے ہیں۔

عربی لغت ومعاجم کے میدان میں اس خدمت کے ماسوا ہندوستانی علماء نے اور میدانوں میں بھی اپنی ذہانت قوت ایجاد واختراع سے کام لیا۔ مولانا سید عبدالجلیل بلگرامی اور ان

کے ناموں تو اسے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے فن بلاغت و بدیع اور فن عروض میں نئے اضافے کئے اور عربی شاعری میں ہندوستانی موزونیت طبع اور ہندی و فارسی شاعری کے پیوند لگا کر ذہن و ذوق میں نئی تحریک اور جمود و تقلید کی ساکن سطح میں نیا تموج پیدا کیا جسٹس کرامت حسین لکھنوی اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری نے فقہ اللسان اور المبین کے ذریعے عربی زبان کے فلسفہ لغت اور نحو و اشتقاق کے بہت سے اسرار کی نقاب کشائی کی اور اپنی سلامتِ ذوق اور جودتِ طبع کے نادر نمونے پیش کئے [1]

مولینا کا یہ اقتباس مستند مکرر کے طور پر دوبارہ درج کیا جا رہا ہے، دراصل مفکر اسلام کی یہ وہ مایہ ناز تحریر ہے جو ہندوستان میں عربی زبانی کے ارتقاء کے قصر کی خشت اول ہے۔

اس سے سلسلہ میں محمد عارف الدین کلیم عمری کی یہ رائے قابل غور ہے:

"مولینا وحید الزماں کی لغت سے دلچسپی اور اس میں عمق نظر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولینا نے کل پانچ ڈکشنریاں ترتیب دی ہیں، القاموس الجدید اردو عربی، اور عربی اردو کے بعد آپ نے "القاموس الاصطلاحی" اردو عربی اور عربی اردو مکمل کی یہ دونوں ڈکشنریاں اردو کے لئے ایک نادر تحفہ ہیں اور اپنی نوعیت کی منفرد اور معیاری قوامیس ہیں۔ جن سے اہل علم اور اسکالرس اپنے تحقیقی مقالوں اور علمی تصانیف کے لئے لغات میں مرجع کا کام لیتے ہیں [2]

لغات کی دنیا میں ہر سال بہت سے الفاظ کے اضافے کے ساتھ نئے ایڈیشن آتے ہیں "آکسفورڈ" سے شائع ہونے والی ڈکشنری پر "المنجد" اور "المورد" کے ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ملے گا لیکن اردو میں قدیم معاجم و قاموسیں ہی کل کائنات سمجھی جاتی ہیں۔ جدید اضافے تہذیب و تنقیح کا کام برسوں سے رکا پڑا تھا لیکن مولینا نے اس میدان میں اپنی پیرانہ سالی، کمزور صحت اور ذیابطیس کے مرض کے باوجود دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل تمام جدید تقاضوں اور مناسب ترمیموں کے ساتھ "القاموس الوحید" ترتیب دی ہے درحقیقت اٹھارہ سو صفحات کئی ہزار الفاظ کا دقیق مطالعہ و تحقیق،

---

[1] مقدمہ عربی ادب کی تاریخ ۱۰ تا ۱۱ ڈاکٹر عبدالحلیم

[2] ترجمان دار العلوم ص ۳۰۱ محمد عارف الدین کلیم عمری

دیگر معاجم وقاییس سے موازنہ اور لفظ لفظ کے معنی اور صحت املاء تک کو جانچنا یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ عزم وحوصلہ اور ہمت اور جوانمرادی مولینا ہی کا حصہ ہے''[1]

یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

دراصل حضرت مولینا عبد الحفیظ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کام انجام دیا تھا اسے حضرت مولینا وحید الزماں نے آگے بڑھانے کی سعی مشکور کی اس سلسلہ میں راقمۃ الحروف نے طالب علمانہ طور پر جو نکات سمجھ پائے انہیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ مولینا عمید الزماں قاسمی کیرانوی نے جو فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے وہ تقریباً حرف آخر ہے لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ قلم وتحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی میری کاوش گویا اس روشن چراغ سے ایک چراغ روشن کرنے کی ہے کہ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ جلتے ہیں:

زبان ولغت کی تعریف ابتداء وارتقاء:

تمام علماء ومحققین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ خداوند عالم نے عالم انسانیت کو قوت نطق دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ جب انسان ناطق پیدا ہوا ہے ناطق ہونے کی وجہ سے اس کو زبان اور لغت کی ضرورت پڑے گی۔ نطق کے معنی ہیں غور وفکر کی صلاحیت رکھنا جس کے اندر غور وفکر صلاحیت پائی جائے گی۔ وہ زبان اور لغت کا محتاج بھی ہوگا۔ غور وفکر کی صلاحیت انسان کو روادار کرتی ہے کہ اپنی رائے اور فکر کا اظہار دوسروں کے سامنے کرے۔ اور اظہار فکر وفلسفہ کے لئے الفاظ ناگزیر ضرورت بن جاتے ہیں۔ بغیر الفاظ وزبان کے انسان اپنی تعبیرات کو دوسروں کے سامنے اظہار نہیں کر سکتا ہے۔ اسی لئے جہاں جہاں انسانیت پائی جاتی لغت وزبان کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ اگر یہ الفاظ ولغت نہ ہوتی ہو مفکر کی فکر اہل فلاسفر کا فلسفہ اور دانشوروں کی رائے ان کے دماغ میں پیدا ہو کر سینوں میں دفن ہو جاتی۔

---

[1] بحوالہ ترجمان دار العلوم ص ۳۰۱ محمد عارف الدین کلیم عمری

اس کائنات عالم میں انسان تین طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انفرادی، اجتماعی اور مدنی زندگی۔

انفرادی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس کائنات میں جب پیدا ہوا ہے تو اس کی کچھ ضرورتیں اور احتیاجات ہیں۔ کچھ ضرورت ایسی ہوتی ہیں جن کے پیدا ہوتے ہی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی انسان آواز ہی کو ضرورت پورا کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اگر آواز میں درد وغم ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انسان کو کوئی ضرورت ہے یا تکلیف ہے۔ والدین ہر آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر انسان کے آواز میں خوشی کا عنصر شامل ہے تو تمام لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس وقت بچہ کسی تکلیف و درد میں مبتلا نہیں ہے۔ گویا انسان پہلی ہی منزل میں اپنی ضروریات کو دفع کرنے کے لئے آواز کو سہارا بناتا ہے۔ آواز ہی انسان کی ضرورت کو پورا کرنے کی علت بنتی ہے۔ اگر آواز نہ ہوتی تو انسان کی ضرورت پوری ہونے میں بہت ہی مشکل پیش آتی بلکہ ناممکنات کی منزل پر پہنچ جاتی۔ گویا آواز ہی انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی پہلی منزل ہے۔ جب یہی آواز ترقی کے مراحل طے کرتی ہے۔ تو حروف کی شکل اختیار کرتی ہے اور یہی حروف الفاظ میں ڈھل کر عبادت کی صورت میں مفکرین کے فکر فلاسفر کا فلسفہ اور علماء ودانشوروں کی رائے کی ترجمان بن جاتے ہیں۔ اور انسان اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے۔ اور اپنی انفرادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ان ہی الفاظ کو سہارا بناتے ہیں انسان جب شعور کی منزل پر پہونچتا ہے تو زبان ولغت کو سہارا بنا کر اپنی ضرورتوں کو مکمل کرتا ہے۔ اگر یہ زبان ولغت نہ ہو تو انسان اپنی مراد اور مقصود کو دوسروں کے ذہنوں تک منتقل نہیں کر سکتا ہے۔ اشارے اور کنایے چاہے جتنے ترقی کے مراحل طے کر لے۔ وہ زبان کی منزل تک نہیں پہونچ سکتے ہیں۔ اگر انسان کا کام اشارے اور کنایے سے چل جاتا تو زبان کبھی عالم وجود میں نہ آتی۔ ممکن ہے ابتدائے دور میں انسان ایک دوسرے سے اشارے سے کام لیتا رہا ہو۔ لیکن جب انسان کی ضرورت کو پورا

کرنے میں اشارے ناکافی ثابت ہوئے اور انسان کو اپنے مافی الضمیر کو اشاروں میں منتقل کرنے میں پریشانی کا مظاہرہ کرنا پڑا تو انسان الفاظ کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ اور الفاظ کی شدت سے ضرورت محسوس کرنے لگا۔ اور اسی وقت سے الفاظ وعبارت کا وجود پیدا ہونے لگا۔

خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے کہ میں نے انسانوں کو خاندان اور قبائل میں پیدا کیا ہے یعنی فطرت انسان میں اللہ اجتماعی اور معاشرتی زندگی بسر کرنے قوت وصلاحیت ودیعت کی ہے۔ بغیر سماج ومعاشرہ کے انسانی زندگی نامکمل اور ادھوری رہتی ہے۔ اسی لئے ابتدا سے لے کر اس وقت تک تمام ادوار میں انسانی زندگی میں اجتماعیات کا دخل رہا ہے۔ اور ہر خطہ و نقاط کائنات میں انسان کے اجتماعی زندگی کے نقوش بآسانی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ اجتماعی زندگی ہی سے انسانی کلچر اور ثقافت وجود میں آتے ہیں۔ اگر اجتماعی زندگی نہ ہوتو نہ ہی انسانی تہذیب وتمدن دکھائی دیگا اور نہ ہی انسانوں کے اندر ثقافت وکلچر کی جھلک دکھائی دیگی۔ جب انسان اجتماعیات اور معاشرتی زندگی کا محتاج ہوئے بغیر اجتماعی زندگی کے انسانی زندگی کا تصور ناممکن ہے اس لئے کہ ہر انسان کی تین بنیادی ضرورتیں ہیں۔ روٹی کپڑا اور مکان۔

انسان جب روٹی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے کسی معین ومددگار کی ضرورت ہوتی ہے ایک وقت کی روٹی حاصل کرنے کیلئے انسان کو اتنے لمبے عملیات سے گزرنا پڑے گا کہ اس کی زندگی کا قیمتی حصہ صرف ایک وقت کی روٹی کے حصول میں خرچ ہوجائے گا۔ زمین کی ہمواری سے لے کر دستر خوان تک روٹی کو پہنچنے میں ان گنت مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔

کپڑے کی منزل اس سے زیادہ مشکل ہے کپڑے کی زراعت سے لے کر جسد انسانی تک پہونچنے میں بے شمار اور ان گنت منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ زمین کو ہموار کرنا، کاشت کرنا انکی نگہبانی کرنا ثمرہ کے حصول کے بعد اس کو کپڑے تیار کرنے کیلئے مختلف شکلوں میں تبدیل کرنا پھر بنائی کر کے کپڑا بنانا اسکے بعد سلائی وکٹائی کے بعد جسم انسانی تک پہنچتا ہے کسی ایک انسان کے قوت وطاقت سے باہر ہے کہ وہ ان تمام مراحل کو اپنے ہاتھوں سے انجام دے۔

رہا سوال مکان بنانے کا تو یہ امر بہت ہی مشکل اور ناقابل تحمل تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک مکان میں مختلف صفات و ذات کی اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور تمام اشیاء کا از خود جمع کرنا اور فراہم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ان اشیا کا حصول جوئے شیر لانے سے بھی بڑھ کر مشکل اور پریشان کن ہے۔ ایک عادی انسان کیلئے ان اشیاء کو جمع کرنے کے بعد ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک جگہ پر مکان کی شکل میں تشکیل دینا نہایت ہی مشکل امر ہے۔

اس بنیادی ضرورت کے علاوہ بہت ساری ضروریات ہیں جن کا انسان اپنی زندگی میں محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ ضرورتیں قدم بہ قدم انسانی زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور ہر موقع پر انسان کو نامعلوم کتنی ضرورتوں سے دو چار ہو سکتا ہے۔ اگر انسان تمام ضرورتوں کو خود پورا کرنے کی کوشش کرے کا تو شاید پوری زندگی صرف کرنے کے بعد چند ضرورتوں کو ہی پورا کر سکتی ہے۔ اب اگر انسان اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور اپنی ضرورتوں کو بھی پوری کرنا چاہتا ہے تو اسے دوسروں کی مدد اور تعاون کا محتاج ہونا ضروری ہے۔ اور دوسروں کی مدد لینا ضروری ہے۔ بغیر دوسروں کے مدد اور تعاون کے انسان اپنی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا ہے۔ یعنی انسان اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے میں سماج و معاشرہ کا محتاج ہوتا ہے۔ انسانی زندگی ہر پہلو اور ہر جہت سے اجتماع کا محتاج ہے۔

المختصر انسانی زندگی معاشرہ اور سماج کی ہر حال میں محتاج ہے۔ اور انسانی زندگی کے لئے اجتماع اور معاشرہ ناگزیر ہے۔ جب انسان کے لئے سماج ضروری ہے۔ تو افہام و تفہیم اور ایک دوسرے تک اپنے خیالات اور افکار منتقل کرنے کے لئے اپنی ضرورتوں کو ایک دوسرے سے بیان کرنے کے لئے کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جو ذریعہ بن سکے۔ وہ اسی کا نام زبان اور لغت ہے۔ اگر انسان سماجی زندگی بسر کرے گا تو زبان و لغت ضروری ہے۔ جب انسان اجتماعی و معاشرتی زندگی بسر کرے گا تو ایک دوسرے کے افکار و خیالات جاننے کی کوشش کی جائے گی۔ اور ہر انسان اپنے خیالات اور افکار کو دوسروں تک منتقل کرنے کی

کوشش کرے گا تو زبان ولغت کی ضرورت پڑے گی۔

بہر حال انسان کی زبان اور لغت کی احتیاج وضرورت ایک مسلم امر ہے۔ یہی زبان ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتی ہے۔ یہی زبان ایک دوسرے کا خیالات وافکار کے تبادلہ کا وسیلہ ہے۔ یہی زبان انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا آلہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ زبان اجتماعی وانفرادی زندگی کی مجبوری ہے۔ بغیر زبان کے اجتماعی وانفرادی زندگی کا تصور مشکل بلکہ ممکن ہے۔ انسانی زندگی کے لئے زبان لازم وملزوم کی صورت رکھتی ہے۔ زبان ولغت عالم اذہان کے روابط کا ذریعہ خاص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک اجتماع اور قافلے والے کو اپنے خیالات وافکار کے اظہار کے لئے زبان کے محتاج تھے۔ اور ایک اجتماع دوسرے معاشرہ سے بالکل نابہرہ ونابلد ہونے کے وجہ سے ان کی زبان سے بھی ناواقف تھے۔ ہر معاشرہ کی الگ زبان بن گئی۔ اور کائنات عالم میں گوناگوں زبانیں وجود میں آتی چلی گئیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر دس کلو میٹر پر زبان بدلتی رہتی ہے۔ اور ہر خطہ کی ایک نئی زبان ہوتی ہے۔ ان باتوں سے یہ بات بہر حال ثابت ہے کہ زبان کی ابتدا اور آغاز بھی انسانی زندگی کی شروعات سے ہوتی ہے۔ جب بغیر زبان کے انسانی معاشرہ بے حقیقت نظر آتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ انسانی زندگی کی ابتدا ہی زبان ولغت کی شروعات ہے۔

زبان کی تعریف کے سلسلہ میں علماء میں اتفاق رائے نہیں ہے۔ بہت سارے مسائل یعنی زبان کی بنیادی قواعد بنیادی رشتے، ضمائر اور افعال وغیرہ پر ہر طبقہ کے علماء نے اپنے اپنے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

زبان کے سلسلہ میں اس کی نفسیاتی توجہ بے حد اہم ہے ذہنی تحریکات اپنی نمائش کے لئے پیکر تراش ہیں اور یہی پیکر حروف کا جامہ پہن کر الفاظ بن جاتے ہیں۔ الفاظ بھی اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے خوبصورت وبدصورت ہوتے ہیں۔ حروف کی باہمی نشست انہیں جذبات و احساسات عطا کرتی ہے۔ کبھی غور سے 'ح' اور 'د' کو دیکھئے تو ان پر حد جاری کرنے کو دل چاہے گا،

اد اس نشست والے حروف غیر منقوط ہوتے ہیں اور اسی لئے شاید مہملہ کہلاتے ہیں۔ الفاظ کی ساخت میں حروف بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ عربی میں ایک لفظ ہے 'قبر'' کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد قیامت کے روز قبر سے مردے اٹھائے جائیں گے اور ان میں وہی لوگ ہوں گے۔ جو اہل کتاب کے طرز پر دفن کئے گئے ہوں۔ مگر قیامت میں وہ بھی اٹھائے جائیں گے جو غرق دریا ہوئے ہیں جو فضائے بسیط میں منتشر ہو گئے ہیں یا جنہیں جلایا گیا ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کے لئے لفظ قبر کا استعمال نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم کی بلاغت کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے ایک لفظ 'اجداث'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہر اس روح کے لئے ہے جو اس دار ناپائیدار سے رہ گزار عالم بقا ہوئی چاہے جلائی گئی ہو یا قبر میں ہو یا ہوائی حادثہ میں فضاء میں منتشر ہوگئی ہو۔

یہ وہ نکات ہیں جن کی طرف ماہر لسانیات نے اپنے اپنے انداز سے اشارہ کیا ہے۔ اس تعریف کے علاوہ جو ماہرین نفسیات نے کی ہے منطق، فلسفہ اور دوسرے مکاتب فکر زبان کی تعریف کی ہے اور عموماً یہ تعریف مسلمہ سمجھی جاتی ہے کہ زبان وسیلہ اظہار ہے اور کوئی گروہ اپنی ضروریات اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بھی کرتی ہے اور دنیاوی معاملات کی تفہیم و ترتیب کے لئے بھی زبان ہی وسیلہ بنتی ہے ہر زبان میں تحریری اور صوتی اشارے ہوتے ہیں۔ اور انہیں کے ذریعہ زبان رابطہ کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اس طرح اگر غور کیا جائے تو زبان ایک گروہ کے لئے ان کے درمیان رابطہ کا سبب ہے اور دوسری طرف زبان کی معنی کے تعین اور لغات کے ذریعہ دوسرے گروہ سے رابطہ کا سبب بنتی ہے۔

ان تمام تعریفوں کی روشنی میں زبان کسی تمدن سماج اور معاشرہ میں ابلاغ و ترسیل کا ذریعہ ہے۔ ایسی ترسیل جو افراد کے درمیان معاشی، ثقافتی، تہذیبی اور سماجی روابط کی بنیاد پر ہو۔ لیکن یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ زبان کا وجود اس لیے بھی ہوا تھا کہ افراد کا گروہ اپنی باتوں کو افراد کی ایک بڑی اکثریت سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اور اگر کبھی ان کے الفاظ

دوسرے گروہ کے کانوں میں پڑ جاتے تھے تو اس میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زبان کا اشاراتی نظام ترسیل علمی و تحقیق کے ارتقا کے لئے مثبت انداز میں بھی تھا۔ اور کسی گروہ کو اپنے طرز فکر اور نظام زندگی سے دور رکھنے کے لئے بھی تھا۔ لیکن انسان کی تجس فطرت نے ایسے راز افشا کرنے کی ترکیب بھی وضع کر لی اور زبان کے طلسماتی نظام کو ختم کرنے کے لئے لغت کی ایجاد کر لی۔

لغت و زبان کی تعریف کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ آیا اطلاق کسی اور لفظ پر ہوتا ہے یا نہیں ویسے عربی زبان میں اللسان بھی لغت کے معنی میں ہے اور قرآن حکیم میں بھی لفظ لسان کا استعمال لغت کے معنی میں ہوا ہے۔ صاحب المنجد لکھتے ہیں کہ لغت نام ہے ہر قوم کا اپنا مصطلح کلام اس کی جمع لغیٰ' لغات اور لغون آتی ہے اور اللغو واللغا بے ہودہ کلام کو کہتے ہیں۔ اس بات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ لفظ لغت عربی لفظ ہے یہ لفظ معرب نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو یونانی لفظ مانا ہے یعنی یہ لاغوس کا معرب ہے۔ جس کے معنی کلمہ کے ہیں یونانی زبان اور عربی زبان میں پائی جانے والی گہری مشابہت بھی اس خیال کی تائید کرتی ہے۔ عربی زبان دور قدیم میں جزیرہ نما کے عرب میں مقیم قبائل کی زبان تھی۔ اس زبان کو سریانی زبان بھی کہا جاتا ہے جو کہ غلط ہے اس لئے کہ ابو سکین کہتے ہیں چونکہ اہل یونان شمالی شام کو اشوریہ یا سوریہ کہتے تھے اس لئے اس زبان کو سریانی زبان کہا جانے لگا۔

اگرچہ عربی زبان سامی زبانوں کی خاندان کی ایک شاخ ہے۔ محمود العقاد کے قول کے مطابق اکادی، اشوری، بابلی، سامی شرقی اور سامی عربی ہی سامی زبان کی مشہور زبانیں ہیں۔ سامی عربی کی دو قسمیں ہیں شمالی عربی اور جنوبی عربی۔

ابو سکین کے قول کے مطابق عربی زبان کا تعلق سامی زبان کے خاندان سے ہے۔ اور اس کے بولنے والے اکثر حضرت جناب سام کی اولاد ہیں اور جناب سام حضرت نوح کے بیٹے

ہیں۔اگرچہ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں پائی جاتی ہے۔تاہم عوامی شہرت اور سہولت کے خاطر اس قول کو قبول کرلیا گیا ہے۔سامی زبانیں زیادہ تر ایشیاء اور افریقہ میں پائی جاتی ہیں۔ان میں کی کچھ زبانیں باقی ہیں بقیہ ماضی کا حصہ پارینہ بن چکی ہیں۔سامی زبانوں میں آپس میں بہت زیادہ یگانگت اور بہت ہی واضح ربط پایا جاتا ہے۔جب کہ یہ ہندی ویورپین زبانوں میں پائے جانے والے ربط سے کہیں زیادہ گہرا ربط پایا جاتا ہے۔

سامی زبانوں کا شجرہ کافی الجھا ہوا ہے جو سب سے سہل آسان بنا کر ڈاکٹر سلیمان ابوغوش (متوفی ۱۹۷۷ء) نے "عشر ۃ الاف حکمتہ الجلینریہ من" اصل عربی میں پیش کیا ہے۔پاکستان میں جب مدرسہ عربیہ کا قیام ہوا تو آپ ہی نے نظام سنبھالا تھا۔ہندوستان کی ایک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی اس کے علاوہ کویت کی طرف سے کئی ممالک میں کونسلر کا عہدہ بھی سنبھالا ہے۔۱۹۷۷ء میں دائرے میں کویتی سفارت خانہ کے ناظم کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ڈاکٹر ابوغوش نے سامی عربی زبان کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی ہے [1]

ا-شمالی عربی زبانیں:

اس کی دو قسم اور شاخ ہے۔یا ان زبانوں کو دو قبیلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(ا) مشرقی عربی زبان اس کے تحت میں اشوری بابلی اور حکمرانی زبانیں (یہ تینوں زبانیں موجودہ عراق کے لوگ بولتے ہیں۔(۲) مغربی زبان جس کے تحت میں بہت سی زبانیں ہیں۔کنعانی، فنیقی، سریانی، موابی، موری، آرامی، اوغارتی (ان زبانوں کی تحریریں ۱۹۳۰ء میں راس شمرہ کے علاقہ جو کہ لبنان میں واقع ہے ملی ہیں) نبطی، صفوی شام میں مقام صفاۃ میں اس کے نقوش ملے ہیں یہ زبانیں شام ترکی اور فلسطین تک پھیلی ہوئی ہیں۔

---

[1] بحوالہ مقدمہ عمید الزماں ص ۱۴، ۱۵ تلخیص

۲۔وسطی عربی زبانیں:

اس کے ضمن میں یہ زبانیں پائی جاتی ہیں۔ثمودی حجازی لحیانی یہ زبانیں جنوبی شام اور شمالی یمن میں رہنے والے حضرات بولتے ہیں۔

۳-جنوبی عربی زبانیں:

ان کے تحت میں آنے والی زبانیں یہ ہیں۔معنیی' سبئ'حضرمی' حمیری'قتبانی اوسانی ان ہی زبانوں میں قدیم حبشی زبانیں جیسے جعذی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ان زبانوں کے علاوہ ممکن ہے اور سامی زبانیں رہی ہوں لیکن ان کا انکشاف نہیں ہوسکا ہے۔عربی زبان موجودہ مفہوم کے اعتبار سے وہ زبان ہے جیسے ایشیاء اور افریقہ کے لوگ بولتے ہیں۔علماء لسانیات کا ماننا ہے کہ یہ عربی زبان عرب میں پیدا ہوئی ہے اس دعویٰ پر مختلف نشانیاں اور آثار دلالت کرتے ہیں۔جب تک اس دعویٰ کے برخلاف کوئی محکم دلیل کیساتھ کوئی قول نہیں پیش کیا جاتا ہے یہ ماننا پڑے گا کہ عربی زبان کی پیداوار نشوونما کے مراحل عرب میں طے کیے ہیں۔یہ بات دوسری ہے کہ عرب کی نقل مکانی کی وجہ سے یہ زبان عرب کے جغرافیائی حدود سے باہر نکلی۔آج کل کی متداول زبان میں ہی قرآن نازل ہوا جس نے عربی زبان کو استحکام واستقرار دیا۔موجودہ حجازی لہجہ دراصل قریشی لہجہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قریش کو عرب کے تمام قبائل پر فوقیت حاصل تھی اس لئے انھیں کا لہجہ غالب آگیا۔محترم عمید الزماں نے قریشی لہجہ کی برتری پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا کہ عرب چوں کہ قبیلہ کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتے تھے۔چوں کہ ہر قبیلہ کی زبان مختلف تھی اور ہر قبیلہ والا اپنی الگ زبان اور بولی رکھتا تھا۔اس لئے طاقت کے غلبہ کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی دوسرے قبیلوں پر غالب کرنا چاہتے تھے۔اور اس میں کوئی شک وتردید نہیں ہے کہ قبیلہ قریش کو جزیرہ نما عرب کے تمام قبائل پر بالا دستی حاصل تھی اس کی کئی وجوہات ہیں۔

مذہبی بالادستی چوں کہ یہ قبیلہ کعبہ کے قریب سکونت اختیار کیے ہوئے تھا اس لئے وہ خانہ کعبہ کے پاسبان اور خدمت گذار تھے اور تمام عرب خانہ کعبہ کی زیارت کو آتے تھے اس لئے وہ قبیلہ قریش کے محتاج تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب کی تجارت کی زمام ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ موسم گرما میں شام سے اور موسم سرما میں یمن سے سامان خرید کر لاتے تھے اور ان سے تمام عرب خریدتے تھے۔ اس تجارت کے نتیجہ میں وہ دولت وثروت میں بھی تمام عرب سے آگے تھے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ قریش کا اقتصاد اور مذہب میں بالادستی حاصل ہونا اور سکونت کے اعتبار سے اچھی جگہ پر متمکن ہونا تہذیب وتمدن ثقافت و کلچر اور علوم وفنون کے اعتبار سے قریش کا اتنا نفوذ حاصل کر لیا تھا کہ خود کو سردار کا سب سے بڑا دعویٰ دار سمجھتے تھے جیسا کہ ابوبکر نے انصار کے مقابل میں یہی باتیں رکھی تھی۔ جب کہ جاہلی اثر ونفوذ کا کوئی دخل اسلام میں نہ تھا۔ اس کی سرداری شخصی کردار افکار اور بصیرت پر مبنی ہے۔ اسلام کے سردار شخصی علوم وفنون پر بھروسہ کرتی ہے کہ قومی وقبیلائی بالا دستی کو سردار کا معیار گردانی ہے۔

اس طریقہ سے قریشی لہجہ جزیرہ نما عرب کے تمام قبائل پر بالادستی اور غلبہ حاصل کر گیا۔ قریش نے اپنی زبان اور بولی کو ترقی دینے میں بہت کوشاں ہے۔ جن الفاظ کی کمی دیکھی ان کا اضافہ کر دیا تمام قبیلہ والوں سے زیادہ قریشی زبان میں الفاظ کا ذخیرہ جمع ہوگیا جس کی وجہ سے مختلف اسلوب اور متعدد طریقے سے اپنے معنی مرادی کو بیان کرنے کی قدرت تمام زبانوں پر مقدم کر دیا اور تمام دنیائے عرب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ تجارت کے سلسلے میں وہ دوسری قوموں سے میل جول رکھتے تھے اور ان کی زبان سے استفادہ کرتے تھے جس کی وجہ سے دوسری بولیوں میں موجودہ خوبیوں کو لے کر اپنی زبان کے نقائص اور عیوب کو دور کر لیا جس کی وجہ سے سب سے کم غلطی والی زبان قرار پائی۔

جب اس زبان کے بولنے والوں کی کثرت ہوئی اور یہ زبان دنیا کے مختلف خطوں تک پھیلنے لگی اور اکثر قومیں اس زبان سے استفادہ کرنے لگیں تو قواعد وقانون نہ ہونے اور کوئی باضابطہ دستور نہ ہونے کی وجہ سے اس میں غلطیاں ہونے لگیں۔ لوگ الفاظ کی ساخت اور ترکیب اور حرکات کے اعتبار سے غلطیاں کرنے لگے۔ اور قریش کی زبان بگڑنے لگی تو قریش والوں کو کافی تشویش ہوئی ان غلطیوں کا سد باب کیسے کیا جائے۔ اور ہر زبان کے بولنے والوں کو غلطیوں سے کیسے محفوظ رکھا جائے یہ ان کے لئے بہت ہی مشکل امر تھا۔ یہاں تک جب مولائے حضرت علی ابن ابی طالب نے دیکھا کہ بولی کے ساتھ ساتھ قرآن کی حرکت میں بھی لوگ غلطی کرنے لگے ہیں۔ تو آپ نے اپنے ایک شاگرد ابو اسود دیلمی کو ان غلطیوں سے بچنے کے لئے ایک قانون کی تعلیم دی اور حکم دیا کہ اس قانون کو مرتب کرو تا کہ لوگ کلام میں غلطی کرنے سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ قانون نحو وصرف وجود میں آیا۔ صرف کا قانون لوگوں کو مادہ، حیفۂ مصادر ادغام اقلاب کو معین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جس سے الفاظ اصل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ قانون نحو لوگوں کی اعراب تراکیب۔ جملہ معرفہ نکرہ اور اضافت ایسے نامعلوم کتنے بیش بہا موارد پر مدد وکمک کرتا ہے اگر قانون نحو نہ ہو تو نہ ہی انسان صحیح اعراب بول سکتا ہے اور نہ ہی صحیح معنی مراد کو درک کر سکتا ہے۔ اسی غلطی کے ازالہ کے خاطر عرب نے لغت کی طرف توجہ کی [1]۔

عربی کے قدیم وابتدائی لغات:

جب عربی زبان بولنے والوں میں غلطیاں زیادہ ہونے لگیں۔ عوام میں بولنے میں اکثر غلطیاں کرنے لگے۔ تو علماء نے ایسے اصول وقوانین بنائے جن کے وجہ سے یہ غلطیاں ختم ہو جائیں۔ لیکن ان قوانین اور اصول کی وجہ سے موجود غلطیاں ختم نہ ہوئیں بلکہ اب الفاظ کی ساخت اور ان کے مادہ وغیرہ میں غلطیاں ہونے لگیں۔ اس وقت علماء نے عربی زبان کی حفاظت کے لئے الفاظ کو لکھ کر ضبط کرنا شروع کر دیا۔ اور علماء لغت نے چھوٹے چھوٹے

---

[1] مقدمہ عمید الزماں۔ ص ۱۴۔ ۱۵۔ القاموس الوحید

رسائل کی صورت میں لغت نویسی کی ابتدا کی۔ علماء لغت نے املاء کر کے مختصر رسائل کے صورت میں لکھوا کر لغت لکھنے کی ابتدا کی۔ اگرچہ یہ رسائل تمام الفاظ کے جامع نہ ہوتے تھے۔ بلکہ خاص موضوع کے متعلق یہ رسالے ہوتے تھے۔ جیسے اعضاء بدن اور ان کے ساخت کے متعلق اونٹ اور گھوڑوں کے ساخت کے متعلق یا پودوں سے متعلق یہ رسالے ہوا کرتے تھے۔ بالآخر خلیل بن احمد نے آکر اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''کتاب العین'' لکھ کر عربی زبان کو محفوظ اور عربی لغت کو ضبط کرنے کا راستہ کھول دیا۔ انھوں نے حروف تہجی سے مرکب ہونے والے دو حرفی سہ حرفی چہار حرفی الفاظ کو ترتیب کے ساتھ شمار کیا۔ اس کے سامنے مہمل و مستعمل کی تعداد واضح و روشن ہوگئی پھر ان الفاظ کو مخارج کے لحاظ سے ترتیب دیا۔ پہلے وہ حروف جن کا مخرج حلق ہے پھر وہ حروف جن کا مخرج زبان ہے۔ اور پھر جن کا مخرج دانت ہے اور اس کے بعد ان حروف کو جن کا مخرج ہونٹ اور اس کی ابتداء حرف عین سے کی جس کی وجہ سے کتاب کا نام بھی کتاب العین پڑ گیا۔ اور ایک صدی سے زیادہ مدت گذر گئی جس مدت میں کتاب العین کے علاوہ دوسری لغت کی کتاب موجود نہ تھی۔ یہاں تک ابو بکر ابن دوید نے آکر خلیل بن احمد کی کتاب العین اور دیگر تصانیف کی مدد سے کتاب ''الجمہرۃ'' لکھی اور انھوں نے اس کتاب کی ترتیب حروف ہجا کے لحاظ رکھا۔ اور اس لغت کی ترتیب خلیل کی لغت کے برخلاف رکھا۔ اس کے بعد ازہری نے ''کتاب العین'' کی ترتیب کو سامنے رکھ کر ''کتاب التہذیب'' نامی لغت لکھی۔ پھر جوہری نے ''کتاب الصحاح'' تصنیف کی ابن سیدہ نے ''کتاب المحکم'' لکھ کر لغت کی دنیا میں ایک زبردست اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ ابن فارس کی ''کتاب المجمل'' بھی دنیائے لغت کی ایک اہم کتاب ہے۔ یہ دنیائے لغت کی اہم اور بنیادی کتابیں ہیں جن پر علم لغت کی بنیاد اور اساس رکھی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسری کتابیں علم لغت میں لکھی گئی ہیں جیسے تکملہ نہاتیہ لسان العرب اور قاموس وغیرہ ان ہی کتابوں کی خلاصہ یا ان ہی کتابوں کے مواد کو جمع کرتی ہیں۔

ثعالبی کی کتاب فقہ اللغۃ میں الفاظ کی وضع اور ان کے استعمال کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ مترادف اور متقارب الفاظ کے معنی ایک باب کے اندر جمع کر دئے گئے ہیں پھر ان کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے ان کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اور زمخشری کی کتاب ''اساس البلاغہ'' بھی اس میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں مصنف نے الفاظ کی آخری حدیں اور استعمال کے مجازی طریقے بیان کیے ہیں جنھیں عرب کی دنیا میں روا رکھا گیا تھا۔ ان دونوں کتابوں میں لغت عربی کی خصوصیات اور ان کے سربستہ رازوں کو اس طرح لکھ کر پیش کیا گیا ہے کوئی ادیب نہ ہی ان سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی طالب علم ان کتابوں سے بے فیض رہ سکتا ہے۔ جب بھی عربی زبان کے الفاظ ان کی ساخت اور ان کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہے گا وہ ان کتابوں کی طرف ضرور رجوع کرے گا۔ اور ان ہی کتابوں کو بنیاد بنا کر فائدہ درک کر سکتا ہے۔ جب بھی کوئی عربی زبان کے مادہ یا مشتقاق کی طرف رجوع کرنا چاہے گا ان ہی کتابوں کو مورد استفادہ قرار دیا جائے گا۔ ان لغات کو لکھنے کی وجہ سے عربی زبان کے الفاظ اور ان کی ساخت باقی رہ گئی۔ اور انھیں لغات کی وجہ سے عربی الفاظ کا نسب نامہ محفوظ ہے۔ اور تمام الفاظ کے اصل تک پہنچنے کا راستہ موجود ہے۔ ہر لفظ کے شجرے باقی ہیں اور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون لفظ کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ان لغات کے ذریعے الفاظ کے مادہ اور مشتق بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت انسان بہت ہی آسانی کے ساتھ تمام الفاظ کے اصل کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے اور انسان یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ یہ لفظ عرب ہے یا معرب ہے اور یا مستعرب ہے۔ یہ تمام تر معلومات بہت ہی آسانی کے ساتھ ان لغات کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اگر یہ علوم لغت وجود میں نہ آتا تو انسان ان قیمتی اور بیش بہا معلومات سے محروم رہ جاتا۔

لغت کی ترتیب کے اہم نکات:

لغت کی ترتیب میں مندرجہ ذیل گوشے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے افعال کو اسما پر مقدم کیا گیا ہے یعنی پہلے افعال کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر افعال میں فعل مجرد کو افعال مزید فیہ پر مقدم کیا گیا ہے اسی طریقے سے معنی کے اعتبار سے بھی تقدیم تاخیر پائی جاتی ہے۔ حسی معنی کو عقلی معنی پر تقدم حاصل ہے اور اسی نہج سے معنی حقیقی کو مجازی معنی پر ترجیح دی گئی ہے اور وہ افعال جو کہ لازم نہیں انکو افعال متعدی پر مقدم کیا گیا ہے۔

افعال مجردہ جو کہ مطرد ہیں وہ پانچ باب ہیں یہ مشہور اور بہت مستعمل ہے...... افعال مزید فیہ میں ترتیب یہ رکھی گئی ہے وہ افعال جو یک حرف زائد رکھتے ہیں ان کو ذکر کیا ہے اور پھر اس کے بعد ان ابواب کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں دو حرفی زائد حروف ہوتے ہیں اور اس کے بعد سہ حرفی زائد حروف والے ابواب کا تذکرہ موجود ہے۔

رموز واشارے:

(٥) یہ نشان تبدیلی مادہ پر دلالت کرتا ہے۔

(-) یہ علامت سے شروع سطر کی (و) واحد (ج) جمع (مو) مولو مراد ہے (مع) معرب کے لئے علامت ہے۔ یعنی اس علامت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ غیر عربی ہے۔ (ق) اس کا مطلب ہے یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ (جمعوع) یہ جمع منتھی الجموع کی علامت ہے اگرچہ المنجد سے کم جموع کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اشارے اور رمز پائے جاتے ہیں۔ اس میں ان ہی اشاروں کو ذکر کیا ہے جو لغت فہمی کے لئے نہایت ضروری ولازمی ہے۔ جن اشاروں کے بغیر لغت فہمی تقریباً مشکل ہے۔ ان تمام اموری روشنی میں جب القاموس الوحید پر نظر پڑتی ہے تو اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی کی ترتیب کردہ لغات دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے اکثر مدارس و کالجوں میں طلباء ان سے استفادہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ذیل میں مولانا کے لغات کا مکمل تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) القاموس الجدید	عربی۔اردو	۱۹۵۲ء......۱۹۵۹ء
(۲) القاموس الجدید	اردو۔عربی	۱۹۵۳ء......۱۹۵۹ء
(۳) القاموس الاصطلاحی	عربی۔اردو	۱۹۸۸ء
(۴) القاموس الاصطلاحی	عربی۔اردو	۱۹۸۸ء
(۵) القاموس الوحید	عربی۔اردو	مارچ ۲۰۰۱ء
(۶) القاموس المحیط	....	
(۷) القاموس الموضوعی	غیر مطبوعہ	

القاموس الجدید:

مولانا نے اس کی ترتیب ۱۹۵۲ء۔۱۹۵۹ء کے عرصہ میں کی۔ برصغیر میں آج تک بھی اس طرح کی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔ اس کتاب میں روزمرہ استعمال میں آنے والے تقریباً تمام الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا آغاز انھوں نے دارالعلوم سے سبکدوشی سے شروع کیا تھا لیکن تکمیل دارالفکر میں کی۔

اس میں تقریباً ۱۲۰۰ صفحات ہیں۔ اس کا ماخذ عربی اخبارات و رسائل ہیں۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ عربی سے اردو اور اردو سے عربی۔ اس لغت کی تدوین وہی عام ہندوستانی نہج پر کی ہے۔ جب کہ المنجد وغیرہ میں التزام پایا جاتا ہے وہی چیز اس لغت میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی ہر لفظ کو مادہ کے اعتبار سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے عربی دان حضرات کے لئے مادہ کے اعتبار سے لغت دیکھنے کا آسان طریقہ ہو۔ لیکن کم علم اور طلبا حضرات کے لئے بہت مشکل امر ہے۔ آج کل کا تقاضا یہ ہے کہ تمام الفاظ کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی قول کی تائید ڈاکٹر ابراہیم محمد نجا نے بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دور حاضر کے تقاضوں اور

ضرورتوں کو سامنے رکھ کر لغت کی ترتیب دینا چاہیے اور نئی لکھی جانے والی لغت میں بالکل سادہ اور آسان طریقہ اپنایا جائے لفظ چاہے مشتق یا کہ مادہ صیغہ ہو کہ مصدر ہر اک حروف ہجا کے لحاظ سے لکھنا چاہیے تا کہ لغت دیکھنے میں آسانی ہو اور طلباء کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

لغت نویسی کی ابتداء سے لے کر آج تک تین ہی صورت بلکہ اگر لسان العرب کو بھی مد نظر رکھا جائے چار صورت بنتی ہے پہلی صورت وہ جیسے خلیل بن احمد نے اختیار کیا جس کی ترتیب حروف ہجا کے اعتبار کو چھوڑ کر مخرج کا اعتبار کر کے لغت کو ترتیب دیا ہے۔ یعنی حروف حلقی کو اول رکھا ہے اس کے بعد زبان دانت اور ہونٹ کو ترتیب مخرج پر بھروسہ کرتے ہوئے لغت کو ترتیب دیا۔

دوسری صورت کتاب الجمہرہ کی ترتیب الفاظ ہے۔ اس میں حروف تہجی کا اعتبار کر کے پوری لغت کی ترتیب رکھی گئی ہے۔ یہ ترتیب بہر حال مبتدی حضرات کیلئے بہت آسان تھی۔

تیسری صورت کتاب الصحاح المحکم کی ہے۔ جس میں الفاظ کی ترتیب ان خاندان اور مادہ کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ جس میں طلباء کیلئے عربی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے۔

چوتھی صورت کتاب لسان العرب کی ہے جس میں الفاظ کے آخری حروف کو معتبر جان کر مادہ کے لحاظ سے کم علم اور مبتدی حضرات کو ہر لغت میں الفاظ کے معنی تلاش کرنے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر چہ لسان العرب کتاب الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ اور اس کتاب میں بہت سے الفاظ جمع کر دئے گئے ہیں اگر ترتیب بہتر ہوتی تو اہلِ علم زیادہ سے زیادہ مورد کا استفادہ قرار دیتے۔ کتاب قاموس الجدید میں مولانا مرحوم نے تیسری صورت میں ترتیب دی ہے۔ جس میں الفاظ کو ان کے مادہ اور صیغہ کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ اگر چہ ہندوستان میں مروجہ طریقہ یہی ہے۔ لیکن اس میں چند خرابیاں ہیں اس خرابی کی وجہ سے نہایت عمدہ اور بہترین لغت ہونے کے باوجود ہر کتاب پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

اگر چہ مولانا موصوف نے المنجد کے ترتیب اور طریقہ کے اوپر اعتبار کر کے اپنی لغت کو

مرتب کیا ہے اگر دیکھا جائے تو قاموس الجدید اور المنجد میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ اسی لئے قاموس پر یہ الزام آگیا کہ کتاب قاموس کتاب المنجد کی نقل ہے یا اس کتاب کا خلاصہ ہے۔ ممکن ہے مولانا مرحوم پر یہ صراحتاً الزام و بہتان ہو لیکن قاموس کو دیکھنے کے بعد اس کے طریقہ ترتیب کو ملاحظہ کرنے کے بعد جب المنجد لغت کو تدقیقی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مدون نے شاید المنجد کی نقل کیا ہے۔.......... لیکن دونوں کتابوں کو دیکھا جائے تو کوئی بھی یہ بات کہنے میں ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرے گا کہ اگر قاموس الجدید کتاب المنجد کی نقل نہیں ہے تو قاموس المنجد کو بنیاد بنا کر مرتب کی گئی ہے۔ لغت لکھنے اور مرتب کرنے کا نہج و طریقہ کتاب المنجد سے ہی حاصل کیا گیا ہے۔

(۱) المختصر اگر کتاب قاموس الجدید کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ چوں کہ یہ لغت مادہ کے حروف ہجا کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔ اس لئے اگر کوئی طالب علم کسی لفظ کے معنی دیکھنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے ہر لفظ سے حروف زائدہ کو ختم کرنا ہوگا جیسے اگر لفظ استقبال دیکھنا ہے تو سب سے پہلے الف وسین کو حذف کرنا ہوگا۔ اس کے بعد حروف زائدہ جو عین کلمہ اور لام کلمہ کے درمیان سے اسے حذف کرنا تب کہیں جا کر مادہ قبل سے لفظ استقبال کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں۔ جو کہ بہت ہی زحمت طلب ہے۔ یعنی طالب علم کو سب سے پہلے ہر لفظ کے مادہ سے واقفیت ضروری ہے۔

(۲) اسی طریقے سے ہر لغت سے استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کس لفظ میں کون سا حرف اصل سے مقلوب ہو چکا ہے اگر یہ علم نہ ہوگا تو لغت سے فائدہ اٹھانا مشکل ہو جائے گا۔ اور عربی قواعد کے لحاظ سے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن میں مادہ کے حروف صیغہ میں آ کر مقلوب ہو جاتے ہیں۔ جیسے لفظ میزان میں اصل مادہ واؤ زاء اور نون ہے لیکن جب یہ میزان بنتا ہے تو واؤ یاء میں بدل جاتی ہے۔ صرفی قاعدہ کے اعتبار سے یہ قلب مادہ کے تینوں حروف میں واقع ہو سکتا ہے۔

(۳) اسی طریقے سے اس لغت میں تبدیل باب سے پیدا ہونے والے معنی کی وضاحت وتشریح بہت کم کی گئی ہے۔ اور عربی زبان میں یہ بات بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر مصنف کہیں پر معنی متعددہ کی طرف اشارہ بھی کیا ہے تو انھوں نے ابواب مشہورہ ہی کو بنیاد بنا یا ہے۔ جو طالب علم کے لئے بہر حال ایک ضروری امر تھا۔ جیسے فعل ثلاثی مجرد جب مزید فیہ کے ابواب میں یہ مصادر جاتے ہیں۔

یہ چند باتیں تھیں جن کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس لغت میں بہت سی اچھائیاں پائی جاتی ہیں۔ جن اچھائیوں کی بنیاد پر اس لغت کو دوسری لغت کی کتابوں سے منفرد بناتی ہیں۔ اگر چہ ان خوبیوں کا تذکرہ تفصیل سے کرنا بہت مشکل امر ہے۔ لیکن چند باتیں بطور اجمالی بیان کی جارہی ہیں۔

☆۔ مصادر کے بیان میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ جو مصادر مشہور اور مستعمل تھے انھیں مصادر کا ذکر زیادہ کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں پر تبدیلی صیغہ کی بنیاد پر معنی میں تبدیلی کا امکان تھا وہاں پر تمام مصادر کا ذکر کیا گیا ہے جیسے اثبات ثبوت وغیرہ[1]

☆۔ جن الفاظ مذکر میں حرف تائے تانیث لگانے سے لفظ مذکر مونث ہو جاتا ہے ان الفاظ کو مونث اسلئے بیان نہیں کیا ہے کہ یہ امر واضح ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جو الفاظ تائے تانیث مونث ہوتے ہیں اور ان کی شہرت ہوتی ان کے مونث الفاظ بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا لیکن جہاں جن الفاظ کا مونث ہونا روشن نہیں ہے صرف انہی الفاظ کا ذکر کیا ہے۔

☆۔ اس طریقے سے فضلائے کلام کے معنی واضح وتشریح کرنے سے پرہیز کیا ہے جیسے لفظ شی یا فلان کا استعمال کیا ہے لیکن ان کے تشریح نہیں کی ہے۔

☆۔ طلبا کی آسانی وسہولت کے پیش نظر ماضی کے صیغہ مادہ بنا کر معنی مصدری کو بیان کیا ہے تا کہ عبارت کی روانی باقی رہے۔

---

[1] القاموس الجدید۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی

☆ بے جا عبارت آرائی سے یہ کتاب پاک وصاف ہے۔جب کسی لفظ کی تشریح ووضاحت کردی جاتی ہے۔اسکے بعد لوگ دوسرا لفظ اسی مادہ سے اختلاف حرکت و باب سے آتے ہے لیکن معنی میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے تو صرف اسی لفظ ہی کو لکھتے ہیں۔جیسے الجَش اور الجُش

☆ ۔جن الفاظ کے بارے میں اہل لغت میں حرکت کے سلسلے میں اختلاف ہوتا ہے۔جیسے لفظ حَجا میں کتاب المنجد میں عین کلمہ مکسور ہے اور معجم الوسیط میں عین کلمہ مضموم ہے تو آپ نے تحقیق کو مقدم کیا ہے اسی چیز کو اپنایا ہے جو تحقیق کے مطابق ہے۔

القاموس الاصطلاحی:

یہ کتاب القاموس الجدید کا نیا ایڈیشن جو تقریباً ۴۵۰ صفحات کی ہے۔اس میں نئے الفاظ اور تعبیرات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

القاموس الوحید:

القاموس الوحید کو دنیائے لغت کی تمام کتابوں سے مقدم وممتاز جانا جاتا ہے۔اسی لغت کا مقدمہ تقریباً ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔جیسے مولانا کے صاحبزادے مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی نے لکھا۔یہ لغت کتب خانہ حسینیہ دیوبند یوپی سے مارچ/۲۰۰۱ میں چھپی۔یہ لغت عربی سے اردو میں دو حصوں میں ترتیب دی گئی ہے۔بڑے سائز کی تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔مولانا کی زندگی کو حیات جاوداں عطا کرنے کے لیے یہ لغت کافی ہے۔اس میں قدیم وجدید الفاظ کا سنگم ہے۔افسوس کے وحید الزاں اپنے اس فقید المثال کارنامے کو دیکھ نہ پائے۔المختصر ہر کتاب میں کچھ خامی ہوتی ہے اور کچھ اچھائی ہوتی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو کلام فوق مخلوق ہوجائے گا۔اور معجزہ بن جائے۔یہ کرشمہ صرف قرآن میں پایا جاتا ہے کہ تحدی کے باوجود اب تک کوئی انسان قرآن کی ایک آیت کا بھی جواب نہیں لاسکا۔القاموس الوحید کے اندر بھی اچھائیاں بہت پائی جاتی ہیں۔مصنف نے لغت نویسی میں بہت ہی دیدہ ریزی اور

دقت نظر سے کام لیا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت مولینا محمد رضوان القاسمی کے گرانقدر تبصرے سے اپنی کمترین رائے کو استناد و اعتبار عطا کرنے کے لئے نمونۃً پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا کیرانوی کی تالیف کردہ القاموس الجدید اور القاموس الاصطلاحی کے بعد ''القاموس الوحید'' دیکھنے کے لئے آنکھیں بیتاب تھیں، اور ہاتھ بڑھے ہوئے تھے اب بیتاب آنکھوں کو قرار آئے گا، اور بڑھے ہوئے ہاتھ الفاظ و معانی کے موتی چننے میں مصروف ہوجائینگے۔ یہ لغت دو جلدوں میں ۱۹۱۸ صفحات پر مشتمل کتابت طباعت اور پیش کشی کی پوری رعنائی، رنگینی اور دلکشی اپنے اندر لئے ہوئے کچھ اس طرح جلوہ گر ہوئی ہے زبان پر بے ساختہ یہ محاورہ جاری ہو رہا یہ کہ ''دیر آید درست آید'' اور مولانا کی سابقہ چار لغت (القاموس الجدید اور القاموس الاصطلاحی عربی اردو۔ اردو عربی) کے پس منظر میں ''نقاش، نقشِ ثانی، بہتر کشد ز اول'' کی معنی خیزی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ یہ سب کچھ بجا' مگر سب سے بجا بات تو یہ ہے کہ ''القاموس الوحید'' اکیسویں صدی کا ایک عظیم علمی تحفہ ہے' جس کی علمی اور عربی دنیا ہر دور اور زمانہ میں قدر شناس رہے گی' اور صاحب لغت کے اس کارنہیں'' کارنامہ'' کو زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوراء عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی' مولانا کیرانوی ؒ کی بڑی خواہش تھی یہ لغت ان کی زندگی میں منظر عام پر آجائے مگر ایسا نہ ہوسکا' تاہم انکے لائق فرزندان (مولانا بدر الزماں کیرانوی' مولوی صدر الزماں کیرانوی اور حافظ قدر الزماں کیرانوی) اور قابل برادران (مولانا عمید الزماں کیرانوی' ڈاکٹر معید الزماں کیرانوی' مولوی حافظ فرید الزماں کیرانوی) اپنے والد اور بھائی کی خواہش کی تکمیل میں سرگرم رہے' ان کی سرگرمی ہی کے نتیجہ میں ''القاموس الوحید'' شایانِ شان طریقہ سے نگاہوں کے سامنے آئی۔ بر صغیر اور جہاں کہیں بھی عربی علوم و فنون کی تعلیم و تدریس اردو زبان میں ہے وہاں کے لئے اس لغت کی حیثیت ایک مخلص رہبر اور مشفق معلم کی ہوگی۔ ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش

کے دینی مدارس اور یہاں کے کتب خانے اساتذہ اور طلبہ تو اس سے مستغنی ہو نہیں سکتے۔ عربی زبان وادب کے رمز شناس اور ہر راحت و آرام سے بے نیاز علم و تحقیق کی راہ میں بے تکان چلنے والے مسافر مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "القاموس الوحید" کی شکل میں جو چراغ جلایا ہے، اس کی روشنی علم کے "قافلہ حجاز" کی نظر کو علمی نور بخشتی رہے گی، اور الفاظ کی شعاعیں معانی کے در و دیوار کو روشن کرتی رہیں گی۔

اس وقت "عربی اردو لغات" میں جس لغت کو امتیازی حیثیت حاصل ہے وہ ہے "مصباح اللغات" مولانا عبد الحفیظ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب اس لغت کو مرتب کیا تھا' وہ بلاشبہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی' اساتذہ اور طلبہ اس سے استفادہ کرتے رہے اور ان کے لئے اس کی حیثیت "عظیم مرجع" کی رہی' اس کے بعد مولانا وحید الزماں کیرانوی کی مرتب کردہ لغت "القاموس الجدید" اور "القاموس الاصطلاحی" (عربی سے اردو) کے نام سے جب سامنے آئی تو ان دونوں نے ایک جدید راہ دکھائی' اور رہروان علم کی علمی تشنگی کو بجھانے میں ایک نئے انداز سے یہ دونوں اہم ذریعہ اور وسیلہ بنے، اب "القاموس الوحید" نے بے شمار الفاظ کے اضافہ کے ساتھ معانی کی جو حسین اور دلکش دنیا سجائی ہے، اس نے اسے "جامع ترین مکمل عربی اردو لغت" کا درجہ دے دیا ہے۔

القاموس الوحید کی تالیف کا کام حضر ہو کہ سفر' شب و روز کی جانکاہ محنت کے بعد کم و بیش ۱۶ سال کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ مؤلف کی وفات کے پونے چھ سال بعد منظر عام پر آنے والی اس "قاموس" کے شروع میں مؤلف کے قابل اور باصلاحیت برادر خرد مولانا عمید الزماں کیرانوی (جنہیں اپنے بڑے بھائی ہی کی طرح قدرت کی جانب سے عربی اور اردو زبان و ادب کا صاف ستھرا ذوق اور لب و لہجہ ملا ہے) کا ۹۶ صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ ہے' جو نہایت بصیرت افروز چشم کشا اور فاضلانہ و محققانہ ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس میں مناسب اضافہ اور نظر ثانی کے بعد اسے الگ سے کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ اور القاموس الوحید میں اختصار

کے ساتھ صرف وہ حصہ رکھا جائے جو اس لغت اور صاحب لغت سے متعلق ہے۔ اس مقدمہ میں مقدمہ نگار نے مراجعت اور نظر ثانی کا دقت طلب اور دشوار گذار کام مولانا عبد القدوس قاسمی کیرانوی اور مولانا وارث مظہری قاسمی کے تعاون سے جو انجام دیا ہے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی عالی ظرفی سے جناب سمیع احمد مونگیری خوشنویس کا بھی ذکر کیا ہے، جنہوں نے اپنے حسن رقم سے اس لغت کے ظاہر حسن کو بڑھایا ہے۔ البتہ مولانا کے خصوصی شاگردوں میں اور الداعی کے تذکرہ کے ساتھ مولانا کے بدر الحسن قاسمی (مقیم کویت) کا تذکرہ بھی ہونا چاہئے تھا۔ مقدمہ میں زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مقدمہ نگار نے لغت کے معنی و مفہوم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عربی کی ۲۰ کتب لغت (بشمول القاموس الجدید، القاموس الاصطلاحی، مصباح اللغات، القاموس الوحید) کا وقیع تعارف کرایا ہے اور ساتھ ہی ان پر دیدہ ورانہ تبصرہ بھی ہے۔ مقدمہ نگار نے اپنے اس مقدمہ میں مصباح اللغات اور القاموس الوحید کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا، اور تقریباً ایک لاکھ الفاظ پر مشتمل 'القاموس الوحید' کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

> ''القاموس الوحید'' میں، جو بلا شبہ جمع بین المعاجم کے زمرہ سے تعلق رکھتی ہے المعجم الوسیط کو اساس قرار دے کر اس کے تمام مواد کے احاطہ کے ساتھ المنجد سے منتخب الفاظ شامل کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں مصباح اللغات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کتاب وسنت اور اسلامی علوم وفنون کی اصطلاحات اور ان کے خصوصی مفاہیم کی تشریح میں، جو اس قاموس کا طرہ امتیاز ہے، مفردات امام راغب اور تاج العروس وغیرہ کے علاوہ قاموس القرآن اور لغات القرآن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ نیز اس قاموس کو دور حاضر کی ضروری اور مروجہ اصطلاحات پر حاوی بنانے کے لئے المورد عربی انگریزی القاموس العصری عربی انگریزی القاموس الاقتصادی، القاموس الطبی، القاموس العسکری اور دیگر قوامیس سے مفید اضافات کئے گئے ہیں[1]۔

---

[1] القاموس الوحید۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی۔ ص ۹۰

مقدمہ کے شروع میں مقدمہ نگار نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''عربی زبان، منبع علوم شریعت، قرآن وحدیث کی زبان ہے، اس لئے اس کے تداول اور تعلیم وتعلم کو آسان سے آسان تر بنانے کی جملہ مخلصانہ مساعی، خدمت دین کا درجہ رکھتی ہیں۔ عربی سے عربی، عربی سے اردو یا اس کے برعکس دیگر زبانوں میں، عربی کے تعلق سے معتبر لغات وقوامیس کی تالیف، ان کاوشوں کا ایک انتہائی اہم حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار کے علماء، اور بالخصوص علمائے متقدمین نے اس کام کو بہت زیادہ اہمیت دی، اور ان میں سے بہت سوں نے اس کو اپنی علمی کاوشوں کا محور ومرکز بنا کر اس عظیم زبان کو اپنی اصلی شکل وصورت میں محفوظ رکھنے کی جلیل القدر خدمات انجام دیں۔ چنانچہ بعض عبقری علماء اور ماہرین عربی لغت نے اس زبان میں فن لغت نویسی کا آغاز کیا اور متعدد معاجم وقوامیس ترتیب دیں''۔[1]

چنانچہ ۱۵ اپریل ۲۰۰۱ء اتوار کو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مقدمہ نگار مولانا عمید الزماں کیرانوی کی ایک سعودی عالم محمد بن عبد العزیز الخضیری سے جب ملاقات ہوئی اور مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ آیا تو شیخ الخضیری نے کہا جزاہ اللہ عن خدمۃ اللغۃ والادب (انہوں نے ادب ولغت کی جو خدمت کی ہے، اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ دے) تو مولانا عمید الزماں کیرانوی نے عربی لغت کی اصل غرض وغایت اور مفہوم ومدعا کو پیش نظر رکھتے ہوئے جواب میں کہا کہ یہ دعائیہ جملہ زیادہ مناسب ہے جزاہ اللہ عن خدمۃ الدین والعلوم الاسلامیۃ (اللہ تعالیٰ انہیں دین اور علوم اسلامیہ کی خدمت کا صلہ عطا فرمائے) اور واقعہ ہے کہ عربی جو قرآن وحدیث کی زبان ہے، اس پس منظر میں یہ دعائیہ جملہ زیادہ معنی خیز ہے۔ جس سے شیخ الخضیری نے بھی اتفاق کیا۔

زیر ذکر کتابِ لغت ''القاموس الوحید'' کی رسم اجراء کی تقریب ۲۸ اپریل ۲۰۰۱ء شنبہ کو بعد نماز عشاء علم وفضل کی سرزمین دیوبند میں محمود ہال کے سامنے منعقد ہوئی۔ دار العلوم دیوبند

[1] القاموس الوحید۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی۔ ص ۵

کے اساتذہ، طلبہ، منتظمین اور معزز شہریوں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ دور اور نزدیک سے آئے ہوئے علماء اور مشائخ کی بھی کثیر تعداد تھی۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے رسم اجراء انجام دیتے ہوئے مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو کتاب کا ایک نسخہ پیش کیا۔ قاضی صاحب نے اپنی تقریر میں احاطہ دارالعلوم میں بیتتے ہوئے دن کی یاد تازہ کی اور اپنے قابل رشک رفیق درس کے بارے میں کہا کہ ان کا اصل کام "مردم سازی" تھا، ان کی وسعت ظرفی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کبھی "اختلاف" کو "عناد" نہیں بنایا۔ انہوں نے مولانا وحید الزماں کیرانوی کی عربی زبان وادب میں وسیع تر مخلصانہ کوشش کو بھرپور انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے "القاموس الوحید" کو اہم ترین اور جامع ترین عربی اردو لغت قرار دیا اور ان کے بھائی مولینا عمید الزماں کیرانوی کی صلاحیت پر اعتماد کرتے ہوئے بجا طور پر ان سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ القاموس الوحید کے انداز پر "اردو عربی لغت" تیار کریں [1] القاموس المحیط اور القاموس الموضوعی کے بارے میں تفصیلات مہیا نہیں ہوسکیں۔

ان گرانقدر آراء کے بعد قارئین اگر چاہیں تو "المنجد"، "مصباح اللغات" اور "القاموس الوحید" کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیں تو آسانی کے ساتھ تقابلی مطالعہ ہوجائے گا۔

قوامیس اور لغات کا کوئی سلسلہ مختتم نہیں ہوتا اور کہیں بھی "تمت بالخیر" نہیں لکھا جاسکتا اس لئے کہ کاروانِ حیات مسلسل سرگرم مقرر رہتا ہے اور جیسے جیسے رواں دواں زندگی منزل ارتقاء کی طرف گامزن نظر آتی ہے ویسے ویسے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آج سے صرف پندرہ سال پیشتر انٹرنیٹ ویب سائیٹ internet, website سائبر کیفے cyber cafe, e-mail انفارمیشن ٹکنالوجی، انفوسائیٹس جیسے الفاظ سے ہم لوگ آشنا تھے۔ بہت سارے الفاظ

---

[1] روزنامہ سیاست۔ مولانا رضوان القاسمی بتاریخ ۱۶/مئی ۲۰۰۱ء

ایسے ہیں جو عام بول چال میں ہمارے یہاں ایک مخصوص معنی رکھتے ہیں ۔عرب ان معانی کا تصور نہیں رکھتے مثلاً ''بور'' کا اپنا ایک دائرہ ہے اس لئے کوئی بھی قاموس کتنی ہی محیط ہوں حرف آخر نہیں ہو سکتی اس وجہ سے بھی کہ نئی نئی بیماریاں وجود میں آرہی ہیں اور مغرب میں عیش پسندی نے نئی نئی راہیں کھول کر لفظوں کی دنیا میں وسعت پیدا کر دی ہے۔

حضرت مولینا کی تمام قوامیس کا جائزہ لینا ناممکن ہے اس کی شرح لکھی جا سکتی ہے لیکن الزبیدی کا ذہن وقلم درکار ہے، اور پھر اتنی ہی فرصت اور معاشی فراغت بھی جو آج کے دور میں درسگاہ میں ممکن نہیں ۔اس لئے حضرت مولینا کی قوامیس کے لئے صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ عربی زبان وادب کے کارواں کے لئے یہ ایسے سنگ میل ہیں جن کے سہارے آگے بڑھا جا سکتا ہے۔

❀❀❀❀❀

مولانا وحید الزماں کیرانوی کی شخصیت کے دوسرے ابعاد

مولانا کی شخصیت کے دوسرے ابعاد

شخصیت کی اکائی پر بحث کرتے ہوئے اکثر لوگ مختلف شخصی ابعاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس طرح ایک انسان کے مختلف اعضاء ہوتے ہیں ان سب کی کارکردگی ہیئت، ساخت مختلف ہوتی ہے۔ ایک ہی انسان کے دونوں ہاتھوں میں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ زیادہ مضبوط اور دوسرا نسبتاً کمزور ہوتا ہے۔ کبھی سیدھا ہاتھ' بایاں ہاتھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے کہیں اکثر کھلاڑیوں کی شہرت اسی بنیاد پر ہوتی ہے کہ یہ left hander ہیں۔ اسی طرح انسانی شخصیت میں بہت سارے رخ ہوتے ہیں اور کوئی ایک رخ حاوی بھی ہوجاتا ہے اور اسی سے اس کی پہچان اور شناخت ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ اس کی شخصیت کے دوسرے گوشے نظر انداز کر دیئے جائیں، حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی مرحوم ومغفور کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو تو ان کا عربی زبان وادب سے والہانہ عشق اور اس کی تدریس تھی۔ لیکن انکے ذوق نے بہت ساری راہیں تراشی تھیں۔ انہیں راہوں میں سیاست بھی شامل تھی۔

مولانا کی سیاسی زندگی:

سیاست کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اقتدار پر قبضہ کیا جائے اور علماء ہند کے اقتدار پر قبضہ کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کے ارادت مند اور معتقدین تھے۔ ان کے مقابل انہیں جیسے علماء تھے انہیں سے معرکہ آرائی ہوتی تھی اور سب سے بڑا اقتدار ان کی نظر میں یہی تھا کہ انہیں علماء کی برادری میں مقتدر سمجھ لیا جائے۔

چوتھی دہائی میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات عروج پر تھے لیکن علماء کی بہت بڑی جماعت مسلم لیگ مخالف تھی اور کانگریس کی ہمنوا تھی ایسے میں حضرت مولینا اشرف علی تھانوی اور بعد میں مولینا شبیر احمد عثمانی، مولینا ظفر احمد عثمانی جیسے دیوبندی مسلم لیگ کے ہمنوا ہو گئے تھے، جب انہیں اس طرف متوجہ کیا گیا کہ جناح صاحب نہ صرف یہ کہ داڑھی نہیں رکھتے بلکہ پابند صوم وصلوٰۃ بھی نہیں ہیں۔ ان بزرگ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ہمیں تو اقتدار ملنے سے رہا اب ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ان کی اصلاح کی جائے اور ان کی نصیحت کی جائے اور تبلیغ کا فریضہ انجام دیا جائے۔

معلوم نہیں ان تبلیغات کا جناح صاحب، نواب زادہ لیاقت علی خاں اور اسی قبیل کے عمائدین پر کیا اثر ہوا اور وہ پابند صوم وصلوٰۃ ہوئے یا نہیں لیکن یہ ضرور ہوا کہ علماء کی ایک بڑی کھیپ مسلم لیگ میں شامل ہو گئی اور قیام پاکستان کے بعد یہ بزرگ پاکستان چلے بھی گئے، لیکن ہندوستان میں علماء کی اکثریت رہی اور یہ لوگ اسی مدرسۂ فکر سے وابستہ رہے جس کا نقطہ آغاز حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولینا محمد قاسم نانوتوی شیخ محمود الحسن دیوبندی اور شیخ الاسلام حسین احمد مدنی تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مولینا ابوالکلام آزاد فکر کے اعتبار سے دیوبند سے کوسوں دور تھے ان کے یہاں جو عصری تجدد تھا جو modernity تھی وہ جمعیت علماء ہند کے علماء کرام کے یہاں ممکن بھی نہیں تھی لیکن ملک کے سیاسی پلیٹ فارم پر یہ سب لوگ ایک ہی ساتھ ہی رہے۔ ۱۹۴۷ء تک جمعیۃ علماء ہند کا دائرہ کار اور حیطۂ عمل بالکل الگ تھا اور اس وقت کوشش یہ تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ جب تصادم اور مقابلہ کی صورت ہوتی ہے تو اس وقت اس میں پھرتی، کارکردگی اور قوت عملی پورے طور سے بیدار ہو جاتی ہے، اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تک جمعیۃ العلماء کے پاس دو محاذ تھے ایک پر کانگریس کے شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف صف

آرائی تھی لیکن اس سے بھی بڑا محاذ مسلم لیگ کے خلاف تھا۔ یہاں اپنوں ہی سے مقابلہ تھا اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت جمعیت کے طرز فکر اقلیت میں تھی اور مسلم لیگ کا جارحانہ انداز مسلمانوں کی نفسیات پر چھا گیا تھا' مولینا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کو لارڈ ہاہا کو نزلنگ اعظم اور شوبوائے کے خطابات سے نوازا گیا تھا جتنی توہین تحقیر، تضحیک ممکن تھی وہ سب ان کے لئے روا رکھی گئیں۔ جمعیۃ العلماء سے وابستہ علماء کے لئے اردو شاعری کا نہایت شاندار استعارہ "شیخ" کو منتخب کیا گیا اور بیشمار نظمیں لکھی گئیں۔ اس سلسلے میں کچھ شعر دستیاب ہوسکے درج کئے جارہے ہیں۔

شیخ سے میں نے ایک دن عرض کیا مکرمی
عالم دین ہیں حضور اور ہیں نائب نبی
آپ کو کیا ہوا کہ آپ غیر کے بندے ہو گئے
لالہ کے در پہ نے رکھ دی جبیں بندگی
سنتے ہی شیخ یہ سخن جامہ سے باہر ہو گئے
دین عربی میں گالیاں بولے یعنی دوزخی
تو ہی بتا کہ جب نہ ہو روٹیوں کی کوئی سبیل
تجھ کو چبائیں یا کریں جا کر جائے کسی کی نوکری
ہم کو تو توند بھرنی ہے توند یہ گھیر دار توند
جسکو دین و دل عزیز اسکی گلی میں کیوں جائے

یہ صرف ایک مثال ہے ایسے ہزاروں شعر اس زمانے میں زبان زد خاص و عام تھے ان سے اس کی عہد کے عوامی مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علما کو اپنوں ہی کے جگر خراش طعنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن یہ لوگ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

مسلم لیگ کی جارحانہ سیاست کے نتیجہ میں ملک کی تقسیم ہوئی اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان میں صبح آزادی نمودار ہوئی۔ ۱۴/ اگست کو پاکستان بن چکا تھا مگر ۱۹۴۶ء ہی سے

مسلم لیگ کے براہ راست اقدام کے نتیجہ میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا کلکتہ کا قتل و عام نواکھائی بہار اور پھر پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی ایسے عالم میں خونی اُفق سے آزادی کا آفتاب طلوع ہوا تھا اور اس عرصہ میں جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے اور ان فسادات میں حضرات علما کرام کو بہ یک وقت کئی محاذ پر بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی ملی مگر لیکن ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ ناکام سیاست ان کا ساتھ چھوڑ گئی مولینا آزاد نے جامع مسجد میں اپنے تاریخی خطبہ میں اس طرف متوجہ کیا کہ جس دیوانگی اور جنون کے ساتھ مسلمان ہندوستان سے پاکستان جا رہے ہیں وہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے سم قاتل ہے۔

جو قومی ملی اخلاقی زوال پستی اور اضمحلال پیدا ہو رہا تھا اسکا مداوا کرنے اور اسکا مقابلہ کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدر آباد نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

اب تک جو امید بھری نظریں اُٹھتی تھی اب وہ نگاہ واپسیں میں بدل گئیں اور سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں جو چار پانچ کروڑ مسلمان باقی رہ گئے ان پر پڑنے والی نگاہیں بوڑھے سود خوروں کی نظروں اور مئی کے مہینہ میں سورج کی کرنوں کی طرح ان کے پورے وجود سے وفاداری کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اور کچھ افراد کا طرز عمل بھی ایسا ہوا جس کی وجہ سے مطالبہ وفاداری میں معقولیت بھی نظر آنے لگی ایسے ایسے مسلمانوں نے ترک سکونت کی تھی جنھیں ہندوستان میں ساری آسائشیں اور سہولتیں میسر تھیں۔

مگر یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ وطن سے وفاداری کا مطلب ہوتا ہے وطن کے مفادات کی پاسداری اور کچھ افراد کے عمل پر پوری قوم کے بارے میں سرٹیفکٹ جاری کرنا نہایت ناروا بات تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی برف پوش پہاڑیوں کو اپنے خون کی حرارت سے وطن پرستی کی تابندہ کہانی لکھنے والا بریگیڈیر عثمان بھی تھا۔

یہ لکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ٹوٹ پڑے تھے، ٹرینوں میں سفر کرنے والے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سفر کرتے تھے۔ دلّی میں پہاڑ گنج اور قرول باغ کے محلے خالی ہو گئے تھے اور چاندنی چوک میں رات ہی رات تھی اور جامع مسجد میں اللہ کی ذات تھی۔

اس پس منظر میں علماء حق کے کارناموں کو سمجھنا چاہئے اپنے ہم مذہب افراد کی زبانوں کے زخم کھائے ہوئے مجروح وستم رسیدہ مگر باہمت اور صاحب یقین عبا بردوش اور عمامہ بر سر افراد کا ایک کارواں تھا۔ جو فساد زدہ علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ جنونی یا وحشی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کی وفاداریوں پر انگلی اٹھا سکتا۔ یہ تمام مسلمانوں کو بظاہر راحت، رسانی باز آباد کاری، مغویہ عورتوں کی بازیابی کی دولت بانٹ رہے تھے۔ مگر درحقیقت یہ صرف دو کام کر رہے تھے وہ "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللہِ" والا پرانا سبق یاد دلا رہے تھے اور یہ یاد دلا رہے تھے کہ جتنے لمحات بھی زندگی کے باقی بچے ہیں وہ اللہ کے لئے ہوں۔

۱۹۵۰ء تک ماحول بدلنے لگا مولینا حفظ الرحمن سیوہاروی شیخ الاسلام کے دست راست تھے مفتی کفایت اللہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ مولینا آزاد کی کوہ وقار شخصیت حوصلہ بڑھا رہی تھی، چنانچہ نوعمر دینی طالب علموں نے بھی ان بزرگوں کے مشق کو آگے بڑھایا اور پھر ۵۶۔۱۹۵۵ء تک حالات معمول پر آگئے تھے۔

اب ان علماء کے تاریخی کردار کو پیش کرتے ہوئے بے اختیار یہ لکھنے کو دل چاہتا ہے کہ:

زمانہ یاد رکھے یا صبا کرے خاموش
ہم اک چراغ محبت جلائے جاتے ہیں

یہ جو چراغ روشن ہوا تھا اس نے اپنا تاریخی فریضہ تو انجام دیا لیکن پھر اس کے بعد دھیرے دھیرے پرانی نسل کے لوگ اٹھتے گئے نئی نسل جو آئی اس میں نہ وہ خلوص تھا نہ ان لوگوں نے وہ شوائد برداشت کئے تھے۔ ایک نرم رواں دواں زندگی ملی تھی۔ اس لئے بتدریج

جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں اضمحلال پیدا ہوتا گیا لڑنا تو تھا ہی وہ محاذ ختم ہو گئے تھے اس لئے اب آپس میں ہی لڑنا شروع کر دیا تھا نتیجہ میں ساتویں دہائی تک پہنچتے پہنچتے جمعیۃ علماء ہند اپنی سنہری روایات اور شاندار تاریخی ورثہ کے ساتھ نشتند، گفتند و برخاستند والی تنظیم بن کر رہ گئی۔

اصل میں کوئی ایسا مسئلہ بھی تو نہیں رہ گیا تھا جسے بنیاد بنا کر جمعیۃ کوئی پروگرام دے سکتی سیاسی اور تہذیبی جماعتیں بہرحال افراد کے گرد گھومتی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک جمعیۃ کی فضا پر چھائے رہے۔ بیچ میں تیس سال کا وقفہ ایسا ہے جب کوئی موضوع نہیں رہ گیا تھا اور عموماً یکساں سول کوڈ کی مخالفت مسلم یونی ورسٹی کا اقلیتی کردار، پرسنل لاء کو دوہراتے رہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ علاقائی بنیادوں پر بہت ساری تنظیمیں ابھر آئی تھیں (آندھرا پردیش میں انجمن اتحاد المسلمین، جناب بنات والا اور ابراہیم سلیمان سیٹھ کی مسلم لیگ، اترپردیش میں مسلم مجلس وغیرہ)۔

اب تو جمعیۃ کا اخبار الجمعیۃ جس کے ادارے اور شذرات حضرت مولینا فارقلیط کا نتیجہ فکر ہوا کرتے تھے اور جسے پلکوں پر جگہ دی جاتی تھی...... صرف ایک خواب رہ گیا ہے۔ جمعیۃ کی مختصر تاریخ وتعارف ایک کتابچہ کی شکل میں نظر سے گذرا جس پر سن اشاعت تو درج نہیں ہے مگر معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ سنہ ۲۰۰۰ء تک کی تاریخ ہے۔ اس کتابچہ میں حضرت مولینا وحید الزماں کا کہیں تذکرہ نہیں ہے البتہ مولینا فصیح الدین دہلوی نے جو مضمون لکھا ہے۔ اس کی کچھ سطور پیش خدمت ہیں:

> ''مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کا جمعیۃ علماء ہند سے تعلق اور وابستگی تو پشتینی ہے۔ ان کے والد محترم مولانا مسیح الزماں صاحب کانگریس اور جمعیۃ کے سرگرم اور فعال رکن تھے۔ انھوں نے تحریک آزادی کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا، جیل بھی گئے۔ ان کی فکری اور ذہنی پختگی اور صلابت رائے کا یہ ثبوت ہے کہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مسلم لیگ کے ساتھ تھے، بلکہ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کے اہم ترین رکن اور روحِ رواں

تھے۔ان کا ذاتی اور شخصی تعلق مولانا مسیح الزماں صاحب سے اس درجہ کا تھا کہ جب بھی کیرانہ تشریف لاتے تو قیام مولانا مسیح الزماں ہی کے گھر پر ہوتا تھا۔ اس دور کی سیاست آج کی "مفاد پرستی" اور "مصلحت بینی" کے جراثیم سے پاک تھی۔کیا مجال ہے کہ تعلق اور وضعداری کے اس بلند درجہ پر فائز ان حضرات کی نیت پر کسی کو شک بھی ہو جائے۔مولانا مسیح الزماں صاحبؒ کے ساتھ کانگریس کے جو ورکر میں یا حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مسلم لیگی ہمنوا ممکن نہیں کہ اپنی قیادت کو ذرا بھی شک کی نگاہ سے دیکھیں۔اس ڈسپلن اور انضباط کے پیچھے اصل قوت قیادت کے بلند کرداری تھی۔ان حضرات کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ان کی خلوت وجلوت میں کوئی فرق نہیں تھا۔یہ اسٹیج پر جو کہتے تھے اس پر ہر حال میں ثابت قدم رہتے تھے۔اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جمعیۃ سے ذہنی تعلق اور فکری وابستگی مولانا وحید الزماں مرحوم کو اپنے والد محترم سے وراثت میں ملی تھی"[1]۔

لیکن مولینا وحید الزماں جمعیۃ میں بہت فعال اور کارکرد نظر نہیں آتے، وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔جو زمانہ انہیں ملا تھا اس زمانہ میں ہفتہ وار ماہانہ اور سالانہ فسادات ہوا کرتے تھے۔ان فسادات کو "فساد" کہنا یقینا ظلم و زیادتی ہے اسلئے کہ یہ یک طرفہ قتل عام تھے، مگر مولینا وحید الزماں کسی موقع پر سیاسی طور پر کوئی ایسا کارنامہ انجام دیتے نظر نہیں آئے جو قابل ذکر ہو۔

جناب فصیح الدین نے پوری تفصیل سے تقریباً بیس صفحات میں نہ تو جمعیۃ علماء ہند کے کارناموں کا ذکر کیا ہے نہ اس کے ترمیمی ڈھانچہ کا...... انہوں نے صرف حضرت مولینا اسعد مدنی پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ان کا موضوع مولینا وحید الزماں تھے لیکن وہ یہ بھول کر کہ ان کا موضوع کیا ہے وہ مولینا اسعد کی خامیوں کی نشاندہی کرتے رہے مگر کہیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری قبول کرنے کے علاوہ مولینا وحید الزماں نے کیا مثبت اور تعمیری رخ اپنایا۔مراد آباد فساد کے موقع پر مولینا کی تقریر کا تذکرہ ہے، لیکن وہ تقریر کیا تھی اور اس کے اثرات کیا مرتب ہوئے اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔بھاگل پور میں لرزہ خیز فسادات

---

[1] ترجمان دارالعلوم دیوبند ۴۹۹۔۴۹۸

ہوئے' جمشید پور تو ایسا جلا کہ پڑھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور ان سب پر مستزاد ۶ / دسمبر ۱۹۹۲ء کی تاریخ اور اس کے مضمرات سے مولینا وحید الزماں بے خبر نہ تھے لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں کیا اقدامات کئے۔ اس کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہوتی۔ اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رکن سے اس طرح کے مطالبات کرنا مناسب نہیں۔ اس بات میں بڑی حد تک معقولیت ہے مگر اسی کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ مولانا وحید الزماں سیاست میں "قائد" نہیں بلکہ "ورکر" تھے اور اس اعتبار ان کی زندگی کے سیاسی رخ پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

مولینا فصیح الدین نے مولینا اسعد صاحب کے سیاسی مزاج پر ذرا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی روشنی ڈالی ہے۔ یہ بتایا ہے کہ مولینا عمید الزماں (برادر مولینا وحید الزماں) نے دو سال تک اکیڈمی قرآن عظیم میں کام کرتے رہے۔ خود فصیح الدین صاحب نے ذمہ داریاں سنبھالی انہوں نے اپنی جو یادداشتیں پیش کی ہیں ان میں مولینا اسعد مدنی سے وفود کے ملنے کے تذکرے کئے ہیں۔ اور حتی الامکان یہی محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں مجاہد ملت مولینا حفظ الرحمن کے انتقال کے بعد سے جمعیۃ علماء ہند کی آب و تاب مدھم پڑنے لگی تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولینا اسعد بہت بڑے باپ کے بیٹے تھے حکومت نے ان کو راجیہ سبھا کی ممبری "عطاء" کی جسے انہوں نے قبول کیا۔ اس کے بعد سے جمعیۃ کا کردار قطعی غیر کار کردرہا، دراصل کوئی ایسا موضوع نہیں رہ گیا تھا جس کی بنا پر حضرات علماء کرام انداز گل افشانی گفتار کا مظاہرہ کر پاتے گھوم پھر کر ذاتی یا گروہی اختلافات تھے' جسکا ایک مظاہر ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک کے درمیان دار العلوم دیوبند تک کے سلسلہ میں ہو چکا تھا۔ اور جس سے جمعیۃ کے وقار اور ساکھ کو نقصان زیادہ پہنچا تھا، فائدہ بالکل نہیں ہوا۔

دراصل تنظیم کے بنیادی ڈھانچہ میں جمہوری طریقہ کار کی جھلک رہتی ہے جس سے تنظیم بڑھتی ہے اور جہاں عوامی رشتے توڑ دیئے جاتے ہیں اور خاندانی رشتے وجود میں آجاتے

ہیں وہاں تنظیموں کا جو حال ہوتا ہے اس سے آج کا باشعور طبقہ بخوبی واقف ہے۔ سیاست میں خاندانی اثر ونفوذ کی کارفرمائی کی ساری مثالیں قارئین کے سامنے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ کیا جا رہا ہے بہر حال جیسے ہی خاندانی اور گھریلو فضا پیدا ہوئی ویسے ہی تنظیم کا عوامی کردار رخصت ہوا اور جب یہ ایک کردار رخصت ہوا تو نہ جماعت کارکردہ جاتی ہے اور نہ ہی اس کی تاریخ میں کوئی جگہ رہ جاتی ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے سلسلہ میں فصیح الدین صاحب نے کچھ واقعات درج کئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

"جون/ ۱۹۷۵ء میں جب آنجہانی اندرا گاندھی کے خلاف الہٰ بادہائی کورٹ کا فیصلہ آیا تو ایک طوفان برپا ہوگیا۔ جلسے، جلوس، مظاہرے اور اندراجی کی حمایت میں کانگریس نے عوام کو اکسا کر کھڑا کر دیا۔ غالباً ۲۱ یا ۲۲/ جون ۱۹۷۵ء کی بات ہے' بعد نماز ظہر دس بارہ افراد کا ایک وفد صفدر جنگ روڈ روانہ ہوا مولینا اسعد صاحب' مولینا محمد میاں صاحب مرحوم' مولینا نور اللہ صاحب مرحوم' حاجی فاروق صاحب مرحوم' حکیم عبد الجلیل صاحب مرحوم وغیرہ شریک تھے"۔[1]

اس پوری فہرست میں مولینا وحید الزماں کا نام کہیں نہیں ہے۔

آگے مولینا فصیح الدین لکھتے ہیں:

"یہ بات مئی ۱۹۸۱ء کی ہے' عراق کے وزیر اوقاف فیصل نوری شاہ ہندوستان آئے' انکے ساتھ عراق کے سنی اور شیعہ علماء کا ایک وفد تھا' اس وقت عراق اور ایران کے درمیان جنگ جاری تھی' سفیر عراق فاضل عزاوی نے اپنی رہائش گاہ واقع پرتھوی راج روڈ نئی دہلی میں عشائیہ کا اہتمام کیا۔ مدعوئین میں زیادہ تر علماء اور مسلم زعماء تھے۔ کھانے سے پہلے مہمان جمع تھے۔ اسی اثناء میں وزیر کے ہمراہ انکے اسٹاف کے جو لوگ ساتھ تھے وہ میرے پاس آئے ایک صاحب کے ہاتھ میں قلم اور نوٹ بک تھی۔ انہوں نے بڑے اہتمام اور سنجیدگی سے دریافت کیا" ماهي مؤلفات الشيخ" (شیخ اسعد کی تصانیف اور تالیفات کیا ہیں؟)"[2]

---

[1] ترجمان دار العلوم دیوبند ۴۹۹۔۴۹۸　[2] ترجمان دار العلوم دیوبند ۴۹۹۔۴۹۸

یہیں سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولینا فصیح کا زاویہ نظر کیا ہے۔ انہوں نے آسام میں مسلمانوں کے قتل کے سلسلہ میں کچھ وفود کا ذکر کیا ہے اور اس میں بھی یہی رخ سامنے آتا ہے کہ حضرت مولینا اسعد مدنی کے علمی وقار و منصب پہ سوالیہ نشان لگایا جائے' لیکن عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان تمام مواقع پر حضرت مولینا وحید الزماں کا کیا رویہ رہا۔ صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں ان کی شعلہ بیانی کا تذکرہ ہے۔

مولینا عزیز الحسن صدیقی لکھتے ہیں:

''لوگ اس وحید العصر اور یگانہ روزگار عالم دین اور میدان ادب کے شہسوار کو سننا چاہتے تھے۔ جو الفاظ سے تیرو نشتر کا کام لینا جانتا ہے......... مولینا مرحوم کی یہ تقریر ایک میجر آپریشن سے کم نہ تھی جس میں گوشت و پوست کے کچھ حصے کاٹنے پڑتے ہیں''۔[1]

یہ ۲۵/ دسمبر ۱۹۸۷ء کے شوکت منزل غازی پور کے ڈاکٹر انصاری ہال کا بیان ہے اس میں سب کچھ مولینا کیرانوی کی توصیف میں لکھا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت مولینا نے کیا ارشاد فرمایا تھا اور وہ آپریشن کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

''اس اجتماع کے بعد کیا ہوا دنیا جانتی ہے۔ ضابطہ کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا گیا۔ جماعت سے ہمارا اخراج ہوا۔ اچھا ہوا کہ ہم اپنے جلتے ہوئے گھر سے نکل آئے''۔[2]

تھوڑا بہت تقریر کے بارے میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مولینا نے ماضی کے علماء کی تاریخ بیان کی ہوگی۔ صاحبان اقتدار سے ان کے ٹکر لینے کا تذکرہ کیا ہوگا لیکن جسے ''رہنمائی'' کہتے ہیں ان رہنمایان خطوط کا کوئی بیان نہیں مولینا فصیح الدین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''مولینا نے مجھ کو بتایا کہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جب کوئی ممبر کسی موقع پر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہے، یا کھل کر بولنے کی کوشش کرتا ہے، تو بعض اوقات خود صدر محترم اس کو سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ڈانٹ دیا (ایک مشہور عالم اور

---

[1] ترجمان دار العلوم۔ ص ۴۹۱ [2] ترجمان دار العلوم۔ ص ۴۹۱

پرانے رکن جن کا انتقال ہوگیا۔۔۔ ان کو مولینا اسعد صاحب اکثر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔۔۔ نام ذکر کرنا مناسب نہیں۔۔۔۔۔) مولینا وحید الزماں صاحب مرحوم نے مجھے کئی بار یہ بات بتائی ان کو بہت افسوس ہوتا تھا۔ ساتھ ہی مرحوم نے یہ تضاد بھی دیکھا کہ کمیٹی کے ایک "تاجر رکن" جو گفتگو کرتے ہیں تو صدر اجلاس کا رویہ ان کے ساتھ بہت زیادہ نرم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خود ممبران میں سے بعض حضرات کا رویہ اکثر یہ رہتا تھا کہ اگر کسی نے بھی "سرکاری موقف" کی مخالفت تو کیا! اس کے پہلو پر گفتگو کرنے کی کوشش کی تو اس کو یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ "جو حضرت کی رائے ہے وہ ٹھیک ہے۔" [1]

اس اقتباس سے مولینا فصیح صاحب کے مطابق جمعیۃ کی جو اندرونی فضا تھی اس کا اندازہ ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولینا حفظ الرحمن کے بعد جمعیۃ کی سیاسی کارکردگی تقریباً نہیں کی منزل پر آگئی تھی۔

حضرت مولینا کی سیاسی زندگی کے رخ کے بارے میں مولینا فصیح الدین مزید لکھتے ہیں:

"مولینا وحید الزماں مرحوم بہت جم کر خود اعتمادی سے مدلل انداز میں بولتے تھے۔۔۔۔۔ ۱۹۸۰ء میں عید الفطر کی نماز کے وقت مراد آباد میں پولس نے نمازیوں پر فائرنگ کی تھی اور ایک بڑا فساد برپا ہوگیا تھا۔ اس موقع پر مولینا اسعد صاحب نے ایک نمائندہ اجتماع طلب کیا تھا۔۔۔۔ مولینا وحید الزماں صاحب نے فساد کے متعلق بہت سے امور اور گوشوں پر ایک بے حد پرجوش مدلل اور مسکت تقریر کی کہ حاضرین دنگ رہ گئے"۔ [2]

مگر یہ مسکت تقریر کیا تھی فسادات اور فرقہ واریت جارحانہ ہندو فرقہ پرستی یا مسلمان فرقہ پرستی یا مسلمانوں میں احساس کمتری کے اسباب وعوامل پر مولینا کا کیا نظریہ تھا اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

حضرت مولینا کے سیاسی کردار کے بارے میں مولینا فضیل احمد قاسمی لکھتے ہیں کہ:

"میں نے مولینا مرحوم کو ہر میدان میں قریب سے دیکھا ہے۔۔۔ اور جب جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور جمعیۃ علما ہند سے علیحدگی کے بعد انتقامی جدوجہد کے

---

[1] ترجمان دارالعلوم　　[2] ترجمان دارالعلوم

بجائے ایک صاحب نظر، وسیع الظرف شخصیت کی طرح مثبت رویہ اپنا کر ملی جمعیۃ علماء کی صدارت قبول فرمائی اور تادم آخر مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے منصب صدارت پر فائز رہے''۔ [1]

ملی جمعیۃ علماء یا مرکزی جمعیۃ علماء بالکل اسی طرح کی ایک جماعت تھی کہ جس طرح کچھ عرصہ قبل نرسمہا راؤ سے ناراض ہو کر نارائن دت تیواری اور ارجن سنگھ نے ایک کانگریس بنالی تھی اور بعد میں پھر اسی میں ضم ہو گئے، یہ اس طرح کی نجی تنظیم نہیں تھی جس طرح Nationalist Congress Party (شرد پوار والی) ہے۔

مولینا فضیل صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت مولینا کی منظوری افسوس ہے کہ ان لوگوں کو بھی جو مجھ سے اور حضرت مولینا سے برابر کا تعلق رکھتے تھے، ان لوگوں نے ہر طرح حضرت مولینا کے ذہن کو خراب کرنے اور مرکزی جمعیۃ سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت مولینا بات کے دھنی اور پختہ عزم و فیصلہ کے انسان تھے۔ کسی ایک کی نہ سنی اور فرمایا کہ میں نے نیک نیتی سے جو فیصلہ کرلیا ہے اسی پر قائم رہوں گا...... تقریباً یہی الفاظ حضرت مولینا نے مرکزی جمعیۃ علماء کے تاسیسی جلسہ عام میں بھی کہے تھے۔'' [2]

حضرت مولینا وحید الزماں کے سیاسی بصیرت پر جناب عبدالرحمن عابد نے بھی مضمون لکھا ہے اور مضامین سے الگ ہٹ کر ان کے مضمون سے کچھ حضرت مولینا کیرانوی کے سیاسی طریقہ کار کا اندازہ ہوتا ہے۔

انہوں نے ایک انٹرویو کا ذکر کیا ہے:

''ہم لوگوں نے مولانا کا تفصیلی انٹرویو لیا تھا جو دہلی کے اُردو اور میرٹھ و سہارن پور کے ہندی اخبارات میں شائع ہوا تھا، اس وقت مجھ سے زیادہ میرے ساتھیوں نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ طلباء میں اپنی بے پناہ مقبولیت و عظمت کا فائدہ اٹھا کر ایک نیا انقلاب برپا کر سکتے ہیں اور اس کام میں پریس ان کا معاون

[1] ترجمان دارالعلوم [2] ترجمان دارالعلوم

ہوگا۔اس وقت مولانا نے اپنی علالت اور دوسری اہم مصروفیات کا عذر پیش کر کے ہم لوگوں کو مطمئن کر دیا مگر بعد میں جب اُن صحافی دوستوں کو رخصت کرنے میں چند منٹ کے لیے پھر واپس آیا اور اس سلسلہ میں مولانا سے سوال کیا تو انھوں نے جو بات کہی وہ آج بھی ہم سب کے لیے خصوصاً ہمارے قائدین اور زعماء کے لیے سبق آموز ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ذاتی جذبات کی وجہ سے یہ پیش کش میرے لیے بھی پُرکشش ہے، لیکن اس کے پیچھے عوامل کیا ہیں ان کو بھی ہمیں نظر میں رکھنا چاہئے۔اگر اسے دارالعلوم بحران کا شکار ہوگا، علماء کی بدنامی ہوگی، اور طلباء کا نقصان ہوگا اور سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کے وقار مجروح ہونے کا ہوگا، ہمارے اکابر کی توہین ہوگی وغیرہ"۔

"دوسری مرتبہ سیاسی موضوع پر گفتگو کا موقعہ وفات سے تقریباً ایک برس پہلے ہی ملا تھا جب راقم الحروف نے ایک صحافتی مقصد سے ملاقات کی تھی۔تقریباً ڈھائی یا تین گھنٹے کی ملاقات میں بہت سے سیاسی مسائل اور معاملات پر گفتگو ہوئی، اس موقع میرے ایک دوست حافظ عبدالستار صاحب ساتھ تھے۔مولانا سے ملی مسائل میں اشتراک وتعاون اور اتحاد کے مسئلہ پر بات ہوئی، ملی کونسل کے ذمہ داروں سے رابطہ کا ذکر ہوا، ساتھ کام کرنے کی بات ہوئی، آمادگی کا اشارہ ملا لیکن افسوس کہ یہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔اس ملاقات میں مولانا سے جہاں اور بہت سے موضوعات پر کھلے ماحول میں گفتگو ہوئی وہیں مسلمانوں کے جذباتی مسائل پر بھی مولانا نے مدلل اور مفصل روشنی ڈالی۔اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دینی اور شرعی معاملات میں کسی بھی قسم کا سمجھوتہ ہرگز نہ کرنا چاہئے لیکن جو چیزیں ان کے اختیار اور طاقت سے باہر ہیں ان میں اپنی صلاحیتوں کو ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اپنی تمام تر توجہ اپنے مستقبل کی تعمیر بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور مستقبل کے سیاسی منصوبے پر صرف کرنی چاہئے، مسلمانوں کو معاشیات، تجارت وصنعت پر خاص توجہ دینی چاہئے تاکہ آنے والے بیس برس کے بعد وہ ایک مضبوط معاشی اور سیاسی قوت بن کر کھڑے ہوسکیں، ان کی آمدنی اتنی ہو کہ اکثریت انکم ٹیکس دینے والوں کی ہوتا کہ کوئی انھیں اپنے اوپر اور ملک کے اوپر بوجھ نہ سمجھے۔اگر مسلمان ان اصولوں کو اپنا کر صرف پانچ برس کے لیے بھی جذباتی مسائل کو ملتوی کر دیں تو یقینی طور پر جذباتیت کے مسائل آدھے سے زائد خود ہی دم توڑ دیں گے اور باقی

آدھے مسائل کو پیدا کرنے والے عناصر پانچ برس کے بعد خود ہی اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ وہ مسائل پیدا ہی نہیں کر سکیں گے۔

مولانا کی سیاسی بصیرت بہت زبردست تھی، یہ بہت لوگوں کو معلوم ہوگا...... اچھا ہو کہ اس پر کوئی اور بھی قلم اٹھائے۔!"[1]

اس سلسلہ میں ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

مولانا نے زندگی بھر کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کی لیکن وہ سیاسی حالات سے کبھی غافل بھی نہیں رہے۔ ملی سرگرمیوں کے لیے انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز اکابر کی معتبر اور نیم سیاسی تنظیم جمعیۃ علماء ہند کو بنایا۔ اور طویل عرصے تک اس کے پلیٹ فارم سے ملی سرگرمیوں میں نہ صرف حصہ لیتے رہے بلکہ قائدانہ کردار ادا کیا، انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کو عرب دنیا میں متعارف کرایا، اس کے لیے عربی جریدہ "الکفاح" جاری کیا اور دیگر راستے اور اسباب بھی اختیار کیے۔ مولانا کا سیاسی نظریہ ان کے استاد گرامی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے مطابق تھا۔ جمعیۃ کی موجودہ قیادت پر مولانا کو عدم اعتماد کا احساس ہوا تو خاموشی کے ساتھ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ بعد میں ملی جمعیۃ کے بانی صدر منتخب ہوئے اس کے بعد مرکزی جمعیۃ کا قیام عمل میں آیا تو ان تمام تحریروں کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولینا کی سیاسی بصیرت اور سیاست سے دلچسپی ایک عام آدمی کی دلچسپی کی طرح تھی ادبا یہ عرض ہے کہ وہ ایک اچھے مقرر اور بالغ نظر ادیب تھے لیکن عظیم سیاسی مدبر و مفکر بننے کی راہ میں وہ زیادہ دور چل نہ پائے، ان کا دور عروج آٹھویں دہائی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور ہندوستان میں یہی مسلمانوں کا دور ابتداء رہا ہے۔ دھیرے دھیرے ملک کی ہوائیں اور فضائیں فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہوتی گئیں اور مسلمانوں میں کوئی لیڈر ایسا نہیں تھا جو کانگریس کو لگام لگا سکتا اور جس طرح کے حالات پیش آ رہے تھے جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت میں ظاہر ہوا اور اسی کے بعد جس طرح گجرات اور دوسرے

---

[1] ترجمان دارالعلوم ص ۵۱۹

مقامات پر فرقہ واریت کا ننگا ناچ ہوا اس کے لئے شاید علماء اپنا تاریخی کردار ادا نہ کرسکے اور ملت مسلمہ کو جس انتشار اور بحران سے گذرنا پڑا وہ اظہر من الشمس ہے۔

حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی کا انتقال ۱۵/ اپریل ۱۹۹۵ء کو ہوا، ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کچھ پہلو ابھی اور پیش کئے جائیں گے لیکن جہاں تک، ان کی سیاسی شخصیت کا سوال ہے علمی دیانت، کا یہ تقاضا ہے، کہ یہ لکھا جائے کہ حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی سیاسی اعتبار سے کوئی نمایاں اور قائدانہ کردار ادا نہ کرپائے مولینا نے ابنائے دیوبند یا مرکزی جمعیۃ علماء یا ملی جمعیۃ علماء سے دلچسپی لی لیکن یہ تنظیمیں وقت کے ریگزار پر اپنے نقش نہ ابھار سکیں، تنظیم ابنائے قدیم بے شک فعال اور کارکردہے مگر اس کی کارکردگی کے پس منظر میں اور عوامل بھی ہیں۔ مثلاً یہی کہ اس تنظیم نے مولینا پر ایک نمبر شائع کیا مگر اس سے الگ ہٹ کر کوئی اور علمی کام کسی اور شخصیت سے متعلق تالیفات یا کسی اور طرح کی تنظیمی کارکردگی کا نمونہ کم از کم اپنی کم علمی کی وجہ سے راقمۃ الحروف کو نہ مل سکا۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پہلو دار شخصیتوں میں بہت سے اجزاء وعوامل ہوتے ہیں، کئی رخ اور جہتیں ہوتی ہیں، کچھ میں اتنی صلاحیت اور قوت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے رخ پر حاوی ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے دوسرے رخ اتنے روشن نہیں رہ جاتے۔

حضرت مولینا کے ساتھ جو سب سے اہم نکتہ تھا وہ ان کی عربی زبان وادب سے وابستگی تھی اور یہ رخ اتنا روشن اور تابناک تھا کہ وہ دوسرے "جہانوں" کی تخلیق کرسکے اور نہ وہاں جا کر خوش رہ سکے اس لئے کہ ان دیگر جہانوں میں ان کے لئے اجنبیت تھی اور نتیجہ میں وہ فضا ان کو نامانوس معلوم ہوتی تھی۔ جہاں فضاء نامانوس معلوم ہوتی ہے اور جہاں احساس اجنبیت ہوتا ہے وہاں اختلافات پنپتے ہیں اور تصادم ہوتا ہے۔

چنانچہ اختلافات کی وہ زیریں لہر جو دارالعلوم کے تنظیمی ڈھانچہ سے متعلق تھی وہی لہر جمعیۃ علماء ہند میں بھی نمایاں رہی اور حضرت مولینا وحید الزماں کی جمعیۃ علماء سے وابستگی اور

علیحدگی دونوں کے پس منظر میں ایک ہی شخصیت محور کے طور پر نظر آتی ہے اور سیاست میں شخصی وابستگی شخصیات کے گرد رابطے کے تانے بانے نہیں بنے جاسکتے۔

سیاسی نظریات سے وابستگی اور ایک طرح کے Commitment کے ساتھ عوامی رابطہ کا مطالبہ کرتی ہے، عوامی رابطے کی بنیاد پر عوامی تائید حاصل ہوتی ہے اور اسی سے عوامی تائید کے سہارے سیاست کا قافلہ آگے بڑھتا ہے۔

حق یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کو ۱۹۴۷ء تک اپنا ایک تاریخی کردار اور تاریخی فریضہ ادا کرنا تھا جیسا ماحول تھا جیسی فضاء تھی ویسے ہی افراد بھی جمعیۃ میں تھے اور جمعیۃ تین محاذوں پر مردانہ وار لڑی انگریزوں کے خلاف ہندو فرقہ پرستی کے خلاف اور مسلم فرقہ واریت کے خلاف۔

آزادی مل گئی مسلم فرقہ پرستی پاکستان تشریف لے گئی رہ گئی ہندو فرقہ پرستی تو اس کا مقابلہ کرنے کیلئے جس طرف، جس قائدانہ صلاحیت اور سیاسی بصیرت روشن افق اور ایثار وقربانی کا پس منظر ضروری تھا وہ ۱۹۶۰ء کے بعد کی لیڈر شپ پیدا نہ کرسکی اور جس طرح عجم کے لالہ زاروں سے پھر کوئی نہ اٹھا اور کنارہ وادی سے کسی اقبال کی آواز نہ گونج سکی اس طرح دیوبند سے بھی کوئی حسین احمد مدنی یا حفظ الرحمن نہ پیدا ہوسکا۔ اور اسی لئے آج جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ ایک دور افتادہ صدا بن کر رہ گئی۔

جبری سبکدوشی:

جب مولینا وحید الزماں صاحب ۱۹۹۰ء میں کچھ سیاسی اثر و نفوذ اور کچھ اسباب کی بناء پر دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات سے سبکدوش کر دئے گئے۔ تو پورے شہر کی فضاء اگر یہ کہا جائے کہ دور دور تک کا ماحول گرم سا ہوگیا تو مبالغہ نہ ہوگا' اور اس سلسلہ میں غیر معمولی غم وغصہ کا اظہار چاروں طرف سے ہوا تو وہ طلبہ اور مخلصین جو مولینا کے بے پایاں اخلاص وشفقت سے وابستہ تھے، اس مسئلہ پر غور وفکر کے لئے جمع ہوئے اور آخر میں اس نتیجہ پر پہونچے کہ مولینا کی

معزولی سے ہمیں سبق لینا چاہئے، اور فضلاے دیوبند کی ایک تنظیم ہو جو ہر طرح کے پیش آنے والے مسائل ومشکلات پر مل بیٹھ کر پورے اتحاد واتفاق کے ساتھ کوئی فیصلہ کرے اور اس پر سختی سے کاربند ہو۔

چنانچہ ان لوگوں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اسی طرح سے ''تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند'' کرۂ ارض پر وجود میں آئی۔ جب اس سلسلہ میں طلبہ کی جماعت مولینا سے ملنے گئی تو انہوں نے فرمایا:

> ''میں ذاتی طور پر جس طرح دارالعلوم کے اندر طلباء کی انجمن قائم کرنے کا پرزور حامی تھا اور اس کے لئے ایک طویل عرصہ تک جدوجہد کی اسی طرح دارالعلوم کے باہر فضلاء کی تنظیم کا بھی مؤید ہوں۔ لیکن اگر آپ حضرات کو تنظیم قائم کرنے کی تحریک میری علاحدگی کے مسئلہ سے ملی ہے اور آپ اس کے پلیٹ فارم سے میرے مسئلہ کو اٹھانے کا کبھی ارادہ رکھتے ہیں تو میں آپ سے بڑا ہونے کی حیثیت سے یہ مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ موجودہ مرحلہ پر جب کہ میرے مسئلہ کی وجہ سے فضا کسی قدر گرم ہے آپ کوئی تنظیم قائم کرنے کا ارادہ ترک کردیں۔''[1]

مولینا کے اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ''تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کے مؤید تھے لیکن وہ اپنی شخصیت کو اس کا محور نہیں بننے دینا چاہتے تھے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جو حضرات گئے تھے انہوں نے مولینا سے یہ وعدہ تو کرلیا کہ وہ اس تنظیم کو وسیع تر مقاصد کے لئے استعمال کریں گے لیکن یہ بھی وضاحت کردی کہ پرامن ومہذب انداز میں وہ مولینا کا مسئلہ بھی اٹھائیں گے مگر مولینا نے اس تنظیم کی سرپرستی سے انکار کیا اور کوئی عہدہ نہیں قبول کیا اور المیہ یوں سامنے آیا کہ فضلاء کی تمام کوششوں کے باوجود مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس میں اپنے گذشتہ فیصلہ کی توثیق کی اور مولینا کی برطرفی برقرار رہی۔ چنانچہ فضلاء نے مایوس ہو کر اپنی تحریک ختم کردی اس کے بعد تنظیم کے کارکنان

---

[1] مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر۔ ص ۵۶

کی گذارش پر اس کی مجلسِ عاملہ کی رکنیت قبول فرمائی۔

اسی تنظیم ابنائے قدیم کا ایک ٹھوس کارنامہ مولینا وحید الزماں کیرانوی نمبر ہے یہ نمبر ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولینا کی شخصیت پر مختلف مضامین ہیں جن سے مولینا کی زندگی کے رنگا رنگ رخ اور پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہاں اس نمبر پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اس پہلو کی نشاندہی کرنا ہے کہ مولینا کی تنظیمی صلاحیتیں اور جماعتوں اور تحریکات کی تشکیل کا جوہر سیاسی میدان میں تو نمایاں نہیں ہوسکتا تھا مگر جہاں کہیں بھی علمی یا ادبی پہلو تھا وہاں مولینا کے جوہر کھلتے تھے، سیاسی موضوعات پر گفتگو کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور خصوصاً دورِ حاضر میں۔ لیکن سیاست کو کوئی جہت دینا اور سیاست میں قائدانہ صلاحیت کا مالک ہونا شئے دیگر است۔

مولینا بے پناہ تنظیمی صلاحیت رکھتے تھے لیکن وہ ''اکیڈمک آدمی'' تھے چنانچہ جہاں وہ رہے وہاں بھی اکیڈمک کام کرتے رہے، اور جب اس دار فانی سے ہجرت کی تو اس سے پہلے ایسی تنظیم قائم کر گئے جو علمی اور ادبی قافلہ کو سرگرم سفر رکھے۔

شاید یہ وہی لوگ ہیں جو مفلحون ہیں، مولینا وحید الزماں موضع کیرانہ ضلع مظفر نگر کے ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مولانا موصوف کے والد خود ایک مذہبی انسان تھے کیرانہ مکتب اور مسجد کے متولی تھے۔ خالی اوقات میں کتابوں کا مطالعہ ان کا مشغلہ تھا۔ مولانا نے مذہبی و دینی ماحول میں آنکھیں کھولی اور اسی ماحول میں تربیت حاصل کی۔ تحصیل علم کے خاطر حیدر آباد تشریف لے گئے لیکن تقسیم ہند و پاک کے فسادات اتنی شدت اختیار کر گئے۔ اور حالات اتنے پر آشوب ہو گئے کہ آپ کو حیدر آباد چھوڑنا پڑا اور اپنے وطن واپس آ گئے۔ جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو آپ دوبارہ دیوبند تحصیل علم کے لئے تشریف لے گئے۔ اور دیوبند دارالعلوم میں داخلہ لے لیا تعلیم کے دوران وہ ممتاز حیثیت کے حامل رہے۔ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے اپنے ایک مضمون جس کو ترجمان دارالعلوم مولا ناوحید الزماں کیرانوی نمبر

ص ۵۱ میں شائع کیا تھا۔اس مضمون میں لکھتے ہیں:

''ظہر کے بعد ہدایہ کا درس مولانا سید اختر حسین صاحب کے پاس ہوتا تھا وہاں ایک طالب علم پر نظر پڑی چھریرا بدن رنگ صاف آنکھوں میں ذہانت اور ظرافت رقصاں لیکن درس میں بالکل خاموش۔چند دنوں کے بعد تقسیم انعام کا جلسہ ہوا حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تشریف فرما تھے۔نتائج کا اعلان فرماتے اور طلبہ کو انعام تقسیم کیے جاتے۔اس دور میں قاعدہ تھا کہ جو طالب علم کم از کم ۵ پرچوں میں پورے پچاس نمبر لاتا اور کسی پرچے میں چالیس نمبر سے کم نہ ہوتے اسے خصوصی انعام دیا جاتا۔ ۱۳۶۹' ۷۰ ۱۳ھ کے نتائج امتحان سناتے ہوئے حضرت مدنی نے نام پکارا وحید الزماں کیرانوی اور جب نمبرات کا اعلان کیا تو سارے مجمع نے واہ واہ اور شاباش شاباش کہا۔ انتہائی ممتاز طالب علم کی حیثیت سے وحید الزماں کیرانوی نامی اس طالب علم کو میں نے پہلی بار پہچانا۔اور سچی بات یہ ہے کہ پہلی اور آخری بار جس طالب علم پر مجھے رشک آیا وہ یہی وحید الزماں کیرانوی تھے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مہینوں یہی دعا کرتا رہا کہ اے اللہ مجھے بھی ایسی ہی کامیابی عطا فرما' پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مجھے مولانا مرحوم کے ممتاز نتائج نے محنت اور یکسوئی کے ساتھ درس ومطالعہ کی راہ پر ڈالنے میں اہم رول ادا کیا''

خدمات:

مولینا وحید الزماں صاحب دوران طالب علمی میں دیو بند دارالعلوم میں اپنی جگہ بنا چکے تھے جیسا کہ آپ نے اس بات کا اعتراف اپنے اس انٹرویو میں کیا ہے جو آپ نے ۱۹۶۷ء میں مولانا وحید الدین خاں صدر اسلامی مرکز دہلی کو دیا تھا۔اور یہ انٹرویو الجمعیۃ ویکلی دہلی میں ۶/ جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا......آپ کو شروع ہی سے عربی زبان اور ادب سے ایک خاص لگاؤ تھا چنانچہ پہلے سال آپ نے جلسہ تقسیم انعام میں عربی زبان میں تقریر کی۔اس کے بعد طلباء کو عربی زبان کی طرف متوجہ کرنے کے لئے قلمی رسالہ شروع کیا جب طلبہ عربی زبان کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے الگ سے ایک کلاس شروع کی جس میں صرف عربی زبان پڑھائی وسکھائی جاتی تھی۔طلباء عربی زبان میں لکھ اور بول سکیں۔ان ہی سب خصوصیات اور

کمالات کی بناء پر جب مولانا دیوبند دارالعلوم تشریف لاتے تو سابقہ اعتماد کی بنا پر عربی ادب کا شعبہ بطور کلی ان کے حوالے کر دیا گیا.......... دارالعلوم میں ایک ممتاز و منفرد مدرس کے حیثیت سے فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ ان کی تعلیم و تربیت ایک خصوصی امتیاز کی حامل رہی مدارس کے پرانے طرز کو چھوڑ کر انھوں نے سہل سادہ اور مفید طرز تدریس کی بنیاد ڈالی جن لوگوں نے مولانا سے براہ راست استفادہ کیا ہے وہ فی زمانہ ممتاز اہل علم وقلم میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا کا انداز درس بالکل منفرد اور جداگانہ تھا وہ ہمیشہ زیر بحث مسائل کی تشریح و توضیح کیلئے انتہائی نپے تلے الفاظ استعمال کرتے، زبان نہایت صاف و سادہ، مرتب اور شستہ ہوتی اور پیرایہ بیان تعقید اور ثقیل الفاظ سے پاک و پاکیزہ ہوتا......

دارالعلوم کی تقرری سے پہلے آپ نے سعودی عرب کا دورکیا جہاں پر آپ نے مترجم کے فرائض انجام دئے۔ مرحوم محمد احمد کاظمی کی کتاب تقسیم ہند اور مسلمان کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ تقسیم الهند والمسلمون فی الجمهوریۃ الهند۔ اسی زمانے میں مختلف موضوعات پر سات کتابیں لکھیں جس میں ۵ کتابیں مکتبہ حسینیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ آخرت کا سفر ۲۔ اچھا خاوند/اچھی بیوی ۳۔ شرعی نماز

۴۔ انسانیت کے حقوق ۵۔ اسلامی آداب

۱۹۵۹ء میں انھوں نے دارالفکر نام کا ایک ادارہ قائم کیا جس میں عربی زبان سے دلچسپی والے طالب علم کے لئے زبانی تعلیم کا معقول انتظام کیا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی تاکہ طلباء کو موجودہ دور میں بھی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور اسی ادارے سے ایک اردو ماہنامہ ''القاسم'' بھی جاری کیا بعد میں یہ بند ہوگیا۔

۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیوبند بحیثیت استاد عربی مقرر ہوئے۔ اور وہیں سے آپ نے دعوۃ الحق اور الداعی کے شکل میں مجلہ نکالتے رہے۔ جن کی ادارت کی ذمہ داری مولانا مرحوم ہی کی تھی۔ مولانا دارالعلوم دیوبند میں تقریباً تیس برس درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے اور

اسی عرصہ میں القاموس الجدید عربی۔اردو منظر عام پر آئی اور اسی دور میں **القرأۃ الواضحہ** اور **نفحۃ الادب** کو مرتب کیا۔ جو اس وقت ہندو بیرون ہند میں بے شمار دینی مدارس سرکاری کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں رائج ہیں۔

مولانا مرحوم کی تصنیفات اور مجلات واخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کے سلسلہ میں پروفیسر زبیر احمد فاروقی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ لکھنے کے دوران مولانا کی کتابوں اور دعوۃ الحق والکفاح میں شائع شدہ ان تحریروں کو تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا۔ان تحریوں میں اسلوب کی پختگی اور تعبیرات کا جو حسن ہے اسنے مولانا کیلئے عالم عرب کے ممتاز ادیبوں کی صف میں جگہ بنادی ہے"۔[1]

مولانا مرحوم جہاں علوم وفنون میں ماہر ویکتائے روزگار تھے وہیں پر ایک بہترین آرکٹکٹ تھے۔ چنانچہ انھوں نے جشن صد سالہ کے موقع پر ۸ ماہ کی قلیل مدت میں دارالعلوم کی عمارت کو ایک نئی اور جدید شکل دے دی۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ چنانچہ دفتر اجلاس صد سالہ سے شائع ہونے والی رپورٹ میں اس طرح ان کی خدمت کو سراہا گیا ہے۔

"مولانا وحید الزماں صاحب نے اس سلسلہ میں شب وروز اس قدر محنت کی کہ ان کی صحت جواب دے گئی پھر بھی بیس بائیس گھنٹے روزآنہ کام کرتے رہے اور کاموں کی نگرانی بھی فرماتے رہے سیکڑوں مستری ومزدور تعمیرات کے اس کام میں لگے رہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سی شاندار عمارات بن کر تیار ہوئیں دارالعلوم کی عظیم الشان مسجد کی بالائی منزل جدید ڈھنگ سے تعمیر ہوئی۔اس مسجد کا ایک وسیع وشاندار اور بلند گیٹ تعمیر ہوا جو اپنی دلآویزی اور دلکشی کی وجہ سے لوگوں کی توجہ اور مسرت کا باعث بنا ہوا ہے۔ کتب خانے کی عمارت میں وسیع وعریض گیلریوں کی تعمیر، دارالعلوم کے صدر گیٹ کی جدید تعمیر، دارالاقامہ میں بہت سے نئے کمروں کی تیاری اور کئی ایک جدید درس گاہوں کا اضافہ بھی قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔اسی طرح دارالتفسیر کے تاریخی گنبد کی بلندی میں تبدیلیاں اور اضافہ وغیرہ بھی کام قابل قدر اور لائق تحسین قرار دیئے گئے ہیں"۔[2]

---

[1] ترجمان دارالعلوم مولانا وحید الزماں نمبر:ص ۱۵۱ [2] مختصر روداد اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند ص ۱۰۱۔۱۰۲

۱۹۸۲ء میں مولانا مرحوم کو مجلس تعلیمی کا ناظم بنا دیا گیا۔ اور اسی سال انگلینڈ، مصر اور پیرس کا سفر کیا۔ جہاں پر انھوں نے علمی و فکری نقوش چھوڑے ہیں اور آج بھی ان کی شخصیت کو یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں مہتمم معاون قرار دیئے گئے یہ ان کی مصروفیات اور سرگرمیوں کے مرجع و کمال کا دور تھا۔ اور اسی دور میں مولانا مرحوم نے آئینہ دارالعلوم کے نام سے ایک پندرہ روزہ پرچہ جاری کیا۔ آخری کام مولانا مرحوم نے القاموس الوحید پر کیا۔ یہ کتاب مولانا کی سالہا سال شبانہ روز محنت وسعی کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی شخصیت کے مختلف ابعاد کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد مجید خاں ماہر نفسیات کے تبصرہ کا مختصر نمونہ بھی آخر میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر مجید خاں 'مولانا رضوان القاسمی کے مضمون 'القاموس الوحید'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری نظروں میں مولانا رضوان القاسمی صاحب کی غور و فکر اور مرحوم مولانا وحید الزماں کیرانوی کی غور و فکر میں یکسانیت نظر آئی۔ مولانا کا Perception روشن ترین پہلو ہے۔
نفسیات کے طالب علم کے ناطے مجھے یہ دیکھ کر بڑی حسرت ہوتی ہے کہ علماء دین میں بھی ایجادی اختراعی اور انقلابی ذہن و فکر کی قدر و منزلت شروع ہو رہی ہے۔ یہی عصری انداز ہمارے مسائل کو سمجھنے میں نہ صرف مدد کریں گے بلکہ حل کریں گے۔ آج مولانا کے کام کی سخت ضرورت ہے یعنی مردم سازی اور افراد سازی وقت کا تقاضا ہے کہ اس ہنر کو سیکھا جائے اور سکھایا جائے۔ یہ مذہبی مدرسہ میں مولانا کے تعلق سے پڑھایا جانا چاہئے۔ دارالعلوم دیوبند کی بے مثال خدمات کے باوجود مولانا کو محض شخصی ضد کی وجہ علیحدہ کیا گیا۔ جس کا غم جان لیوا ثابت ہوا۔''[۱]

✿✿✿✿✿

[۱] روزنامہ سیاست۔ ۳/ جون ۲۰۰۱ء

باب ہشتم
معاصرین

معاصرین

مولینا وحید الزماں کی حیات کے مختلف گوشوں پر غور کرتے ہوئے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اپنے عہد کے ممتاز افراد پر کیسے نمایاں اثرات چھوڑے، حالانکہ ان افراد میں بہت سے ان کے دوست تھے تو بہت سے ان کے شاگرد تھے، لیکن ان سب سے ان کی مقبولیت اور ان کے غیر معمولی اثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ترجمان دار العلوم دیوبند کے وحید الزماں کیرانوی نمبر میں جتنے حضرات کے مضامین ہیں ان کے اسماء گرامی درج کئے جاتے ہیں:

۱۔مولینا محمد افضال الحق قاسمی
۲۔اسعد الاعظمی
۳۔مولینا صدیق احمد باندوی
۴۔مولینا قاضی مجاہد الاسلام
۵۔مولینا وحید الدین خاں
۶۔مولینا ابو الحسن بارہ بنکوی
۷۔مولینا عبد اللہ سورتی
۸۔پروفیسر بدر الدین الحافظ
۹۔مفتی فضل الرحمن ہلال عثمانی
۱۰۔مولینا احمد علی قاسمی
۱۱۔سید احمد رامپوری
۱۲۔مولینا عبد الوحید حیدر آبادی
۱۳۔مولینا محمد اسرار الحق قاسمی
۱۴۔مولینا نور عالم خلیل امینی
۱۵مولینا ندیم الواجدی
۱۶۔پروفیسر زبیر احمد فاروقی
۱۷۔ڈاکٹر شمس تبریز خاں
۱۸۔سید ارشد رضا الحسنی
۱۹۔مولینا اعجاز احمد اعظمی
۲۰۔مولینا بدر الحسن قاسمی
۲۱۔خالد القاسمی
۲۲۔مولانا محمد رفیق قاسمی
۲۳۔ڈاکٹر خلیل الرحمن راز
۲۴۔ڈاکٹر محمد معروف قاسمی
۲۵۔مولینا عبد العلی فاروقی
۲۶۔مولینا خلیل الرحمن سجاد نعمانی ندوی
۲۷۔مولینا عبد العظیم ندوی
۲۸۔مولینا محمد عبد اللہ مغیثی
۲۹۔مولینا اسیر ادروی
۳۰۔مولینا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

۳۱۔مولینا محمد زبیر اعظمی
۳۲۔مولینا عبدالحفیظ رحمانی
۳۳۔مولینا سید غیاث الحسن مظاہری
۳۴۔مولینا محمد عزیز قاسمی
۳۵۔مولینا عبدالستار سلام قاسمی
۳۶۔مولینا سید غیاث الحسن مظاہری
۳۷۔ڈاکٹر فرقان مہربان قاسمی
۳۸۔حکیم محمد احمد قاسمی
۳۹۔مفتی جمیل الرحمن قاسمی
۴۰۔محمد حکیم الدین عارف العمری
۴۱۔مولینا حفظ الرحمن ملک قاسمی
۴۲۔مولینا منظور احمد القاسمی
۴۳۔مولینا سید عقیل احمد قاسمی
۴۴۔ڈاکٹر عبدالقادر خاں
۴۵۔مولینا ظاہر الاسلام قاسمی
۴۶۔مولینا عبدالحمید نعمانی
۴۷۔اشرف عثمانی دیوبندی
۴۸۔مولینا عبدالقدوس کیرانوی
۴۹۔مولینا محمد رفعت قاسمی
۵۰۔مولینا عبدالرشید بستوی
۵۱۔مولینا محمد اکرام الحق قاسمی
۵۲۔مولینا سید انظر شاہ مسعودی
۵۳۔مولینا محمد افضال الحق جوہر قاسمی
۵۴۔مولینا محمد مزمل الحق الحسینی
۵۵۔مولینا ثناء الہدیٰ قاسمی
۵۶۔پروفیسر بدرالدین الحافظ
۵۷۔مولینا آس محمد گلزار قاسمی
۵۸۔لطف اللہ قاسمی
۵۹۔مولینا عزیز الحسن صدیقی
۶۰۔مولینا فصیح الدین دہلوی
۶۱۔مولینا فضیل احمد قاسمی
۶۲۔عبدالرحمن عابد
۶۳۔محمد اظہار الحق دیشالوی قاسمی
۶۴۔ڈاکٹر رفیق بلگرامی
۶۵۔مفتی محمد ظاہر الاعظمی

یہ تمام لوگ مولینا کے معتقدین ہیں دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ جن سے اختلاف ہو اسے بھی درج کر دیا جائے چنانچہ صفحہ ۳۴۹ پر مولینا انظر شاہ کا مضمون ہے نفس مضمون پر ادارہ نے نوٹ لگا کر اپنے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔لیکن راقمتہ الحروف کو نفس مضمون کے متعلق کچھ نہیں عرض کرنا ہے۔صرف اس مضمون کا عنوان ہے "وہ فریب خوردہ شاہیں" اس عنوان کے بارے میں عرض کئے بغیر ضمیر پر بوجھ رہے گا اس لیے بیان کیا جا رہا ہے۔

اقبال کی مشہور نظم کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں — کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

اس میں دوسرا شعر خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے لیکن اس سے پہلے حضرت مولینا انظر

شاہ کے مسعودی کے تمہیدی فقرے بھی درج کرنا ضروری ہیں:

"یہ نگارش کسی تملق پسندی کی نہیں جو زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔۔۔ مولینا مرحوم کے ایک معاصر ہم درس، ہم نشیں کی جو صرف نام کا انظر نہیں بلکہ اپنے ماخذ سے وافر حصہ لیے ہوئے جو کسی شخصیت کو دبیز پردوں میں جھانک کر دیکھ لیتا ہے۔ جس کی نظر چہار جہت پردوں کے آویزاں ہونے کے باوجود اپنے کام سے نہیں چوکتی وہ اس خدائی عطیہ یعنی صلاحیت مردم شناسی پر تحدیث نعمت کہہ سکتا ہے"۔[1]

جلوے میری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں

مجھ سے چھپیں گے وہ کہاں ایسے کہاں کے ہیں

(اقبالؔ)

مجھے نہ اس تمہید پر کوئی تبصرہ کرنا ہے اور نہ ہی نفس مضمون پر بلکہ صرف یہ عرض کرنا ہے مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرع کا متن یوں ہے:

مجھ سے بھلا چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

حالی کی غزل کا یہ شعر بہت معروف ہے

اقبال کے جس شعر کو رکن سرنامہ قرار دیا گیا ہے وہ ذہن کو فوراً دوسرے رکن کی طرف منتقل کرتا ہے اور دوسرا رخ ہے جو پلا ہو کرگسوں میں ....؟

اقبال کی شاعری میں کرگس بڑا کلیدی لفظ ہے اور اقبال کہتے ہیں:

"کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور"

کرگس کے معنی گدھ کے ہیں گدھ..... مردار یعنی حرام کھاتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ مولینا فریب خوردہ شاہین تھے...... اس سے ہم بھی متفق ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں لیکن وہ کرگسوں میں پلے تھے؟

---

[1] ترجمان۔ دارالعلوم دیوبند: ص۔۳۴۹

مولینا وحید الزماں کیرانوی جن لوگوں میں پلے بڑھے تھے ان میں کے کچھ نام درج کئے جاتے ہیں:

حضرت مولینا شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، حضرت مولینا محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی اور انہیں کی قبیل کے بزرگ۔ (نعوذ باللہ) کیا یہ بزرگ ایسے ہیں کہ ان کے لیے کرگس کا لفظ سوچا جائے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ میرے ذہن کی کثافت ہے لیکن اگر اس سرنامہ میں اگر لفظ "وہ" نہ ہوتا اور صرف فریب خوردہ شاہین ہوتا تو کسی ذہن کو یہ حق نہیں حاصل تھا کہ وہ اقبال کے مصرع کی طرف رجوع کرتا لیکن لفظ "وہ" لکھ کر جناب شیخ الحدیث...... اور پھر ان تمہیدی کلمات نے...... جو بڑی حد تک "رجز" کی حیثیت رکھتے ہیں ذہن کو اس رکن کے لاحقہ رکن "جو پلا ہو کرگسوں میں" کی طرف منتقل کر دیا۔

حضرت مولینا وحید الزماں انسان تھے خدا نہ تھے کہ بے عیب ہوں۔ لیکن طرز تحریر میں سب وشتم کا انداز جو انتقامی رخ لیے ہوے ہو نہ محمود ہے نہ مسعود...... اور ان لوگوں پر جو اسلاف سے تعلق رکھتے ہیں اخلاف سے نہیں اگرچہ جناب مولینا انظر شاہ مسعودی کے جملے یا ان جملوں کے اشارے خود مولینا وحید الزماں یا ایسے لوگوں کی طرف ہوتے جو اپنا دفاع کر سکتے تو کسی طرح کے اشکال کی گنجائش نہ تھی۔ مگر مولینا وحید الزماں کو فریب خوردہ شاہین کہہ کر اور پلا ہو کرگسوں میں نہ کہہ کر مگر اشارہ کر کے، پوری فضا بگڑی ہوئی نظر آتی ہے مولینا انظر شاہ مولینا وحید الزماں کے ہم درس بھی تھے۔

معاصرین میں کچھ بزرگ تھے مثلاً محدث عصر مولینا حبیب الرحمن اعظمی حالانکہ ان کے اور وحید الزماں صاحب کے درمیان کافی فرق تھا، محمد شاہ جلیل صاحب، مولینا حبیب الرحمن الاعظمی وحید الزماں صاحب سے تقریباً ستائیس، اٹھائیس سال بڑے تھے کم وبیش عمر کا یہی فرق مولینا منظور نعمانی کے ساتھ بھی تھا لیکن مولینا وحید الزماں صاحب کے ان حضرات سے کسی

طرح کے خاص مراسم نہ تھے حالانکہ یہ لوگ دارالعلوم کی شوری کے ممبر تھے مولینا ابوالحسن علی ندوی بھی وحید الزماں صاحب سے عمر میں کچھ بڑے تھے مگر دونوں کے روابط پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ یہاں تک کہ تعزیتی پیغامات میں مولینا علی میاں صاحب کا کوئی تعزیتی پیغام نظر سے نہیں گزرا۔

البتہ جن لوگوں سے بہت قریبی روابط تھے ان میں مولینا محمد افضال الحق جوہر قاسمی مولینا فصیح الدین دہلوی وغیرہ کے مضامین پڑھ کر قربت کے تاثر کا احساس ہوتا ہے شاگردوں میں سبھی ان سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن مولینا نور عالم خلیل امینی نے ''کوہ کن کی بات'' میں تاثراتی سیرت نگاری اور عقیدت مندی کا حق ادا کر دیا ہے۔

اس عہد کی ایک جلیل القدر شخصیت عارف باللہ حضرت مولینا صدیق احمد باندوی مرحوم ومغفور کی تھی ان کے روابط بہت گہرے معلوم ہوتے ہیں مختصر سے تعزیتی پیغام میں انہوں نے حضرت مولینا کی شرافت نفس، حق گوئی، بے باکی، اخلاص فی العمل کا تذکرہ فرمایا ہے۔

بعض گوشے ایسے ہوتے ہیں جن کی طرف صرف اشارے کئے جا سکتے ہیں چنانچہ ایک پہلو کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری میں ابوالمآثر حضرت مولینا حبیب الرحمن الاعظمی، مولینا ابوالحسن علی ندوی، مولینا منت اللہ رحمانی، مولینا سعید احمد اکبر آبادی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی حکیم محمد زماں، مولینا مرغوب الرحمن بجنوری جیسے حضرات تھے جنکے اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے درمیان تصادم کی نوبت آ گئی تھی، مضمون نگار کی تحریر کے مطابق جو رپورٹ پیش کی گئی تھی اسمیں صلح کی نہیں، جنگ سنجیدگی کی نہیں جارحیت کی بو آتی ہے۔

اس مقام پر حضرت قاری صاحب کو مجلس شوری کے بالمقابل کھڑا کر دیا گیا تھا۔ پھر قاری صاحب نے مجلس شوری کو کالعدم کرنے کا اعلان فرما دیا تھا آخر کار قاری صاحب نے استعفی داخل کر دیا۔

یہ ایک رخ ہے، اب دوسرا رخ ملاحظہ ہو اور وہ یہ کہ مجلس شوری کے ۲۱ ارکان میں سے

حضرت مولینا وحید الزماں کی شخصیت کا ایک رخ ان کی غیر معمولی مقبولیت ہے وہ اپنے شاگردوں میں محبوب تھے، بعض اساتذہ کا انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ شاگردوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مولینا اپنے شاگردوں سے بے حد قریب تھے۔ ان کے درس کو اپنا درس سمجھتے تھے۔ انہیں کے مسائل کو لے کر ہر موقع پر جتنے واقعات رونما ہوئے جتنے اختلافات پیدا ہوئے ان سب کے پس منظر میں طلبہ ہی رہے۔ طلبہ کے احتجاج پر کیمپ دار العلوم کا قیام اور طلبہ کے اخراج، ان کے داخلے، ان کے سلسلہ میں تفریقی رویہ رکھے جانے پر مولینا کے اقدامات...... یہ سب ایسے گوشے تھے کہ جن کی وجہ سے ان کی سبکدوشی کے بعد فضلائے دیوبند کے احتجاج کی شکل میں نظر آیا۔

سعودی عرب ریاض سے فضلائے دیوبند نے ایک میمورنڈم بھی روانہ کیا تھا جس پر تقریباً تیس افراد کے دستخط تھے، اور یہ وہ حضرات ہیں جو بذات خود صاحب علم و فضل ہیں، اس طرح بذات خود مولینا کے نام بھی بڑے محبت آمیز خطوط لکھے گئے۔

مولینا نے اگست ۱۹۹۲ء میں ریاض کا سفر بھی کیا تھا اور وہیں اپنے شاگردوں کی اس تمنا اور آرزو کو پورا کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ آپ اپنی آپ بیتی لکھیں گے، ایک شاگرد نے اس کی طباعت و اشاعت کے اخراجات کی ذمہ داری خود اپنے سر لے لی تھی، مولینا تقریباً ایک ماہ کے قیام کے بعد جب واپس لوٹے تو ان لوگوں نے ایک سپاس نامہ کے قسم کی چیز دی، جن لوگوں نے یہ سپاس نامہ لکھا ہے وہ اردو ادب کے بہت ممتاز ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ عبارت کا جو آہنگ ہے وہ اس حقیقت کا اعلان کرتا ہوا نظر آتا ہے، صرف کچھ پیراگراف مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

> ''آپ نے اپنے فضل و کمال، خداداد صلاحیت اور ہمہ گیر شخصیت سے تاریخ دار العلوم دیوبند میں نئے ابواب کا اضافہ کیا ہے، چمنستان دار العلوم کو نئے بیل بوٹوں سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ موسم کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ عندلیبان گلستان قاسمی کو ہم آہنگی کا گر سکھایا ہے، اس برق رفتار عہد میں سست رفتار بلکہ شکستہ پا طائروں کو بال و پر عطا کئے

ہیں انہیں بلند پروازی کے طور طریقے سکھائے ہیں۔ ؎

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

غرض دار العلوم دیوبند کے در و دیوار پر آپ نے اپنی حیات زریں کے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں ایسے انمٹ نقوش جن کو حالات کے کیسے ہی تیز و تند جھونکے کیوں نہ ہوں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اگر آپ کے دست نباض نے بروقت حیات تازہ کی روح نہ پھونکی ہوتی تو کاروان قاسمی کارگہ حیات میں خدا جانے کتنا پیچھے رہ جاتا۔

ارباب دار العلوم فضلاء اور ہمدردان دار العلوم دیوبند کا فرض تھا کہ وہ اپنے دریکتا کی قدر کرتے مگر ستم ظریفیٔ روزگار کہ طوطی کی آواز گرہ کشایان چمن پر بار ہونے لگی۔

سعودی عرب میں اپنے درمیان آپ کو پا کر ہم بھی احباب و فضلاء کو ناقابل بیان مسرت حاصل ہوئی ہے۔ ہمیں اپنے اندر بڑی تقویت و افادیت کا احساس ہوا ہے۔ لہٰذا ہم سبھی کی گذارش ہے کہ براہ کرم اگر زیادہ نہیں تو ایک سال میں کم از کم ایک ڈیڑھ ماہ ہمیں اپنے گرد موجودگی کا شرف بخشیں یہ اگرچہ آپ کے لیے قدرے باعث زحمت ہوگا لیکن ہمارے لیے نہایت باعث رحمت ہوگا" ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں کہ ہم سے آپ کے تئیں کوتاہیاں ہوئی ہوں گی ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں"۔ [1]

ایک ایک لفظ سے شدید وابستگی کے ساتھ عقیدت کا اظہار ہو رہا ہے ان لوگوں نے ہدیہ بھی پیش کیا یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ ہدیہ رقمی صورت میں کتنا تھا لیکن دو سطروں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی روپیے کے حساب سے ہزاروں نہیں لاکھوں میں تھا' درج ہے:

"اپنے کاروان زندگی کی اس مبارک اور مسعود ساعت میں ہم لوگ علامتی طور پر آپ کی

---

[1] سپاس نامہ۔ سعودی عرب

خدمت میں ایک حقیر ہدیہ پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ اپنے خلوص ومحبت کی بناء پر ہمیں توقع ہے کہ حوصلہ افزائی کے خاطر ہماری یہ پیش کش قبول فرمائیں گے، آپ کو کلی اختیار ہے کہ ذاتی استعمال کے لیے اس سے گاڑی خریدیں یا حسب منشا جس مصرف میں چاہیں صرف فرمائیں یہ آپ کی ذات کے لیے ایک معمولی نذرانہ ہے"۔ [1]

یہ صرف ایک بیان نہیں ہے بلکہ اس طرح کے سینکڑوں ہزاروں واقعات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولینا نے اپنے طلبہ کے دل ودماغ پر حکومت کی ہے چنانچہ مولینا کی سبکدوشی کے بعد بے شمار خطوط میمورنڈم دفتر اہتمام کو بھیجے گئے، مہتمم صاحب سے گذارش کی گئی اور اجتماعات ہوئے جسمیں مولینا کے سبکدوشی کے خلاف احتجاج ہی نہیں بلکہ مولینا کی بے نظیر خصوصیات کو خراج تحسین بھی پیش کیا گیا ہے، مثلاً فضلائے دیوبند ریاض سعودی عرب سے لکھتے ہیں:

"حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی بلاشبہ ان ہی عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جن کی نظیریں کسی بھی دور کی تاریخ میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں۔ مولینا نے علم وادب کی ترویج میں مؤثر خدمات انجام دیں اور اپنی زبان وقلم سے دارالعلوم دیوبند کا وقار بلند کیا، اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی۔ لیکن علم وادب کے اس روشن چراغ کو مجلس شوری نے ایک ممبر کی منتقمانہ مہم کے زیر اثر تدریسی ذمہ داریوں سے جبراً سبکدوش کر کے دارالعلوم دیوبند کو مولینا کی علمی وادبی خدمات سے محروم کر دیا"۔ [2]

اس طرح ایک دوسرے میمورنڈم میں لکھا گیا جو حضرت مہتمم صاحب کے نام ہے:

"مخدوم ومحترم حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ سعودی عرب میں قیام پذیر مہم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند بحمداللہ بخیر ہیں...... اس عریضہ کا ایک خاص داعیہ یہ ہے کہ مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولینا وحید الزماں صاحب مدظلہ کی برطرفی کی خبر ہمارے لیے بے انتہا حیرت انگیز اور باعث تشویش ہے۔

حضرت مولینا مدظلہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ تک دارالعلوم میں صرف تدریسی ہی نہیں بلکہ مختلف النوع خدمات انجام دیتے رہے ہیں مولینا برصغیر کی سب سے عظیم الشان دینی درسگاہ میں ایک زریں عہد کے بانی ہیں، یہ پورا عہد اس بات کا گواہ ہے کہ وہ ایک

---

[1] سپاس نامہ سعودی عرب　　[2] سپاس نامہ سعودی عرب

بلند پایہ معلم ہی نہیں بلکہ نہایت کامیاب منتظم بھی ہیں۔ بعض دفعہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر قدرت کا دست فیاض کسی فرد واحد میں بہت سے کمالات وخوبیاں یکجا کر دیتا ہے"۔[1]

ایک میمورنڈم میں بڑی تفصیل سے مولینا کی برطرفی کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کے دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں اور اسی تنظیم ابنائے قدیم کے قیام اور اس کی کارکردگی پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے:

"دارالعلوم دیوبند کو بہت سے مشکل مراحل سے گذرنا پڑا ...... اسکی اب تک کی آزمائشوں میں سب سے سخت اور جاں گسل آزمائش تقریباً ایک دہائی قبل اس وقت شروع ہوئی جب حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کے آخری دور اہتمام میں جشن صد سالہ کے موقع پر فضلائے دارالعلوم دیوبند کی تنظیم مؤتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند وجود میں آئی حالانکہ عام حالات میں کسی ادارہ یا درسگاہ کے ابنائے قدیم کی یونین اسے فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے مگر اس وقت اس تنظیم کے وجود میں آجانے کے بعد محاذ آرائی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا اور اسی جنگ سے تاریخ دارالعلوم میں ایسے شرمناک اور سیاہ ابواب کا اضافہ ہوا جن سے اسکا تابناک ماضی قطعاً نا آشنا تھا، یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی صرف اسکے شعلے مضمحل ہوئے تھے...... کہ قابض گروپ میں اکھاڑ پچھاڑ شروع ہوگئی اسکے نتیجہ میں مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۲۱، ۲۲ شعبان ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں کل ۲۱ ممبران میں سے گیارہ کی موجودگی میں حضرت مولینا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی دارالعلوم سے برطرفی کا فیصلہ ہوا......"[2]

آگے چل کر میمورنڈم میں مولینا کی انتظامی صلاحیتوں اور جشن صد سالہ پر روشنی ڈالی گئی پھر لکھا گیا:

"تدریسی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ مولینا کی سب سے بڑی خوبی تربیت وافراد سازی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ طلبۂ دارالعلوم مولینا سے جتنا تعلیمی استفادہ کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ وہ ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی سے استفادہ کرتے تھے وہ ان سے زندگی کے طور طریقے حیات انسانی میں پیش آنے والی گتھیوں کو سلجھانے کے گر سیکھتے تھے، مولینا صرف مقررہ کتابوں کا نصاب ہی نہیں پورا کراتے بلکہ طلبہ کو تعمیر حیات کے اسباب بھی پڑھاتے تھے"۔[1]

---

[1] سپاس نامہ۔ سعودی عرب　　[2] سپاس نامہ۔ سعودی عرب

ان لوگوں نے جون ۱۹۹۰ء میں حضرت مولینا کو بھی ایک خط لکھا اور پھر مولینا ان لوگوں کی دعوت پر اور اسفار کے علاوہ ریاض کا سفر کرتے رہے، دوسرے سفر میں ایک مجلس میں جماعت تبلیغ اور عقائد علماء دیوبند کے خلاف لکھی گئی کتاب القول البلیغ والدیوبندیہ کا جواب لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔ مولینا نے اپنے تمام شاگردوں کے درمیان رشتۂ مودت واخوت استوار کرنے کے لیے ان کے درمیان باہمی اختلافات کو دور کرنے کی سعی مشکور کی اور یہ مشورہ بھی دیا کہ کبھی کبھی ساتھ مل کر کھانے پینے کا بھی اہتمام ہونا چاہئے۔

مولینا ان چند خوش نصیب اساتذہ میں سے تھے جن پر ان کے طلبہ کو فخر تھا اور وہ ان کی ایک آواز پر سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے فارسی میں کہا گیا ہے کہ:

گر جاں طلبی مضائقہ نیست

گر زر طلبی سخن دریں است

ان طالب علموں نے ایک بار کار کے لیے گرانقدر رقم پیش کی ایک بار ایک مرکز کے لیے درخواست کی اور ستمبر ۱۹۹۴ء میں لکھا:

"ہماری خواہش ہے کہ جناب والا کی زیر ترتیب قدیم ڈکشنری کے اخراجات میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں امید ہے کہ جناب والا ہماری پیش کش قبول فرمائیں گے جو درحقیقت آپ کی ذات کے لیے ہماری جانب سے ایک حقیر نذرانہ ہے۔ آپ کو کامل اختیار ہے جہاں اور جیسے تصرف فرمائیں اور استعمال کریں"۔ [1]

ان سطور سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تو اس وقت کی صورت حال ہے جب وہ اقتدار سے محروم ہو چکے تھے لیکن جب وہ اقتدار میں رہے ہوں گے اور دار العلوم کے لیے ملکی سطح پر اور بیرون ملک اسفار کئے ہوں گے تو بلاشبہ انہیں لاکھوں کا چندہ ملا ہوگا، دار العلوم کی تعمیر کے

---

[1] سپاس نامہ۔ سعودی عرب

وقت یہ لکھا جا چکا ہے کہ ۱۴ چودہ لاکھ کی رقم بہت جلد اکٹھا ہوگئی تھی اور یہ چودہ لاکھ تقریباً پچیس سال پہلے کا تھا جس کا اندازہ آج کے زمانہ کے حساب سے کم سے کم پینتالیس، پچاس لاکھ ہوگا۔

اس طرح مولانا کی حیات کا یہ رخ بھی غیر معمولی تھا، اگر زندگی نے وفا کی ہوتی اور انہیں اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا ہوتا تو شاید جدید طرز کی ایک ایسی عربی یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آتا جہاں عربی کی تعلیم بہ حیثیت زبان وادب خالص عصری خطوط پر ہوتی۔

میں اپنی اس جسارت بے جا پر حضرات علماء کرام کی خدمت میں مؤدبانہ طور پر معذرت خواہ ہوں لیکن اس کا اعادہ کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ زبان کا رشتہ مذہب سے نہیں جوڑنا چاہئے اس پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہئے کہ مذہبی افراد کسی زبان کو وسیلہ اظہار بنائیں لیکن یہ بات شاید بہت محمود نہیں ہے کہ کسی زبان کا رشتہ کسی مخصوص طرز فکر یا مذہب سے جوڑ دیا جائے۔

یہ فرسودہ طرز فکر سنسکرت کے ساتھ بے انصافی کا سبب بنا اور آج بھی عربی زبان وادب کے لیے یہ بات مخصوص ہے کہ یہ صرف حدیث شریف اور اسلامی فقہ کی زبان ہے اور اسے صرف مولینا لوگ پڑھ سکتے ہیں ہندوستانی تناظر میں یہی فکر پروان چڑھی حالانکہ جس طرح سنسکرت میں Winter Nietz نے اس طلسم کو توڑ دیا جہاں سنسکرت صرف پنڈتوں سے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اسی طرح عربی میں معلوف کی المنجد نے اسے ثابت کر دیا کہ زبان وادب کسی مذہبی گروہ کے میراث نہیں بن سکتے۔

مولینا وحید الزماں کیرانوی بلاشبہ اپنی ایک مخصوص فکر رکھتے تھے وہ ''مولینا'' تھے اور جمعیت علماء کے رکن بھی مگر راقمۃ الحروف کا یہ احساس ہے کہ وہ بنیادی طور سے عربی علم و ادب کے بہت بڑے دانشور تھے اور عربی زبان کو بھی اسی طرح مقبول و معروف اور مروج کرنا چاہتے تھے جس طرح مثال کے طور پر انگریزی و فرانسیسی معروف و مروج تھی۔

❁❁❁❁❁

باب نہم

آخری زمانہ......وفات وتعزیتی پیغامات

آخری زمانہ

انسانی زندگی ایک نہ ایک روز صحیح معنوں میں فلاح سے اس وقت ہمکنار ہوتی ہے جب انسان سفر حیات کی منزلیں طے کر کے منزل آخرت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اقبال کے لفظوں میں:

اتر کر جہان مُکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

دنیا یہ سمجھتی ہے کہ موت زندگی کو شکست دیتی ہے لیکن حق یہ ہے کہ مومن کے ذریعہ سے زندگی موت کو شکست دیتی ہے اس کا جسم خاکی پیوند خاک ہو جاتا ہے مگر اس کا وجود روحانی باقی رہ جاتا ہے۔

مولینا وحید الزماں کیرانوی کے بس میں عمر رواں نہ تھی وہ اس موڑ پر آ گئے تھے جہاں کوئی نہ کوئی حیلہ موت کو ملنا چاہئے تھا اس سلسلہ میں اشرف عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"یہ صدی سائنس کی صدی ہے انسان نے چاند پر کمند ڈال کر بہت سے اوہام پرستی کے دروازوں کو بند کر دیا ہے پورے ماحول میں بے دلیل باتوں کی کوئی گنجائش نہیں سحر، جنات اور عملیات کے تصورات فرسودہ ہو چکے۔ اس سائنسی دور میں اس قسم کی باتیں تحریر کرنا قطعی بے محل مانی جاتی ہیں۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ درج ذیل تذکرہ بے محل ہے چھیڑوں گا ضرور۔" ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے: موت کا انداز موت کا وقت متعین ہے اس کے باوجود اسباب موت پر تبصرہ ہوتا ہے۔ اسباب کے لحاظ سے ہی فطری موت،

اور غیر فطری موت" کے عنوان قائم کئے جاتے ہیں۔ اس سیاق سے مراد یہ ہے کہ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کو عاملین کی کثیر رائے کے مطابق جادو کے ذریعہ ہلاک کیا گیا ہے اس لیے ان کی موت فطری نہیں بلکہ غیر فطری طور پر واقع ہوئی ہے۔ بشرطیکہ عاملین کے علم ظنی کو یقینی کے درجے میں رکھا جائے..... زبان خلق واقعی اگر نقارۂ خدا ہوتی ہے تو تمام عاملین کی ایک رائے یقینی صورت اختیار کر لیتی ہے..... کئی برس پہلے میں نے اپنے عمل کے ذریعے مولانا مرحوم کے مرض کی تشخیص کرنے کی ٹھانی تھی' تب یہ بات میرے سامنے آئی تھی کہ ان پر مہلک سحر کیا گیا ہے اور اس کو اتارنے کی مدت ختم ہو چکی ہے' تب مجھ سے ایک ایسی لغزش بھی سرزد ہو گئی تھی جس کو ایمان کی کمزوری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے (اس کے بعد میں نے ہمیشہ کے لیے ترک عملیات کا عہد کر لیا تھا) مولانا کیرانویؒ کو عملیات کے ہر طریقہ زاویہ سے دیکھنے کے بعد ایک ہی جواب آتا تھا کہ یہ سحر لا علاج ہے۔ اس نتیجہ سے میرا متوحش ہو جانا غیر فطری نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ایک دوسرے شہر کی راہ لی۔ جہاں ایک گوشہ نشین' پنڈت جی' سفلی عملیات کا ایک جہان سنبھالے بیٹھے تھے' ان سے میرے خاصے مراسم تھے' وہ حرام کام تو ضرور کرتے تھے لیکن اس کی کھاتے نہیں تھے' بلا معاوضہ "دھرم پالن" اور "مانو سیوا" کے طور پر یہ کام کرتے تھے۔ پنڈت جی نے میرے "سواگت اور آؤ بھگت" کے بعد پوچھا "کہو کیسے آنا ہوا"؟ میں نے سوال کیا..... وحید الزماں بن..... کے بارے میں کچھ بتائیے۔

سر پر انگوچھا ڈالے اور سر جھکائے وہ دس منٹ بیٹھے رہے' دس منٹ بعد انہوں نے بولنا شروع کیا' یقین جانئے کچھ لمحوں کے لیے تو عالم حیرت نے عقیدۂ علم الغیب کو خطروں کے نرغے میں لاکھڑا کیا' دور دراز علاقے میں بیٹھے اس شخص نے مولانا کی بیماری' ان پر پڑنے والے اضطرابی دوروں کی کیفیات اس طرح بتانا شروع کیں کہ مولانا بھی خود اس کو اتنی اچھی طرح بیان نہیں کر پاتے تھے' اس نے اس کیفیت کی مدت بھی بتائی اور یہ بھی کہا کہ یہ زبردست قسم کا جادو ہے جس کا مستقل علاج میرے پاس بھی نہیں ہے۔ یہ اتفاقی بات تھی کہ اس کی تشخیص اور میری تشخیص دونوں ایک تھیں۔ پنڈت نے کہا اس کا ایک عارضی علاج ہو سکتا ہے جس سے ان کو رمضان کی پہلی تاریخ تک آرام سا ہو جائے گا۔ رمضان کے بعد پھر میرے پاس آجانا میں اس علاج کی تجدید کر دوں گا پھر اگلے

رمضان کی پہلی تاریخ تک مریض چین سے رہے لے گا۔انہوں نے میرے سامنے پچیس منٹ تک کچھ پڑھا۔" کچھ پڑھنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے وقت دیکھنے کے لیے کہا' میں نے دیکھا ۲۰۔۲ بجے تھے۔ ۴۵۔۲ تک اس نے اپنے عمل سے فراغت پائی اور بڑے اعتماد سے کہا' یہ وقت یاد رکھنا اور مریض سے تصدیق کر لینا کہ اس وقت اس پر تشنج اور اضطراب کا دورہ پڑا تھا یا نہیں"۔ میں رات تک دیوبند واپس آگیا اور اگلے دن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا' اس دن وہ بالکل رو بہ صحت لگ رہے تھے۔ ایک دن پہلے کی کیفیت معلوم کرنے پر انہوں نے بتایا کہ کل تو عجیب حالت ہوئی' لگتا تھا جسم سے کوئی روح کھینچ رہا ہے' دوپہر کے وقت بہت زیادہ اضطراب رہا' مجھے پنڈت جی کی شیطانی قوت پر یقین ہو گیا۔

اس کے بعد مولانا کی طبیعت میں کچھ سدھار آیا لیکن تین مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ خبر ملی۔ پنڈت جی کا دیہانت ہو گیا' علاوہ بریں مولینا کو بہت سے عاملین نے دیکھا ان سب میں اکثریت نے یہی تشخیص کیا کہ مولینا پر جان لیوا جادو کیا گیا ہے"۔[1]

اور یہ صرف ایک فرد کی رائے نہیں ہے مولینا کے قریب ترین احباب میں سے بیشتر کی ہی یہی رائے تھی' مولینا ابوالحسن بارہ بنکوی شگفتہ مزاج ادیبانہ طرز فکر رکھنے والے بزرگ تھے (افسوس کہ انہیں "تھے" لکھنا پڑ رہا ہے) انہوں نے اپنے مضمون "بیماری یا سحر" میں بہت تفصیل سے ان اسباب وعوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولینا پر جادو کر دیا گیا تھا افسوس صرف اس کا ہے کہ حضرت مولینا ابوالحسن نے بھی یہ سرخی تو قائم کی کہ سحر کے اثرات کیا تھے مگر یہ تفصیل سے نہیں لکھا کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کی بناء پر یہ لوگ اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ مولینا جادو سے ہلاک ہوئے' اس سلسلہ میں حضرت مولینا ابوالحسن مرحوم کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم سے میری تفصیلی اور آخری ملاقات رمضان المبارک میں یعنی انتقال سے تقریباً ماہ ڈیڑھ ماہ قبل ہوئی۔ مرحوم نے اپنے اوپر سحر کا شبہ ظاہر کیا۔

[1] ترجمان دار العلوم ص ۵۲۸۔۵۲۷

میں نے عرض کیا کہ اچھا! کل صبح آ کر آپ کو چیک کرلوں گا' دوسرے روز معلوم ہوا کہ مولانا کا شک بے بنیاد نہیں اور وہ بدترین سفلی عمل کی زد میں آچکے ہیں میں نے مولانا سے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی ڈھارس ہی بندھائی پھر بھی بجائے خود خطرات کے احساس سے پریشان تھا اس لیے مولانا سے یہ کہہ کر وطن واپس آگیا کہ آپ کے علاج کے سلسلے میں بعض ایسے احباب سے مدد لینے کی کوشش کروں گا جو علم جفر کے ماہر اور عملیات کے سلسلے میں کافی تجربہ کار ہیں۔ مولانا نے از راہ نوازش کچھ رقم بھی عنایت فرمائی تاکہ دوبارہ سفر میں کوئی زحمت نہ ہو۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تین چار سال قبل بھی مولانا کے ساتھ یہ حرکت کی گئی تھی اور بروقت علاج ورد سحر کی وجہ سے خود مخالف عامل صاحب لڑھک گئے تھے۔ حالانکہ انہوں نے بعض ذرائع سے مولانا کو چیلنج کیا تھا کہ وہ مولانا کو قبرستان پہونچا کر دم لیں گے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خود قبرستان پہنچ گئے۔ "وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ" مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ مولانا کا وقت موعود آچکا تھا کیونکہ حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ کسی زمانے میں پڑھا ہوا شعر یاد آگیا ؎

وإذا المنية أنشبت أظفارها

ألفيت كل تميمة لا تنفع

بہرحال دیوبند سے واپسی کے بعد عامل دوست کے پاس پہنچا اور وہ چونکہ خاکسار پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہیں اس لیے میں نے مولانا مرحوم کا نام پیش کر کے عامل صاحب سے کہا کہ آپ حساب جوڑ کر پہلے تو یہ بتائیے کہ ان کا کیا معاملہ ہے؟ اور اگر مرض کے علاوہ کوئی دوسری بات بھی ہے تو اس کے ازالہ اور تدارک کی تدبیر آپ کو یہ سوچ کر کرنی ہے کہ آپ ان کا نہیں بلکہ میرا علاج کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا حساب کتاب جوڑنے کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کے ان مولانا دوست کی کسی سے سخت دشمنی چل رہی ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت کسی ایک سے نہیں بلکہ کئی ایک سے چل رہی ہے' چل چکی ہے اور خیال ہے کہ آئندہ بھی چلتی رہے گی' بہرحال انہوں نے از راہ نوازش اپنے یہاں روزانہ آنے والے مریضوں کے ازدحام کی پروانہ کرتے ہوئے سفر دہلی

کے لیے یکم اپریل کی تاریخ دے دی اور راقم الحروف انکے ساتھ ۲/اپریل ۱۹۹۵ء کی صبح دہلی پہنچ گیا' انہوں نے مولانا کو دیکھا اور مجھ سے تنہائی میں کہا کہ معاملہ بہت سخت ہے اور مکمل علاج کے لیے مطلوبہ وقت تک مولانا محض اپنی قوتِ ارادی سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھ سکیں گے امر مشتبہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ علاج شروع کیجئے باقی جو اللہ کی مرضی ہے اس کے سامنے چارہ کار ہی کیا؟ کم از کم اس احساس سے دل میں کبھی خلش تو نہ پیدا ہوگی کہ ہم نے کچھ نہیں۔ رمضان المبارک کی مذکورہ ملاقات ہی کی بات ہے' میں نے عرض کیا کہ اگر واقعی سحر وغیرہ کا معاملہ ہے تو علاج ضرور کروں گا لیکن اگر آپ صحت یاب ہو گئے تو آپ سے تحریر بھی لے لوں گا کہ بقیہ زندگی آپ سیاسی یا نیم سیاسی سرگرمیوں سے دور رہیں گے کیونکہ آپ کی صحت اب مزید مصروفیات اور اعصابی تناؤ کی متحمل نہیں ہو سکتی میری اس بات پر مولانا مرحوم نے میرے بے تکلف دوست اور ساتھی حکیم عبد القدوس صاحب دیو بندی مرحوم (خلیفہ حضرت مولانا ذکریا صاحب رحمتہ اللہ علیہ) کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ حکیم صاحب موصوف نے بھی مدینہ منورہ میں تقریباً یہی مشورہ دیا ہے۔ (رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں حکیم صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون)۔"[1]

اس پوری عبارت سے یہ نہیں واضح ہوتا کہ وہ کونسی تکالیف تھیں جن کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا۔ جادو ہی کیا گیا ہے۔

اگر ان کا باضابطہ علاج ہوا اور ان کو آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز یا اور کوئی اعلیٰ ترین معالج کو دکھایا گیا اور وہ مرض کی تشخیص نہ کر سکا یا ہر طرح سے جانچ کی گئی Biopsy ہوئی اور یہ پتہ چلا کہ انہیں کیا مرض ہے یا کچھ نہیں ہے' تو پھر تیماردار یہ سوچنے میں حق بجانب ہوتے کہ سحر ہے مگر ان پر کیا اثرات تھے اس کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ مولینا ابوالحسن لکھتے ہیں:

"مولانا مرحوم کہنے لگے کہ گذشتہ سفر سعودی عرب کے دوران مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں خیر آباد کے مشہور عامل مولانا نصیر احمد صاحب کرمانی سیتا پوری (مرحوم) سے ملاقات ہوئی جن کی شاید سفر افریقہ سے واپسی ہوئی تھی انہوں نے ایک متعینہ تاریخ پر لکھنو بلایا تھا

[1] ترجمان دارالعلوم ص ۵۳۰۔۵۳۱

تاکہ وہ میرا مکمل عملیاتی علاج کردیں۔ مگر بدقسمتی سے مذکورہ متعینہ تاریخ سے صرف چند روز قبل مولانا نصیر احمد صاحب کا جیپ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا جس کو وہ خود ہی چلارہے تھے۔ مولانا مرحوم فرمانے لگے کہ جب میں دہلی ہوتا ہوں اس وقت طبیعت بہت کچھ غنیمت رہتی ہے۔ مگر دیوبند پہنچتے ہی مصیبت آجاتی ہے' معلوم ہوتا ہے یہیں کے لیے کچھ کیا گیا ہے یا کیا جارہا ہے بلکہ دارالعلوم میں ملازمت کے دوران تو یہ کیفیت تھی کہ مدرسہ میں داخل ہوتے ہی قدم بوجھل ہونے لگتے جیسے ٹانگوں پر منوں بوجھ پڑ رہا ہو، بڑی مشکل سے زینوں پر چڑھنا ہوتا تھا لیکن دارالعلوم کی چاردیواری سے باہر آتے ہی جسمانی کیفیت تقریباً نارمل ہوجاتی تھی۔ مرحوم سے میں نے دریافت کیا کہ چند سال قبل چند چیزیں پابندی سے پڑھنے کے لیے جو بتائی تھیں ان کو معمول بنایا کہ نہیں؟ تو مولانا مرحوم نے نفی میں جواب دیا۔ یہ نماز مغرب کے بعد میری گفتگو ہورہی تھی میں نے مرحوم سے کہا کہ نماز عشاء کے بعد بعض آیات متعینہ تعداد میں پڑھ کر کل صبح مجھے کیفیت بتائیں تو کہنے لگے کہ مولوی ابوالحسن! اس وقت تو میرا دل ودماغ بالکل قابو میں نہیں' مجھ سے تو اب کچھ بھی نہ ہوسکے گا۔ مولانا کی بات سن کر پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے اور میری ہمت پست ہونے لگی۔ مولانا نے بتایا کہ اب تو مجھ سے نماز بھی نہیں پڑھی جاتی' جوں ہی نیت باندھتا ہوں پیٹ میں اس قدر شدید گڑبڑ ہوتی ہے کہ نیت توڑنے پر مجبور ہوجاتا ہوں اور نماز کی نیت توڑتے ہی وہ بے چینی جاتی رہتی ہے۔ شاید مولانا کے کھانے میں کوئی سفلی چیز آگئی تھی جس کا علاج کوئی عامل کامل اٹھارہ کے نقش سے ہی کرسکتا تھا مولانا نے بتایا کہ دلی کے مشہور ترین ماہر ترین اور گراں ترین ڈاکٹروں کا علاج جاری ہے لیکن جب بھی وہ چیک کرتے ہیں کسی خاص اور متعین نتیجہ تک پہنچنے میں قاصر رہتے ہیں اور نہ ہی علاج ہی سے کوئی فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیچارے ڈاکٹر اس چیز کو کہاں گرفت میں لاسکتے تھے جو تمام جسمانی تکلیف کا بنیادی سبب تھی اور جس کی موجودگی میں کوئی بھی دوا تھوڑی ہی دیر کے لیے اپنا اثر دکھاسکتی ہے بلکہ ممکن ہے اس کے بعد نقصان دہ ثابت ہونے لگے''۔[1]

حالانکہ یہ تذکرہ ملتا ہے کہ معالجین نے پوری کوشش کی لیکن بصد ادب یہ عرض کئے

[1] ترجمان دارالعلوم ص۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲

بغیر نہیں رہا جاتا کہ یا تو وہ تفصیلات نہیں لکھی گئیں یا ان طریقوں کو روبہ عمل نہیں لایا گیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اشتباہ تھا کہ مولینا عارضۂ قلب میں مبتلاء ہیں۔ ساری مساعی کا محور قلب کے اردگرد ہی تھا۔ اور ظاہر ہے کہ علاج میں سب سے اہم چیز تشخیص ہے۔

مولینا ابوالحسن لکھتے ہیں: ؏

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پہ تقدیر کے

"مرحوم کی علالت فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور یہ سلسلہ علاج امید و بیم کے دھندلکوں میں مختلف تدابیر اپنائی جا رہی تھیں۔ معالجین تو اطمینان دلا رہے تھے لیکن راقم الحروف کی چھٹی حس کسی کربناک انجام کے اندیشہ سے لرزاں و ترساں تھی۔ کیونکہ حالات کی ہر کروٹ نہ صرف یہ کہ پریشان کن ثابت ہو رہی تھی بلکہ مایوس کن بھی جیسے کہیں دور سے آواز آ رہی ہو۔ ؏

اٹھائے ہاتھ سوئے آسماں تیمارداروں نے
زباں سے کیوں نہیں کہتے کہ امید شفا کم ہے

حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مولانا مرحوم کے ایک قدیم ترین اور مخلص ترین دوست نے جو کہ ہومیوپیتھک علاج کے ماہرین علاج کی ذمہ داری خود قبول کرتے ہوئے اسپتال کے ڈاکٹروں سے کہا کہ: بیس پچیس روز آپ حضرات کوشش کر کے دیکھ چکے اب چند روز ہمیں بھی خدمت کا موقع عنایت فرمائیں!

اسپتال کے ڈاکٹر اس بات پر بخوشی راضی ہو گئے اور ہمیں بھی قدرے اطمینان ہوا کہ شاید یہ طریق علاج کامیاب رہے لیکن دو باتیں ایسی سامنے آ گئیں کہ ہم لوگ دوبارہ پریشان ہو گئے۔ ایک تو معالج نے یہ ہدایت جاری کر دی کہ دوران علاج گلوکوز نہ چڑھایا جائے جب کہ راقم الحروف کو معلوم تھا کہ شاید ہفتہ عشرہ سے معدہ پانی کا گھونٹ بھی نہیں قبول کر رہا ہے اگر جسم میں پانی کی کمی ہو گئی تو دوران خون کس طرح برقرار رہ سکے گا؟ بار بار یہی خیال آتا۔ میں نے اپنی تشویش کا اظہار بعض قریبی احباب سے کیا تو وہ بھی پریشان

ہوگئے' دوسری سب سے بڑی یہ مصیبت پیش آئی کہ معالج صاحب سفرحج پر روانہ ہوگئے
اور بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ ؎

اے وائے براسیرے کزیاد رفتہ باشد

دردام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

اس وقت اندازہ ہوا کہ موت کے مقابلے میں زندگی کا حصول کس قدر دشوار ہے۔ ممکن ہے جسے ہم زندگی سمجھ رہے ہیں وہ فریب زندگی ہو۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

؎ کسی کے در پہ سنا کل حیات بٹتی تھی

امیدواروں میں خود موت بھی نظر آئی[1]

مولینا کے علاج کے سلسلہ میں ان کے صاحبزادے مولینا بدرالزماں نے نسبتاً معروضی انداز میں ان کی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۹۱ء سعودی عرب میں ان کو یرقان کی شکایت ہوگئی تھی اور ۱۹۹۴ء میں ان کا بلڈ یوریا بڑھا ہوا ہے اور گردے صحیح کام نہیں کر رہے ہیں' اس بیچ میں وہ اپنے قدردانوں کی مہمان نوازی اور ضیافت کا بوجھ اٹھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۵ء میں ان کو ایک بار پھر دہلی لایا گیا مگر ان کی طبیعت سنبھلی نہیں ان کے گردے ٹھیک سے کام نہیں کر رہے ہیں۔ انہیں A.I.M.S لے جایا گیا مگر یہ بھی اتفاق تھا کہ وہاں مرارجی دیسائی کا انتقال ہوگیا اور آوٹ پیشنٹ نہیں دیکھے جاسکے۔ اس کے بعد وہ جب دوبارہ گئے تو ڈیالائیسس ہوا مگر وہ کامیاب نہ ہوا' پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی مولینا عمیدالزماں صاحب کے مکان ذاکر نگر میں لائے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ انتقال سے پہلے انہیں خون کی الٹیاں ہوئی تھیں۔

یہ وہ حالات ہیں جو ان کے صاحبزادے اور ان کے دوست نے لکھے ہیں ان تمام

---

[1] ترجمان دارالعلوم ص ۵۳۲۔ ۵۳۳

حالات کے پیش نظر کوئی ایسا فرد جو موقع پر موجود بھی نہ رہا ہو، اپنے طور پر نتیجہ اخذ کرسکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ اس جدید سائنسی دور میں سحر یا جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی جب قرآن مجید میں سورہ فلق "قل اعوذبرب الفلق۔ من شر ما خلق۔ ومن شر غاسق اذاوقب۔ ومن شر النفّٰثٰتِ فی العقد۔ ومن شر حاسد اذاحسد۔" موجود ہے اور "من شر النفّٰثٰت فی العقد" (گنڈو پر گرہ ڈالنے والیوں) کا ذکر ہے تو وہ سحر یا جادو پر دلالت کرتا ہے، یوں بھی دنیا میں اسباب وعلل کا قانون رائج ونافذ ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی شخص کو کوئی ایسی شئے کھلادی جاتی ہے جو حرام ہے تو اس کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں اور یہی نتائج لوگوں کی زبان میں جادو یا سحر کہلا سکتا ہے

یوں بھی ہندوستانی مزاج عام طور سے یہ ہے کہ جب کوئی مرض سمجھ میں نہیں آتا تو اسے جادو سے تعبیر کردیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ بہت سستا اور آسان تشخیص مرض ہے [1]۔

آج کل یورپ اور امریکہ میں مسمرزم اور ہپناٹیزم پر کتابیں لکھی جارہی ہیں اور ان کے اسکول تک قائم ہوگئے ہیں۔ بہرحال سحر کا وجود قطعاً ہے۔ چند ناتجربہ کار مادہ پرست انکار کریں تو اس سے سحر کی تردید وابطال نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔

معجزہ وکرامت خدا کا فعل ہے۔ اس میں بندے کے فعل کو کچھ دخل نہیں۔ پیغمبر کی تائید کے لئے خدائے تعالیٰ معجزہ دکھاتا ہے اور ولی کی عزت کروانے کے لئے کرامت ظاہر کرتا ہے۔ اگر خود خدائے تعالیٰ ولی کو تصرف کرنے کا حکم دیتا ہے تو یہ بھی کرامت میں داخل

---

[1] یہاں ضمناً اس کا تذکرہ ناگزیر ہے کہ سرکار ختم مرتبت پر بھی سحر کرنے کی کوشش کی گئی اور معوذتین اسی لیے نازل ہوئیں کہ وہ دافع سحر ہیں۔

بحرالعلوم حضرت محمد عبدالقدیر صدیقی حسرتؒ، پروفیسر وسابق صدر شعبہ دینیات، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کی "تفسیر صدیقی" سے ماخوذ ایک تبصرہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتی ہوں کہ ایک جید عالم کے قلم سے "جادو اور سحر" کا مسئلہ ہمیں اچھی طرح سمجھ میں آئے۔ یہ تبصرہ سورہ بقرہ کی آیت "واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملک سلیمان......الخ" کے تحت آیا ہے۔

ہے اگر اپنی خودی سے کوئی تصرف کرے تو یہ ہمت یا عمل ہے، کرامت نہیں ہے۔ جیسے اسباب ظاہری کا ایک نظام ہے۔ اسباب باطنی کا بھی ایک نظام ہے۔ سب ہے مگر لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللهِ؛ حکم خدا کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

مندرجہ بالا تمام تفصیلات میں ایک چھپی ہوئی بات یہ محسوس کراتی ہے کہ مولینا کو شدید یرقان ہوا ہوگا اور اس کے بعد صحت کی جانب سے لاپرواہی کا سلسلہ جاری رہا دوسری طرف شب بیداری دیر تک بیٹھ کر کام کرنا گردہ کے فیل میں نقص کا سبب بنتا ہے اس لیے یہ امکان ہے کہ انہیں جگر میں کینسر ہو گیا ہو اور اس کی تشخیص بروقت نہ ہو سکی اور نتیجہ میں ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اپنی بات کی تصدیق کے لیے یہاں ڈاکٹر مجید خاں ماہر نفسیات حیدرآباد کے ایک مضمون کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''آج تک بھی کئی علماء یہ کہتے ہیں کہ ان کے مخالفین جادو اور کوئی سفلی عمل کیے تھے۔ اور یہ سحر مہلک ثابت ہوا حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا کو اپنے ہی ہاتھوں سے سینچے ہوئے ادارے کے معاندانہ رویہ کی وجہ سے وہ قنوطیت کا شکار ہو گئے تھے اور گردوں کی بیماری کے علاج سے صحت یاب ہو نہ سکے مولانا وحید الزماں نے دارالعلوم دیوبند کی جو خدمت کی اس کی مثال نہیں ملتی مگر شومئ قسمت دیکھیے مولانا نے ان لوگوں کے ہاتھوں شکست کھائی جن کو کاندھے پر چڑھا کر مسند اقتدار پر پہنچایا تھا۔ ہماری قوم کی یہ بدبختی ہے کہ وہ وقت گزرنے کے بعد کسی انسان کی قدر کرتے ہیں۔ اداروں اور جماعتوں کا یہی حشر ہو رہا ہے، ہم مسلک ہونے کے باوجود اپنے ہی کرم فرماؤں پر وار چلانے سے گریز نہیں کرتے آج کل کے حالات میں کہا جاتا ہے کہ کسی پر احسان نہ کرو ورنہ وہ آپ کے دشمن ہو جائیں گے۔''[1]

---

[1] روزنامہ سیاست۔ ۳/ جون ۲۰۰۱ء حیدرآباد

مولینا نے ۱۹۸۲ء کے بعد مسلسل ذہنی جھٹکے کھائے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت مولینا قاری محمد طیب احمد اللہ کو دارالعلوم سے ہٹا تو دیا گیا تھا لیکن خود مولینا کو اس کا احساس تھا کہ ان سے غلطی ہوئی' چنانچہ ایک مضمون میں......لکھا کہ بیٹھے بیٹھے کہہ رہے تھے کہ "وہ ولی تھا ولی" اور یہ فقرہ حضرت مولینا قاری طیب صاحب کے لیے انہوں نے کہا تھا وہ جو انفرادی طور پر چاہے دارالعلوم کے لیے' چاہے اجتماعی طور پر رہا ہو بہر حال اس کو اعتراف حقیقت ہی کہا جائے گا۔ اس سے ان کی نفسیات پر اور اس طرح ان کے اعصاب پر اس کا کتنا اثر ہوگا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولینا نے دامن دل کو ایسے ہم نشینوں سے نہیں بچایا جو آستینوں میں سانپ چھپا کر ڈستے تھے' شکسپیر کے ڈراما "جولیس سیزر" کے کردار جولیس سیزر کی طرح انہوں نے بھی ایک بار کچھ چیزوں کو دیکھ کر کہا ہوگا............

you too Brutus (تم بھی بروٹس) انہوں نے گھر کو اس لیے آگ لگائی کہ شام غم کی تیرگی چلی جائے گی' لیکن آگ کے شعلوں نے سب کچھ پھونک ڈالا اور آشیانہ پر جو برق گری اور جو تاراج نشیمن وجود میں آئی اس سے مولینا کے اعصاب شکستہ ہو گئے۔

نفسیاتی طور پر ان کی قوت مدافعت ختم ہوگئی ان کے بارے میں یہ درج ہے کہ آخری لمحات میں وہ کچھ لوگوں کو یاد کر رہے تھے کہ وہ عیادت کے لیے آئے یا نہیں [1]۔

وہ یہ سوچتے رہ گئے کہ ان کا انجام شاید یار وفادار کے نشتر زہر آگیں سے ہی مقدر ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کسی حساس انسان کی زندگی میں اس سے زیادہ بھیانک لمحہ کوئی نہیں ہوتا جب وہ عالم تخیل میں اپنے چاروں طرف قاتلوں کا گروہ دیکھتا ہے۔

اس موقع پر احمد فراز کا ایک شعر لکھ کر اس تکلیف دہ حصہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

---

[1] روزنامہ سیاست۔ ۳/ جون ۲۰۰۱ء حیدرآباد۔ ص ۵۳۶

اور پھر سب نے یہ دیکھا کہ اسی مقتل سے
میرا قاتل میری پوشاک پہن کر نکلا

مولینا کے انتقال کے سلسلہ میں ان کے صاجزادے تحریر فرماتے ہیں:

"انتقال سے ایک روز قبل رات کو والد صاحب پر کچھ غنودگی کی کیفیت طاری رہی اسی حالت میں انہوں نے کئی بار مولینا مصطفے کے بارے میں دریافت کیا۔ صبح کو تقریباً چار بجے کہنے لگے کہ کیا مولوی مصطفے ابھی سوکر نہیں اٹھے میں نے ان سے کہا کہ وہ تو ابھی کلکتہ سے نہیں آئے۔ یہ سن کر ان کو بڑی مایوسی ہوئی اور دوبارہ انہوں نے اس بارے میں دریافت نہیں کیا۔ اگلے روز پورا دن بے چینی میں گذرا اور شام کو تقریباً چھ اور سات بجے کے درمیان ان کو خون کی کئی الٹیاں ہوئیں اور ساڑھے سات بجے جب آخری الٹی ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور وہ ہم سب کو غمزدہ چھوڑ کر اس دارفانی سے رحلت فرما گئے "اناللہ وانا الیہ راجعون"۔[1]

اور یہ وہ منزل ہے جس سے چاہے وہ کسی مرتبہ کا ہو یا کسی عقیدہ کا ہو ہر ذی روح کو گزرنا پڑتا ہے بہت سارے لوگوں کے نزدیک یہ منزل فنا ہے اور بعض کے نزدیک۔

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اور راقمۃ الحروف کے نزدیک بھی سفر حیات کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ زنجیریں بدلتی رہتیں۔ مولینا کے انتقال پر ان کے ایک چاہنے والے کا ردعمل کچھ اس طرح کا ہے۔

"مولینا وحید الزماں صاحب جو اب مغفور و مرحوم ہو گئے کا انتقال ایک طویل علالت کے بعد ۱۵/ اپریل ۱۹۹۵ء کی شب ساڑھے سات بجے ان کے چھوٹے بھائی مولینا عمید الزماں صاحب کے مکان ذاکر نگر دہلی میں ہوا۔ یقیناً یہ خبر علمی حلقوں کے لیے خاص طور سے ایک اندوہناک اور عوامی سطح پر افسوس ناک خبر تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چہار دانگ

---

[1] مولانا بدرالزماں کیرانوی۔ ترجمان دارالعلوم۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر۔ ص ۵۳۴

عالم میں یہ خبر پھیل گئی اور تھوڑی ہی دیر میں دہلی میں احباب واعزہ اور طلبہ ومعتقدین پروانہ وار مولینا کی آخری زیارت کے لیے "فلیتنافس المتنافسون" کے قاعدہ کے تحت ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے رہے۔"

پھر رات ہی مولینا کی جسد خاکی کو دیوبند لایا گیا اور اسی وقت سے مولینا کی زیارت کا سلسلہ شروع ہوا جو تقریباً دس گیارہ بجے تک رہا۔ مولینا کی آخری زیارت کے لیے طلبہ کا جو بے پناہ جوش نظر آیا اور مولینا کے ساتھ ان کی وارفتگی کا جو شہرہ تھا صاف طور پر ان کے انتقال کے بعد بھی نظر آیا اور ماضی کی پھر وہی تصویر ذہن ودماغ پر ابھر کر آنے لگی جس کو بھلانے کی کوشش کے باوجود ایک بات ذہن میں تو پیوست آپ بخود ہو ہی جاتی ہے کہ مولینا کی شخصیت دارالعلوم کے تناظر میں وقت واپسیں بھی وہ اس طرح محبوب تھے جس طرح اپنے علمی شغف کے آغاز میں۔

یہاں مولینا اسعد الاعظمی صاحب کا یہ بیان اس منظر کی طرف اشارہ کرتا ہے جو منظر عوام کو دیکھنے کو ملا۔ انہوں نے ان بہت سے حضرات کی ایک فہرست تیار کی ہے جو درج کی جاتی ہے یہ لکھنے میں ذرہ برابر جھجک نہیں کہ یہ فہرست بڑی معنی خیز ہے ان میں ایسے حضرات کے نام نامی بھی ہیں جن سے مولینا کے شخصی اختلافات تھے' ان اسماء گرامی سے جہاں مولینا کی عدیم المثال مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے اور تعزیت پیش کرنے والے حضرات کی عالی ظرفی اور بلندی اخلاق یا مصلحت پسندی کا پتہ چلتا ہے وہیں اسلام کے ساری دنیا کے لیے اس رہنما اصول کا پتہ چلتا ہے کہ موت اختلافات کو بھی دفن کر دیتی ہے اور سچا مسلمان وہی ہے جس کے دل میں کدورت نہ ہو۔ مولینا اسعد الاعظمی کی مرتب کردہ فہرست پیش کی جارہی ہے:

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولینا مرغوب الرحمن صاحب نائب مہتمم و شیخ الحدیث' مولینا نصیر احمد خاں ناظم تعلیمات' مولینا قمر الدین اساتذہ حدیث' مولینا نعمت اللہ اعظمی' مفتی سعید احمد پالن پوری' مولانا عبدالحق اعظمی' مولانا زبیر احمد' مفتی ظفیر الدین' مولانا ارشد مدنی' مولانا

ریاست علی بجنوری، مولانا عبدالخالق سنبھلی، مولانا عبدالخالق مدراسی، وقف دارالعلوم کے مہتمم، مولانا محمد سالم قاسمی، شیخ الحدیث مولانا سید انظر شاہ کشمیری، مظاہر علوم وقف کے شیخ الحدیث مولانا عثمان غنی، مولانا وقار احمد، مظاہر علوم سہارنپور کے استاد مولانا رضوان نسیم، جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ کے مہتمم اور مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق مولانا عبداللہ مغیثی اور ان اداروں کے دیگر اساتذہ وطلباء نیز تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، کارگزار ناظم اعلیٰ مولانا مزمل الحق حسینی، رکن عاملہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، سکریٹری مولانا آس محمد گلزار قاسمی، ارکان مشاورتی بورڈ مولانا غیاث الحسن مظاہری، مولانا شفیق الرحمن میرٹھی، مولانا بشیر احمد راشد الامینی، مرکزی جمیعتہ علمائے ہند کے جنرل سکریٹری مولانا فضیل احمد قاسمی، معززین شہر دیوبند جناب حسیب صدیقی، ڈاکٹر شمیم وحکیم اسحاق وغیرہ، دہلی سے حافظ انس علوی، جمعیۃ علمائے ہند کے سکریٹری مولانا اسجد مدنی اور مدرسہ شاہی مرادآباد و مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ کے اساتذہ پر مشتمل وفود اور دوسرے بہت سے حضرات نے مولانا کے گھر پر ان کے برادران و صاحبزادگان کو تعزیت پیش کی۔

یہاں مقصود فہرست سازی یا تعزیت کنندہ شماری نہیں ہے۔ بلکہ یہ سارے نام ایسے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی Stage پر خود بھی نہایت اہم تھے اور مولینا کی زندگی میں کسی نہ کسی طرح کا تائیدی یا اختلافی رخ رکھتے تھے اس سے ایک اہم بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ تعزیت پیش کرنے والوں میں یقیناً ایسے افراد بھی تھے جن سے مولینا کے اختلافات تھے مگر یہ تمام لوگ ایک لمحہ کے اندر تعزیت کے لیے پہنچ گئے۔

ان کی تدفین اور نماز جنازہ کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کی جارہی ہیں ظاہر ہے کہ اس موقع کی تفصیلات کیلئے جناب اسعد الاعظمی کے بیان کا سہارا لینا پڑ رہا ہے موصوف لکھتے ہیں:

> ’’صبح ۱۱ بجے دارالعلوم دیوبند کے احاطۂ مولسری میں مولانا کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس ہزار افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی، اخبارات‘

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اس سانحہ کی خبر فوری طور پر نشر ہو جانے سے دیوبند کے علاوہ سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ اور دوسرے نواحی علاقوں سے بھی بہت سے افراد نے جنازہ میں شرکت کی نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی نے پڑھائی۔ جس کے بعد علم واخلاق اور عزم وعمل کے اس پیکر کو قبرستان قاسمی میں اکابرین دیوبند کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازہ کو کاندھا دینے کے لیے لوگوں کا جوش وخروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ قطر کی وزارت اوقاف کے شیخ عبدالحسن نے بھی نماز جنازہ میں شرکت کی"۔[1]

یہ تو حقیقت ہے کہ تدفین کے موقع پر اگر افراد کی کثرت ہوتی ہے تو اسے میت کی مقبولیت ومحبوبیت پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ نہ یہ کلیہ بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی پیمانہ ہو سکتا ہے بہرحال ایک طریقہ ہے کہ جس سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس دنیا سے جانے والے نے کس حد تک لوگوں کے دل ودماغ کو متاثر کیا تھا۔

یہ وہ موقع ہوتا ہے جس میں خوشنودی خدا اور مرحوم سے اپنے ذاتی تعلقات کے بناء پر مجبور ہو کر لوگ شرکت کرتے ہیں۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے بہرِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

وہ زبان جس نے عربی ادب کے لالہ وگہر مٹائے تھے اب خاموش تھی وہ متحرک وفعال شخصیت منوں مٹی کے نیچے تھی اور جیسے جیسے آفتاب بلند ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے اس کی کرنیں اس کا اعلان کرتی جا رہی تھیں کہ یہ شخصیت بھی اپنے عملی کارناموں کی کرنیں ہمیشہ بکھیرتا رہے گا۔

"مولانا کے سانحہ ارتحال پر ہندو بیرونِ ہند سے تلامذہ ومعتقدین اور دوسرے حضرات کی طرف سے خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعہ بڑی تعداد میں تعزیتی پیغامات موصول ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔ تعزیتی پیغامات بھیجنے والی اہم

---

[1] ترجمان دارالعلوم ص۔ ۵۴۴

شخصیات میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند' مفتی مظفر حسین صاحب ناظم مظاہر علوم وقف' مولانا محمد اللہ صاحب ناظم مظاہر علوم سہارنپور' مولانا محمد رابع حسنی ندوۃ العلماء لکھنؤ' مولانا محمد اسرار الحق قاسمی' جناب امین الحسن رضوی' ڈاکٹر سید عبدالباری (آل انڈیا ملی کونسل نئی دہلی) مولانا رضوان القاسمی حیدرآباد' ڈاکٹر شمس تبریز خاں قاسمی لکھنؤ' مولانا ندیم الواجدی دیوبند' مفتی فخرالاسلام کلکتہ (ارکان عاملہ تنظیم ابنائے قدیم) مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پور' مولانا اسیر ادروی جامعہ اسلامیہ بنارس' مولانا ظہیر انوار بستی' مولانا عبدالعلی فاروقی ایڈیٹر البدر لکھنؤ' ڈاکٹر محمد فرقان ایڈیٹر سچ بالکل سچ دہلی۔ مولانا نور عالم خلیل الامینی' مولانا محمد رضوان' بمبئی' جناب عبدالعزیز عمر سلفی ایڈیٹر نوائے اسلام دہلی' مولانا محمد شعیب قاسمی جے پور' مولانا محمد فرقان قاسمی بجنور' مولانا محمد عزیز قاسمی پورہ معروف مؤ' مولانا محمد اسلم جاوید رامپور' مولانا عبدالغفار و مولانا افتخار احمد (مدرسہ امینیہ دہلی) شیخ عبدالعزیز عمار جامعۃ الامام محمد بن سعود (سعودی عرب) قابل ذکر ہیں۔ سعودی عرب' قطر اور کویت میں مقیم فضلائے دیوبند اور کویت و سعودی عرب کے سفارت خانوں کی طرف سے بھی تعزیتی خطوط موصول ہوئے علاوہ ازیں بے شمار مدارس عربیہ اور مسلم اداروں اور تنظیموں کے ذمہ داروں نے بھی تعزیتی پیغامات ارسال کئے ہیں جن میں مدرسہ قاسمیہ تعلیم الاسلام موانہ میرٹھ' جامعہ اسلامیہ قاسمیہ سیتامڑھی' مدرسہ امدادیہ اشرفیہ راجوپٹی' دارالعلوم الاسلامیہ بستی' بزم فلاح دارین سہارنپور' مدرسہ ناندہ بادلی' مدرسہ ریاض العلوم سرونج' مدرسہ ٹنڈیرہ مظفرنگر' قاضی پبلشرز دہلی' مدرسہ دینیہ غازیپور وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سے تلامذہ و معتقدین دور دراز کا سفر طے کرکے دہلی و دیوبند پہنچے اور مولانا کے متعلقین سے اظہار تعزیت کیا۔ مولانا اسعد مدنی' مولانا بدرالدین' مولانا ابوالقاسم بنارسی (ارکان مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند) اور مولانا مرحوم کے بچپن کے دوست حکیم منظور صاحب (شاملی مظفرنگر) نے بھی گھر پہنچ کر اعزہ و اقارب کو تعزیت پیش کی۔[1]

یہ سارے گوشے اس لیے پیش کئے گئے کہ اسی سے مولینا کی سیرت و شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو باطنی طور پر لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے' ان پیغامات میں اور حضرت مولینا اسعد مدنی کے بنفس نفیس آکر تعزیت پیش کرنے میں نہ جانے کتنی

---

[1] ترجمان دارالعلوم ص۔ ۵۴۶

کہانیاں پوشیدہ ہیں، یہ وہ کہانیاں ہیں جہاں کبھی کبھی الفاظ بھی نہیں بولتے بلکہ جنبش نگاہ وہ سب کچھ کہہ دیتی ہے جو تکلم سے بھی ادا نہیں ہوتا، اس کے بعد ان کے سلسلہ میں تعزیتی جلسے بھی ہوئے اور ان جلسوں کی اپنی جگہ پر خود اہمیت تھی اس کی تفصیل مولینا اسعد الاعظمی کے مضمون کے حوالے سے درج ہے وہ لکھتے ہیں:

"مولانا کی وفات پر ملک کے مختلف حصوں میں تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے۔ دار العلوم دیوبند وقف دار العلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور مظاہر علوم (وقف)، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ دار القضاء جنوبی دہلی دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد، آل انڈیا ملی کونسل، مدرسہ شاہی مراد آباد جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ، جامعہ عربیہ خادم الاسلام ہاپوڑ، مدرسہ امینیہ دہلی، مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی، مدرسہ حسین بخش دہلی، جامعہ رحیمیہ دہلی، جامعہ اسلامیہ فیض العلوم رامپور جامعۃ القرآن الکریم بجنور، مدرسہ قاسمیہ کلکتہ، اور تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کی شاخ شہر میرٹھ نیز سعودی عرب وقطر کی شاخوں سے تعزیتی جلسوں اور ایصال ثواب کی محفلوں کی خبریں موصول ہوئی ہیں"۔ [1]

اس سلسلہ میں تمام پیغامات اور تجاویز سے زیادہ اہم طلبہ کی وہ جماعت جس کا نام "تنظیم ابنائے قدیم" تھا۔ اس کا تعزیتی جلسہ تھا۔ حالانکہ یہ جلسہ ایک ایسی تنظیم کی طرف سے تھا جس کا نقطہ آغاز ہی مولینا وحید الزماں تھے لیکن اس کی طرف سے جو جلسہ ہوا۔ اس کی نوعیت کل ہند جلسہ کی تھی اس کی رپورٹ کے جستہ جستہ حصے پیش کئے جا رہے ہیں:

"حضرت مولانا کیرانوی تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کے سرپرست اور اس کی مرکزی مجلس عاملہ کے اہم رکن تھے، ان کی وفات حسرت آیات جہاں ایک ناقابل تلافی ملی خسارہ ہے وہیں تنظیم ابنائے قدیم کے لیے ایک عظیم ذاتی سانحہ بھی ہے۔ تنظیم کے مرکزی دفتر نے مولانا کے سانحہ ارتحال پر ۲۱/ اپریل ۱۹۹۵ء کو بعد نماز مغرب غالب اکیڈمی نئی دہلی میں بڑے پیمانے پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا جس میں دہلی اور آس پاس کے علاقوں سے علمائے کرام دینی مدارس کے ذمہ داران اور متعدد مسلم اداروں

---

[1] ترجمان دار العلوم ص۔ ۵۴۶

اور تنظیموں کے نمایندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور مولانا کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالی' اس جلسہ کو مسلمانوں کے تقریباً ہر مکتب فکر کی نمایندگی کا امتیاز حاصل رہا۔

اس موقع پر مولانا سید احمد ہاشمی سابق ایم پی نے کہا کہ مولانا مرحوم ایک طرف انتہائی شریف' وضع دار اور مرنجان مرنج اور دوسری طرف بہت کھرے انسان تھے۔ جو بات ان کی نظر میں حق ہوتی اس کے برملا اظہار میں انہیں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ وہ نرے عالم نہیں تھے بلکہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور متانت فکر بھی اس درجہ تھی کہ اکابرین ان کی قدر دانی پر مجبور تھے۔ وہ عربی زبان وادب کی ایک عبقری شخصیت تھے۔ ہوسکتا ہے کہ تشہیر و پروپیگنڈہ کی اس دنیا میں ہم ان کے ساتھ انصاف نہ کرسکے ہوں اور ان کو وہ شہرت نہ مل سکی ہو جس کے وہ مستحق تھے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت سی شہرت یافتہ شخصیتوں سے بلند تھے۔ قحط الرجال کے اس زمانے میں ان کا کوئی بدل ملنا ناممکن ہے۔

آل انڈیا ملی کونسل کے اسٹنٹ سکریٹری جنرل مولانا اسرار الحق قاسمی نے کہا کہ مولانا مرحوم میرے استاذ تھے اور مجھے ایک عرصہ تک ان کے قریب رہنے' ان کے ساتھ کام کرنے اور کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے پایا کہ مولانا فکری انسان ہونے کے ساتھ ساتھ عملی شخصیت تھے۔ کوئی فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرتے اور پھر اس پر جم جاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو کچھ سوچا گیا ہے اس کو عملی شکل دی جائے' اور ان کی یہی وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے ہر میدان میں انہیں لڑائی مول لینی پڑی۔ شریعت اور اپنے اسلاف کی روایات پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ساتھ ہی عصری تقاضوں کو بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ طلباء کے ساتھ انکی دردمندی اور شفقت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ طلباء کی مالی ضرورتوں کیلئے انہوں نے دارالعلوم میں باہمی امدادی فنڈ قائم کیا جس سے بے شمار طلباء مستفید ہوئے"۔[1]

اس جلسہ میں جو تعزیتی تجویز پیش کی گئی اور منظور کی گئی اس کا متن درج ہے' ظاہر ہے کہ اس طرح کی تجاویز صدر جلسہ کی طرف سے پیش ہوئی ہیں:

جلسہ میں ایک تعزیتی تجویز پاس کی گئی جس کا متن حسب ذیل ہے:

"حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات نہ صرف یہ کہ علمی ودینی اور ملی

[1] ترجمان دارالعلوم ص ۵۴۷

حلقوں کا بلکہ عالم اسلام کا بڑا حادثہ ہے۔ آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پورا ہونا مشکل ہے' مولانا جید عالم دین' ہندوستانی مسلمانوں کے مخلص قائد اور راہنما' عربی زبان کے عظیم ادیب اور مصنف تھے۔ آپ نے بڑی تعداد میں عربی زبان کے انشاء پرداز اور ماہرین بنائے آپ کے تلامذہ کی بڑی تعداد دنیا کے مختلف ممالک میں عربی زبان اور علم وفن کی اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔ آپ کی مرتب کردہ القاموس الجدید و القاموس الاصطلاحی عربی اردو و اردو عربی سے ہندوستان و بیرونِ ہند ہزاروں شائقین وطلبائے عربی زبان و ادب مستفید ہو رہے ہیں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان کی ترویج وتعلیم کے لیے جو جدوجہد کی اور جس کی وجہ سے عرب ممالک میں دارالعلوم کو امتیازی مقام حاصل ہوا اور اس کی شہرت ہوئی وہ ان کی دارالعلوم کی تاریخ میں ایسی خدمت ہے جس نے دارالعلوم میں ایک انقلاب برپا کر دیا' مولانا مرحوم کو دارالعلوم دیوبند سے زبردست جذباتی تعلق تھا۔ وہ دارالعلوم دیوبند کو دنیا کی ممتاز دانش گاہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دارالعلوم کے مددگار مہتمم کی حیثیت سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔ افسوس کہ بعض عوامل اور حالات نے ان کے خوابوں کی تعبیر کو عمل پذیر نہیں ہونے دیا۔ وہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کے سرپرست تھے۔ تنظیم ابنائے قدیم ان کی وفات کو ملت اسلامیہ اور فضلائے دیوبند اور علمی حلقوں کا زبردست نقصان تصور کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے"۔[1]

اس جلسہ میں جن لوگوں نے تقریریں کیں اور جس طرح انہیں یاد کیا گیا وہ یادگار حیثیت کا مالک ہے' چنانچہ اس کے کچھ حصے پیش خدمت ہیں:

"مولانا اسرار الحق قاسمی نے کہا کہ مولانا موصوف صرف پڑھاتے نہیں تھے بلکہ شمع کی طرح پگھل پگھل کر رجالِ کار تیار کرتے تھے۔ تدریس اور تصنیف وتالیف کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے آرام کے اوقات میں طلباء پر محنت کرتے تھے۔ اس محنت کے نتیجہ میں وہ طرح طرح کی جسمانی تکلیفوں میں مبتلا رہتے لیکن کبھی ہمت نہ ہارتے۔ اس محنت کا ثمرہ آج پورے ملک میں موجود ہے۔ مولانا دنیا سے چلے گئے لیکن ہمیں اطمینان ہے کہ

---

[1] ترجمان دارالعلوم ص۔ ۵۵۳

وہ ایسی نسل اور ایسے افراد تیار کر کے گئے ہیں جو ان کے مشن کو آگے بڑھاتے رہیں گے ۔مولانا کے تلامذہ ان کا سب سے بڑا ورثہ اور ملت کا قیمتی سرمایہ ہیں ۔مولانا قاسمی نے تجویز پیش کی کہ مولانا مرحوم پر بڑے پیمانہ پر ایک سمینار کر کے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا جائے ۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے کہا کہ مولانا وحید الزماں علیہ الرحمۃ کے کردار کا ایک یادگار پہلو ان کا خلوص تھا' ان کی رائے خیانت کے ساتھ نہیں دیانت کے ساتھ ہوتی تھی ۔ان کی رائے سے اختلاف تو ممکن ہے لیکن ان کے اخلاص اور ان کی نیک نیتی پر شک کی گنجائش نہیں ۔ان کا جوہر انسانیت کا جوہر تھا وہ بڑے بہادر اور جرأت مند انسان تھے ۔ان کی خدمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مدارس کے فضلاء پر عربی بولنے اور لکھنے پر قادر نہ ہونے کے الزام کو دور کیا ۔مولانا کا یہ قابل قدر کارنامہ ہے ۔

قومی مشاورت کمیٹی کے کنوینر جناب جاوید حبیب نے کہا کہ مولانا اگر چہ میرے استاد نہیں تھے لیکن ان کے بہت سے شاگردوں سے میرے روابط رہے ہیں ۔وہ جس عقیدت سے ان کا ذکر کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عظمت کے کسی بلند مقام پر فائز تھے انہوں نے عربی زبان کی ترویج واشاعت اور طلباء کی شخصیت سازی جیسے عظیم کام میں مدت حیات صرف کی جماعت اسلامی کے نائب امیر مولانا محمد شفیع مونس نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم سے میری ذاتی ملاقاتیں کم رہیں لیکن میں اس بات سے بہت متاثر رہا کہ ان کے علمی مرتبہ اور علمی وملی خدمات کے ساتھ ان کے احباب ورفقاء اور شاگرد سب ان کے اعلیٰ اخلاق وکردار کے معترف ہیں ۔یہ وہ چیز ہے ۔جو بہت کم یاب ہے ۔

ممبر پارلیمنٹ جناب محمد افضل نے ۱۹۸۰ء میں مولانا مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کیا جب دارالعلوم کے ہنگامہ کے دوران وہ صحافی کی حیثیت سے دیوبند گئے تھے ۔ انہوں نے کہا کہ مولانا نے تمام معاملات پر جس طریقہ سے روشنی ڈالی اس سے میں بے حد متاثر ہوا اور اسی دن سے مولانا سے ہمیشہ کے لیے ایک عقیدت سی ہوگئی ۔وہ اپنی بات اسی طرح پیش کرتے تھے کہ سننے والا مطمئن ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا ۔محمد افضل نے کہا کہ دیوبند میں گھومتے ہوئے طلباء اور اساتذہ کی زبان پر بس ایک ہی نام سنائی دیتا تھا ۔

مولانا عبدالوہاب خلجی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث نے مولانا مرحوم کے اخلاق کریمانہ کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۷۲ء کا واقعہ سنایا۔ جب وہ عربی درجہ اول کے طالب علم تھے اور دار العلوم دیکھنے کا شوق انہیں دیوبند لے گیا۔ وہاں اتفاقاً مولانا سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے خیریت اور سفر کا مقصد وغیرہ پوچھا اور عربی میں مہارت کے لیے کچھ نصیحتیں کیں اور کچھ کتابوں کی نشاندہی کی۔

مولانا موصوف نے سفر کویت کے بھی کچھ واقعات سنائے جب وہ مولانا مرحوم کے رفیق سفر تھے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا نے عربی کا ایک نیا ذوق پیدا کیا اور مختلف اداروں میں عربی کی جو خدمت ہو رہی ہے اس کے اولین معماروں کی فہرست میں مولانا کا اسم گرامی صف اول میں ہوگا۔ وہ ہمارے لیے عربی لغات کا بہترین سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جس سے کوئی طالب علم مستغنی نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے مولانا کے خطوط مکاتیب کی ترتیب و اشاعت پر زور دیا۔ اور کہا کہ مولانا پر سیمینار کم از کم برصغیر کے پیمانہ پر ہو۔

مولانا عبداللہ طارق نے اپنے طویل مقالہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا اپنی ذات میں ایک انجمن اور علوم و معارف کی ایک دنیا تھے۔ دار العلوم میں وہ جس عہدے پر بھی فائز رہے اس کے وقار کو بڑھایا۔ عہدوں سے جتنا ان کا نام روشن ہوا اس سے زیادہ ان کی ذات سے ان عہدوں کو چار چاند لگ گئے۔ طلباء کا ان سے تعلق والہانہ اور شیفتگی و فریفتگی کا ہوتا تھا۔

مولانا احمد علی قاسمی نے کہا کہ میں مولانا مرحوم کو اس وقت سے جانتا ہوں جب تقریباً ۴۴ سال پہلے وہ اور میں دار العلوم میں زیر تعلیم تھے۔ دور طالب علمی سے ان میں یہ جذبہ نمایاں تھا کہ اپنا علم و فن دوسروں کی طرف منتقل کر دیں۔

مولانا مرحوم کے دوسرے متعدد تلامذہ نے بھی اپنے اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات کی روشنی میں مولانا کے گوناگوں اوصاف و کمالات پر روشنی ڈالی۔ مولانا عبدالستار سلام قاسمی مہتمم دار العلوم دہلی نے کہا کہ حضرت الاستاذ کے تئیں طلباء کی دیوانگی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر طالب علم کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ عفو و درگذر ان کی خاص صفت تھی۔ وہ مکر و فریب، منافقت اور مداہنت کی سیاست سے قطعی ناآشنا تھے۔ حق کا برملا اظہار ان کا شیوہ تھا۔ اصول و اقدار پر سودے یا مصالحت کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں

کیا۔ اگر سود ے بازی ان کا مزاج ہوتی تو وہ تادم حیات دارالعلوم کے مددگار مہتمم ہی رہتے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند اور تنظیم ابنائے قدیم کے ارباب حل وعقد پر زور دیا کہ مولانا کی کوئی ایسی یادگار قائم کی جائے جو ان کے مشن اور کاز کو فروغ دے اور انہیں زندہ تابندہ رکھے۔ [1]

مولانا عقیل احمد قاسمی صدر مدرس جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ، مولانا آس محمد گلزار قاسمی سکریٹری تنظیم ابنائے قدیم، مولانا شفیق الرحمن میرٹھی، ڈاکٹر معروف قاسمی (دیوبند) اور مولانا بشیر احمد راشد الامینی نے بھی اپنے استاذ کو جذباتی خراج عقیدت پیش کیا۔ مولانا عبدالعزیز ظفر جنکپوری اور جناب جبریل امین صدیقی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مولانا ریاض الدین نمائندہ مظاہر علوم وقف، مولانا رضوان نمائندہ مظاہر علوم سہارنپور وغیرہ نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، ریاض میں مقیم فضلائے دیوبند، جناب محفوظ الرحمن صاحب ایڈیٹر بادبان جدید اور بعض دیگر حضرات کے پیغامات تعزیت پڑھ کر سنائے گئے۔ جلسہ کی صدارت تنظیم ابنائے قدیم کے صدر اور مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق کار مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض مولانا علیہ الرحمہ کے تلمیذ رشید مولانا مزمل الحق حسینی کارگزار ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم نے انجام دیئے۔ مولانا جمیل احمد الیاسی اور مولانا حفظ الرحمن میرٹھی نے بھی اظہار خیال کیا۔

قابل ذکر ہے کہ مولانا علیہ الرحمہ کے اہم تلامذہ ورفقاء، مختلف مکاتب فکر اور اہم مسلم اداروں اور تنظیموں کی نمایندگی سے اس تاریخی جلسۂ تعزیت نے ایک سیمینار کی شکل اختیار کر لی''۔ [2]

اس جلسہ کے علاوہ دہلی میں ایک تعزیتی جلسہ اور ہوا جسے جمعیۃ العلماء کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جمعیۃ العلماء کا ایک حصہ جمعیۃ کی تقسیم کے بعد مولینا کے ساتھ تھا اور اسی کی طرف سے ایک جلسہ جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ میں منعقد ہوا تھا۔ مولینا کے انتقال کے تقریباً ایک ماہ بعد:

''اس جلسہ میں بھی بڑی تعداد میں علمائے کرام، مسلم قائدین اور دیگر معزز شخصیات نے شرکت کی اور مقالوں اور تقریروں کے ذریعہ مولانا کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کے

---

[1] ترجمان دارالعلوم ص۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲

[2] ترجمان دارالعلوم تلخیص۔ علم وادب کا آفتاب غروب۔ اسعد الاعظمی۔ ص ۵۴۷۔ ۵۵۳

مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔مولانا کے متعدد تلامذہ نے چشم دید واقعات و تجربات کی روشنی میں ان کے گوناگوں اوصاف و کمالات اجاگر کیے اہم مقررین میں مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق مولانا محمد عبداللہ مغیثی' مولانا احمد علی قاسمی' مولانا فصیح الدین دہلوی' مولانا عبدالحفیظ رحمانی' جناب جاوید حبیب' جناب انور علی دہلوی' کشور لال (سابق ایم پی) مولانا فضیل احمد قاسمی جنرل سکریٹری مرکزی جمعیۃ علماء' مولانا مزمل الحق حسینی' مولانا قاری شفیق الرحمان میرٹھی' مولانا آس محمد گلزار قاسمی' مولانا حفظ الرحمن میرٹھی' مولانا ریاض الدین مظاہر علوم وقف' ایم ودود ساجد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔صدر جلسہ مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی کی طرف سے منظوم خراج عقیدت مولانا فضیل احمد صاحب نے پیش کیا۔مولانا محمد فرقان قاسمی مہتمم جامعۃ القرآن الکریم بجنور اور مولانا بشیر احمد راشد الامینی نے تفصیلی مقالے پڑھے''۔[1]

اس طرح کے تعزیتی جلسے منظوم خراج عقیدت' تعزیتی پیغامات' تاثراتی مضامین یقیناً بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ہنگامہ خیز ہوتے ہیں لیکن حضرت مولینا وحید الزماں کیرانوی نور اللہ مرقدہ کی شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتے' یہ درست ہے کہ ان کی زندگی ہنگاموں سے بھرپور رہی اور اس طرح کے جو ہنگامے موت کے بعد ہوتے ہیں۔[2] مگر محبتوں کا تقاضا یہ تھا کہ مولینا کے شایان شان ان کی شخصیت سے مطابقت رکھنے والی کوئی یادگار قائم کی جاتی۔کئی برس گزر چکے ہیں اس یادگار کا عربی ادب کے طلبہ و طالبات کو ہنوز انتظار ہے۔

یہ ہے اس زندگی کا اختتامیہ جو لالہ و گل سے عبارت تھی' جس زندگی نے دوسروں کے لیے اپنے کردار و عمل سے ایسے نقوش چھوڑے کہ جس سے دل حق آگاہ ہمیشہ سرخی اور تابندگی حاصل کرتا رہے گا بظاہر دنیا کے لیے پندرہ اپریل ۱۹۹۵ء کی دوپہر گیارہ بجے آہستہ آہستہ جب انہیں سپرد خاک کیا جارہا تھا اور لوگ درمٹھیاں خاک ڈالنے کے بعد اشکوں سے گراں بار آنکھوں اور بوجھل قدموں سے واپسی کے لیے مڑے ہوں گے ایک بار قبر کی طرف دیکھا ہوگا تو اسی وقت ظہر کی اذاں کی آواز فضا میں گونجی ہوگی۔

اللہ اکبر' اللہ اکبر' اللہ اکبر اللہ اکبر ❁❁❁❁❁

---

[1] ترجمان دارالعلوم۔اپریل۔مئی ۱۹۹۵ء [2] وہ عموماً بڑی شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔

باب دہم
(اختتامیہ)
شخصیت ایک جائزہ

شخصیت-ایک جائزہ

مولینا کی پہلودار شخصیت کے ہر گوشے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے گھریلو زندگی میں وہ حد درجہ سعادت مند فرزند سرپرست بھائی، حقیقی معنوں میں شریک حیات شوہر شفیق باپ اور جاں نثار دوست نظر آتے ہیں۔

ان کی زندگی کے ابتدائی نقوش میں یہ پہلو قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے ایک مردم خیز علاقہ میں جنم لیا تو اسکی روایات کو اپنا کر اسکی شناخت اور پہچان برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ علاقائیت کا یہی وہ رجحان تھا جسکی وجہ سے وہ خود کو کیرانوی لکھتے رہے حالانکہ عہد شباب کی انگڑائی سے لے کر موت کی آغوش میں ابدی آرام کرنے والی جگہ تک انہیں دیوبند ہی پسند رہا۔

دیوبند کو انہوں نے اپنی حیات کا سرنامہ بنایا اور وہی دیوبند ان کا اختتامیہ بنا انہوں نے دیوبند سے باضابطہ طور پر اپنی طالب علمی کا آغاز کیا لیکن حیدرآباد کی دین سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حیدرآباد میں حالانکہ ان کا قیام سال بھر سے کچھ ہی زیادہ رہا مگر علامہ دمشقی کی رہنمایانہ زندگی نے ان کے اندر عربی زبان وادب سے متعلق جو شمع روشن کر دی تھی وہ ان کی آخری سانس تک فروزاں رہی اور پھر وہ دیوبند آئے۔

سیاسی طور پر کشاکش کے ماحول میں ان کی شخصیت کے دو حصے بہت روشن ہوئے۔

(۱) حالات سے مقابلہ کرنے کا جذباتی رویہ

(۲) سپر انداختہ نہ ہونا اور شاخ گل کی طرح لچک نہ آنے دینا بلکہ شجر سے پیوستہ رہنا۔

اولوالعزمی تھی صلاحیتیں تھیں۔ اور انہیں یہ احساس تھا کہ زندگی میں مرحلۂ شوق طے

نہیں ہوتا بلکہ نئے طور اور نئی برق تجلی تلاش کرتے رہنا چاہئے اور یہ کہ مومن کی شان ہی یہ ہے:

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پا دل و پاک باز

انہوں نے ہمیشہ اپنے کو دم جستجو گرم رکھا۔ظاہر ہے کہ ایسی شخصیتوں کا مزاج نفسیاتی طور پر شاہانہ ہو جاتا ہے اور وہ:

گاہے بسلامے بر نجند
گاہے بدشنامے خلعت دہند

رہتے ہیں۔مولینا کی پوری زندگی اسی والہانہ مگر وارفتہ کیفیت کی غماز رہی۔انہوں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ بھی ساری سہولتوں اور فراغتوں کے میسر ہونے کے باوصف راہ حیات کی آبلہ پائیوں میں صرف کیا۔انہوں نے کتابت سیکھی تو اس کا بہترین مصرف بھی سیکھا۔ اور دینی کتب کی کتابت کو مشعل راہ بنایا۔آج کمپیوٹر کا دور ہے لوگ کتابت کی باریکیوں سے نا آشنا ہیں لیکن کاتب وخوش نویس جس طرح اپنی آنکھوں سے خون دل ٹپکاتا ہے آج اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

مولینا تدریس سے وابستہ ہونے کے بعد بھی اس مشغلہ سے دست کش نہ ہوئے اور کبھی کبھی سخت ترین حالات میں بھی انہوں نے ناممکن العمل صورتحال کو اپنی قلم کی گرفت سے سہل اور آسان بنا دیا۔

وہ زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل تھے۔چنانچہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا ہو یا مطبخ سے کھانا لانا ہو یا لباس کا انتخاب ہو...... ان کے مزاج میں جو نفاست اور شائستگی اور جو سلیقہ تھا اس کا اظہار ہوتا تھا۔شاید ان سے بہتر اور کسی نے بھی میر صاحب کے اس شعر کو نہیں سمجھا تھا۔

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے

اور یہاں بے اختیار یہ لکھنے کو دل چاہتا ہے کہ اسی سلیقہ نے ان کو ناکامیوں سے کام لینے کا وصف عطا کیا تھا۔

تمنائے دل کے لیے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

اور یہ سلیقہ فن تعمیر ہو یا جشن صد سالہ کا اہتمام ہو یا کیمپ دارالعلوم کا قیام ہو ہر طرف جھلکتا رہا۔ یہی سلیقہ عمل زندگی میں کہیں کہیں ان کیلئے مضرت رساں بھی ہوا شاید انہیں یہ خیال رہا ہو گا کہ وضعداریاں، مروتیں، محبتیں، مقصد کی خاطر اصولوں میں استقامت اور لگن، خلوص، اور ذہنی دیانت داری کے ساتھ کام کرنا ہی سلیقۂ زندگی ہے، جبکہ عام لوگوں کی نظر میں شاید یہ معیارات نہ تھے۔

شخصیت کے سلسلہ میں یہ پہلو بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس کے سارے خدوخال اس کے عمل کی بناء پر متعین ہوتے ہیں۔ اور جو بھی عمل انجام پاتا ہے اس پر غور کرنا چاہئے کہ وہ :

(۱) منصوبہ بند طریقہ سے ارادہ کا نتیجہ ہے　　یا

(۲) اضطراری طور پر عمل میں آیا ہے

(۳) جو فیصلے کئے گئے ہیں یا جو راہیں منتخب کی گئیں ہیں ان کی بنیاد جذباتی رشتے ہیں یا جذباتی تعلق یا ان کے پس منظر میں منطقی اور استدلالی پہلو رہا ہے۔

ان نکات کی روشنی میں میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گی کہ اپنی تمام زندگی میں دو مولینا وحید الزماں نظر آتے ہیں، ایک وہ جن کے فیصلے جذباتی اور اضطراری ہیں اور دوسرے وہ مولینا جو سوچ سمجھ کر منصوبہ بند طریقے سے تنازع للبقاء کے میدان میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ مالی وسائل نہیں ہیں تو کتابت کے ذریعہ اپنا اور اپنے عیال کے لیے رزق فراہم کرنا، مختلف کاموں کو اختیار کرنا، انہیں ترک کرنا اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں منصوبہ بند طریقہ سے کتابوں کی تیاری انکا خاکہ بنانا انہیں لکھنا...... یہ وہ سارے عوامل ہیں جن کی روشنی

میں مولینا کی شخصیت کی وہ جہت سامنے آتی ہے جس کے لیے سوائے توصیفی کلمات کے کچھ اور نہیں لکھا جا سکتا۔ ایک شخص ہے جو نامساعد سنگین حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔ جتنے بھی جھٹکے لگیں کتنے ہی حوصلہ شکن پہلو سامنے آئیں وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے سرگرم رہتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسے حالات میں بھی Positive Approach یا مثبت طرز فکر کو اپناتا ہے کہیں بھی ان کا رویہ تخریبی یا منفی نہیں ہے۔

لیکن دوسری طرف مولینا کے یہاں بہت سارے کام Impulsive یا ہیجانی انداز میں انجام پاتے ہیں نفسیات میں کسی شخصیت پر کسی واقعہ کا ہیجانی اثر اپنا ردعمل اسی طرح ظاہر کرتا ہے۔ کوئی ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا خوش ہو گئے نتائج اور عواقب کی پرواہ نہ کی اور میدان میں کود پڑے ہندوستانی سیاست میں پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت Impulsive تھی ان کے ہر کام کے پیچھے جذباتیت کارفرما رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پنڈت جی کو گاندھی جی جیسی شخصیت سنہ ۱۹۴۸ء تک کنٹرول بھی کرتی رہی اور ان کے احباب میں ان سے سب سے زیادہ قریب مولینا ابوالکلام آزاد کا منطقی فلسفیانہ اور ٹھنڈا مزاج انہیں بہکنے نہیں دیتا تھا۔ ان دونوں شخصیتوں کے جانب سے ہر طرح کی پابندیوں کے باوجود پنڈت جی کا ہیجانی مزاج ہندوستانی سیاست میں جہاں محبوب رہا وہاں معیوب بھی رہا۔

مولینا وحید الزماں کو پنڈت نہرو جیسی زندگی نہیں ملی تھی کیرانہ کا ماحول مشرقی مزاج اور متوسط طبقہ کا جاگیردارانہ نظام ہی ان کی کل کائنات تھی۔ انہیں ایسے رہنما اور احباب بھی نہیں ملے تھے۔ جو روک ٹوک اور پابندیوں کے ذریعہ ان کی شخصیت کے ہیجانی رخ کی تہذیب و تربیت کرتے۔ سارے فیصلے وہ خود ہی کرتے تھے چونکہ ان کا مزاج تعمیری تھا اس لیے ان فیصلوں سے زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا۔

مثلاً وہ مدرس تھے تدریس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ تعمیرات کا بھی ماہر ہو خصوصاً ماہر ادبیات کے لیے یہ سارے تعمیراتی رخ غیر ضروری ہیں لیکن مولینا کو دلچسپی تھی اور

وہ بلا تکلف تعمیرات کی طرف متوجہ ہو گئے چونکہ فیصلہ جذباتی تھا اس لیے آگے چل کر کسی نے یہ نہیں کہا کہ خشت و سنگ سے جو سرخی جھلک رہی ہے اس میں وحید الزماں کے قطرۂ خون جگر کی بھی سرخی شامل ہے۔ بلکہ بہت بعد میں یہی یہ اعتراض شروع ہو گیا کہ گارے میں سمنٹ ملانے کے بجائے مٹی اور بالو سے بھی کام چل سکتا تھا......!!!

یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی دوسری شخصیت جو جذباتی اور ہیجانی نہ ہوتی وہ اس کام کو کس طرح کرتی؟ تو پہلی بات یہ کہ مدرس ادبیات کو صرف رہنمایانہ خطوط پر کام کرنا چاہیے تھا اپنی وابستگی اس حد تک نہیں رکھنی چاہیے تھی کہ مدرس ادبیات کے بجائے انجینئر سمجھ لیا جائے اور مقامات حریری اور متنبیؔ کے کلام پر استدراکات کے بجائے مزدوروں کے حساب کا گوشوارہ جانچنے لگے!

مولینا نے بہت فیصلے اسی طرح کئے مثلاً میں اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں اور میری طرح کے تقریباً تمام طالب علم کا یہی طرز فکر ہوگا کہ قاری طیب صاحب مرحوم و مغفور جیسی مقدس اور برگزیدہ اور "ولی" شخصیت سے اختلاف کا سبب کیا تھا؟ پھر ان اختلافات کو اتنی ہوا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی کچھ عرصہ پہلے جشن صد سالہ کا ہمہمہ تھا اور اس میں اپنی صحت کی پرواہ کئے بغیر اتنا انہماک اور دلچسپی...... اور یہ سب' حضرت قاری صاحب کے دور اہتمام میں تھا اور دوسری طرف وہی قاری صاحب بادیدۂ پرنم استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گئے۔

ایک واقعہ اور عرض کرنا ہے دیوبند میں شہرت ہوتی ہے کہ مولینا وحید الزماں ایک جلسہ کو خطاب کرنے والے ہیں مولینا نے اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی حالانکہ انہیں اس جلسہ کی کوئی اطلاع بھی نہیں تھی جلسہ ہوتا ہے اور مولانا اس جلسہ میں پہنچ جاتے ہیں عوامی نفسیات کے ریلے میں بہتے ہوئے تقریر کرتے ہیں اور وہی تقریر ان کے لیے جانستاں بن جاتی ہے۔

انکی پوری زندگی میں اس طرح کے واقعات اکثر ملتے ہیں اور انکے جذباتی فیصلے بھی نظر آتے ہیں اور اسی لیے انکی شخصیت کا یہ پہلو "سیمابی" کہا جائیگا۔ اسی سیماب وشی نے انہیں نقصان بھی پہنچایا اور ان کیلئے مخالف بھی پیدا کئے اور مخالفت کرنے والوں کو ایک ہتھیار یا بہانہ بھی مل گیا۔

خاندانی اعتبار سے بھی اور بچپن کی جو زندگی دیکھی جا چکی ہے اس کے لحاظ سے بھی مولینا محرور المزاج بھی کہے جا سکتے ہیں اور جہاں ایک باڈی بلڈ رقسم کے لڑکے کی پٹائی سے ان کا رعب و دبدبہ اور جلال ظاہر ہوتا ہے وہیں محرور المزاجی اور غصہ کی وہ کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے جس میں انسان کو اپنے ہاتھوں پر قابو نہیں رہ جاتا۔

یہ وہ چھوٹے چھوٹے نقطے ہیں جن سے مولینا کی سیمابی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اسی پہلو نے انکے یہاں وہ استواری کیفیت نہ پیدا ہونے دی جو شخصیت کا لازمی عنصر ہوتی ہے۔

مولینا وحید الزماں انسان تھے اور بشری کمزوریوں کی طرف اسی لیے اشارہ بھی کر دیا گیا کہ ہیرو پرستی کا الزام نہ لگایا جا سکے۔ ان کے یہاں خامیاں اور کمیاں نسبتاً شاذ ہیں اور خوبیاں زیادہ ہیں۔ وہ عربی ادبیات کے صرف مدرس نہ تھے بلکہ عربی زبان وادب کے سچے عاشق تھے ان کا عشق صرف ان کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ اقبال کے لفظوں میں۔

میرے قافلے میں لٹا دے اسے

لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

وہ یہ چاہتے تھے کہ ہر طالب علم عربی کے مزاج (ETHOS) کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار دے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ایک کامیاب مدرس رہے۔ جتنے بھی ان کے شاگرد تھے انہوں نے مولینا کے پڑھائے ہوئے ہر سبق کو حرز جاں بنا کر رکھتے تھے۔

تدریس کے سلسلہ میں وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ مدرس کو صرف پڑھانا نہیں چاہئے بلکہ "لکھانا" بھی چاہئے اور لکھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو کوئی مضمون املا کراتا رہے بلکہ لکھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود لکھ کر ایک طرف تو اپنے طلاب کے دائرے کو وسعت دے، اپنے افکار و خیالات اور اسلوب وطرز تحریر کی دولت کو عام کرے، دوسری طرف ان کے سامنے آپ نمونہ بھی پیش کرے کہ طالب علموں میں ترغیب تحریص وتشویق تحریر پیدا ہو، وہ لکھیں...... اس طرح کی تمرین ان کی آئندہ زندگی کے لیے نہایت خوشگوار نتائج پیدا کرے گی۔

راقمۃ الحروف نے نہ مولینا سے درس لیا نہ انہیں دیکھا لیکن ان کی تحریروں میں جس طرح ان کی شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک مثالی مدرس کی ہے اور یہ مثال مدرس روایتی ملائے مکتبی سے بالکل الگ نظر آتا ہے۔

مزاج میں نفاست، شائستگی، سلیقہ، حسن ترتیب، اور وہ سرسید والا ماڈرن ازم کہ اپنی اسلامی شناخت پر کوئی نشان نہ لگنے پائے لیکن اگر مغرب میں کچھ بہتر ہے تو اسے اپنا لیا جائے۔ ان کا یہ طریقۂ کار ان کی حیات کے ہر رخ میں نظر آتا ہے، اپنے شاگردوں کے ساتھ حسن سلوک، کام کرنے کا طریقہ اور تدریس و تنظیم میں ہم آہنگی...... یہ وہ نکات ہیں جنہوں نے بحیثیت مدرس مولینا کی زندگی کو مثالی بنا دیا۔

وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جو سبک ساران ساحل رہنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ طوفانوں سے ٹکرانے کا عزم و حوصلہ رکھتے تھے انہوں نے کسی منزل پر بھی گریز یا فرار کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ حوادث سے ٹکرانا ان کا مزاج رہا مگر یہ تصادم منفی رخ کے ساتھ بہت کم رہا۔ مثبت پہلو کے ساتھ زیادہ رہا اور اس کی قیمت بھی انہوں نے ادا کی چنانچہ جشن صد سالہ کے موقع پر ان کا کام کرنے کا طریقہ اس کے بعد انتظامیہ سے تصادم اور پھر نئے انتظامیہ میں خود ان کی شمولیت اور پھر بتدریج ان کا الگ کیا جانا یہ سب گوشے اپنی جگہ پر رہے، وہ اصولوں کی خاطر لڑے۔ مگر جب ان کی شخصیت نشانہ بنی تو اپنی ذات کے سلسلہ میں انہوں نے آخری لمحات میں سب کچھ بڑے صبر و سکون سے برداشت کیا۔ اس موقع پر ان کے کردار کا یہ رخ یادگار ہے کہ وہ ہر طرح کے تصادم سے گریز کرتے رہے اور جو کچھ بھی ان کے بارے میں ارباب حل و عقد فیصلے کرتے رہے اسے چپ چاپ قبول کرتے رہے۔ ہاں آخری لمحات میں جب ان کے اقتدار پر نہیں بلکہ ان کی تدریس پر ضرب پڑتی ہے اور انہیں دار العلوم سے الگ کر دیا جاتا ہے تو وہ خاموش نہیں رہ پاتے۔ ان کے وضاحتی بیانات صرف دفاعی حیثیت

رکھتے ہیں، کہیں کہیں ضرور جارحانہ کیفیت یا طنزیہ انداز نظر آتے ہیں۔جس سے میں نے بھی صرف نظر کیا ہے اور آپ بھی صرف نظر کریں۔

وہ اپنے طلبہ میں بے حد ہر دلعزیز اور مقبول تھے تحائف وہدایا قبول فرماتے تھے اور یہ تحائف مٹھائی کے ڈبوں یا پھل کی ٹوکریوں تک محدود نہ تھے ان میں کار خریدنے تک کی رقم شامل ہوا کرتی تھی، ساتھ ہی ساتھ اشاعتی پروگرام بھی اور اس منصوبہ کے سارے اجزاء پر بھی طلبہ کی نظر ہوا کرتی تھی۔وہ مالی طور پر خدمت استاد کے لیے تیار رہا کرتے تھے۔

ان کے علمی وادبی کارناموں میں کچھ کتابیں ہیں جو ابتدائی درجات سے متعلق ہیں اور کچھ تشریحی کتب ہیں مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی لغات ہیں۔

ادبی شخصیتیں لغات سے گریزاں رہتی ہیں اور اس لیے گریزاں رہتی ہیں کہ مدون لغت اپنے انداز سے نشانات کے معانی متعین کرتا ہے۔دال کو مدلول تک لے جانا اشارے کو مشار الیہ تک پہنچانا اور لفظ کے استعمال پر روشنی ڈالنا یا حالات کے بدلنے پر معانی کی تبدیلی کی نشاندہی کرنا مدون لغت کا کام ہے۔لیکن ادیب کہتا ہے:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا اس کا خیال ہے کہ لفظ کے امکانات ہوتے ہیں لفظ کی سمت وجہت ہوتی ہے حروف دیکھنے میں کمر خمیدہ بوڑھیا کی طرح دال (د) بن کر نظر آتے ہیں اور بل کھائی ہوئی چوٹی کی طرح ہم (م) نظر آتی ہے وہ الفاظ کے بصری اور سماعی پیکر پر زور دیتا ہے اس طرح ادیب تخیل کا رشتہ زمین سے جوڑتا ہے لیکن لغت نویس زمین ہی پر چلتا پھرتا ہے۔

یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ زمینی حقائق سے آشنا ہو لغت پر اس کی گرفت مضبوط ہو لیکن تھوڑا سا تخیل اور لفظ کے امکانات اور اس کی وسعت اور الفاظ کو نئے معانی دینے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔

مولینا نے اپنی لغات کے ذریعہ اس روایت کو آگے بڑھایا جو عربی میں چلی آرہی تھی اوران کی روایت کی یہ توسیع ہندوستان میں ایک نیا نشاں منزل بن گئی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ انہوں نے عربی دنیا میں پرچم ہندی کو سربلند رکھا لوگ نوائے حجاز پر فریفتہ تھے۔ مولینا نے ثابت کیا نوائے ہند میں بھی حجازی لئے ہو سکتی ہے!

مولینا وحید الزماں کیرانوی ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ معمولی سے معمولی نکتہ پر نظر رکھنا اور ہر جزو میں کل کو دیکھنا اور قطرہ میں سمندر کی تلاش بھی ان کی ایک خصوصیت تھی، لیکن میری نظر میں ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ سمندر سے پانی کی بوند نکال کر اسے سمندر بنا دیتے تھے اور کل سے جزو کو نکال لینا اور پھر اس جزو کو کل بنا دینا ان کا کارنامہ تھا اور اسی لیے ان کے شاگردوں نے انہیں ''رجال سازی'' اور ''کردار سازی'' کی صفات سے متصف کیا ہے وہ ایک دیدہ ور مدرس تھے۔ انہوں نے عربی تدریس کی عزت و وقار میں اضافہ کیا اور ایک نئی جہت سے عربی تدریس کو آشنا کیا یہ سمجھایا کہ کتابیں پڑھانا یا کتاب خواں بنانا کوئی کمال نہیں ہے بلکہ صاحب کتاب بنانا اور کردار ساز بنانا مدرس کا سب سے بڑا منصب ہے۔

نظر ملی ہے تو اس کو بہار ساز بنا
نظر کو مائل رنگینیٔ بہار نہ کر

مولینا نے اپنے اکتسابات سے یہ ثابت کیا کہ وہ ایک اچھے انسان تھے اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ وہ پیکر نوری تو نہ تھے مگر بندۂ مولا صفات تھے شاید ایسے ہی افراد پر میرؔ صاحب کا شعر صادق آتا ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردہ سے انسان نکلتے ہیں

تمت بالخیر

فِهرِس المَراجِع وَالمَصَادِر

اسم المولف/المصنف	اسم الكتــاب	رقم
ڈاکٹر شبیر احمد	عہد مغلیہ میں عربی ادب کا ارتقاء	۱
	طبقات ناصری	۲
Prof. Childe	What happened in history	۳
	تاریخ فیروز شاہی ۱۱-۱۲	۴
	بساتین السلاطین ۵۳-۳۵۲	۵
	اخبار الاخیار ۲۲۷	۶
	تذکرہ علماء ہند ص ۲۳۶	۷
ڈاکٹر عبدالحلیم	عربی ادب کی تاریخ	۸
	مجموعہ قلمی خطوط	۹
	نقش حیات	۱۰
ڈاکٹر سید عابد حسین	ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	۱۱
	انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۷/اپریل ۱۸۸۰ء	۱۲
ڈاکٹر تارا چند	تحریک آزادی ہند (چہارم)	۱۳
رام گوپال	Indian Muslim	۱۴
مولانا نور عالم خلیل امینی	وہ کوہ کن کی بات	۱۵
دیوبند	ترجمان دار العلوم مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر	۱۶

DR. MEHJABEEN AKTHER
Associate Prof. of Arabic
& Head O.U.C.W

LIST OF PUBLISHED BOOKS

No.	Name of the books	Year/Place	Published
1	التلخيص العربي للناشئين (الجز الثاني) Al Arabiyatu Lil Nasheen part II Revised & Edited for B.A. Students C.L. 1st year	1998+05+10 Hyderabad	Compiled
2	نتائج الفكر الادبي للاديب امين الريحاني Nataijul Fikrul Adabi Lil Adeeb Ameenur Rahani	1998+99 Hyderabad	Published
3	Eleven Surahs of the holy quran for Intermediate 2nd year students	2001+2005 Hyderabad	Compiled
4	المنتخبات من النثر والنظم (طلاب بی اے) Selected lessons from prose & poetry for B.A. 3rd year optional students	2002+05+10 Hyderabad	Compiled
5	دکنی مثنویوں میں مذہبی کردار Daccani masnavee main mazhabi kirdar	2003 Hyderabad	Published
6	مساهمة الشيخ محمد عبده في الادب العربي Contribution of "Shaik Mohd. Abdahu" to arabic literature	2004 Hyderabad	Published
7	العبرة مما جاء في الغزوة والشهادة والهجرة Alibratu mimma jaa fil gazwa wal shahadata wal hijri by nawab siddiq hasan khan	2005 Bhopal	Manu script Edited
8	عربی ادب کا امام ۔ جاحظ Arabi adab ka imam "Jahez" - An analytical study	2002+2007 Hyderabad	Published
9	الامثال الحديث وجوانبها الادبية واللغوية والتوجيهة Al Amsal fil hadeesa nabawi	2009 Hyderabad	Published
10	مولانا وحید الزماں کیرانوی ۔ حیات وخدمات Moulana Waheeduzzama Keeranwi Life and Work	2011-12 Hyderabad	Published
11	تلخیص النحو (طلاب بی اے) Talkhees-ul-Naho	2008+10+11 Hyderabad	Published
12	تلخيص البلاغة Talkhees-ul-Balagha	2008+10+11 Hyderabad	Published
13	Easy Arabic grammer in English for school college & P.G. students	2008+10+11 Hyderabad	Published

مولانا وحید الزماں کیرانوی ؒ کی غیر مطبوعہ ڈکشنری "القاموس الموضوعی" کے کتابت شدہ مسودہ کا عکس۔

ملبوسات

(کپڑے وغیرہ)

قماش : بن سلا کپڑا (ہر قسم کا) ج اقمشۃ

مَلابِس، ثیاب : کپڑے (سلے ہوئے)

ثیاب جاھزۃ : تیار شدہ کپڑے

ملبوسات : پہننے کی چیزیں کپڑے وغیرہ

لباس : کپڑے، ڈریس ج البسۃ

فاخِر (شاندار) ساذج، بسیط (سادہ) ثمین (قیمتی) رخیص (سستا) خِلق (پرانا) جدید (نیا) بالی (بوسیدہ) مُمَزّق (پھٹا ہوا) مرقوع (پیوند لگا ہوا) مخیط (سلا ہوا) ابیض (سفید) ملوّن (رنگین) مُغلّس (دھاری دار)۔ مُطَرّز (پھولدار) مصبوغ (رنگا ہوا) مغسول آ بِیّا (دُرائی کلین کیا ہوا) نظیف (صاف)

وَسِخ (میلا) قذِر (گندا) طاھر (پاک) نجِس (ناپاک) خشن (کھردرا) ناعم (ملائم) سمیک، غلیظ (موٹا) رقیق (باریک) مَکوِیّ (پریس کیا ہوا) ضیّق (تنگ) فضفاض (ڈھیلا) تامّ، مطابق للجسم (فٹ)

حریریّ : ریشمین کپڑے

قطنیّ : سوتی کپڑے

صُوفی : اونی کپڑے

کَتّانیّ : فریا سلک کے کپڑے

بَدْلۃ، حُلّۃ : سوٹ، کپڑوں کا جوڑا ج حُلَل

لَبِسَ ـ لُبْسًا : کپڑے پہننا

خَلَعَ ـ خَلْعًا : کپڑے اتارنا

خاط ـ خیاطۃ : سینا

دار المدرسین، جس کی تعمیر مولانا وحید الزماں صاحب معاون مہتمم دار العلوم کی زیر نگرانی شروع ہوئی۔
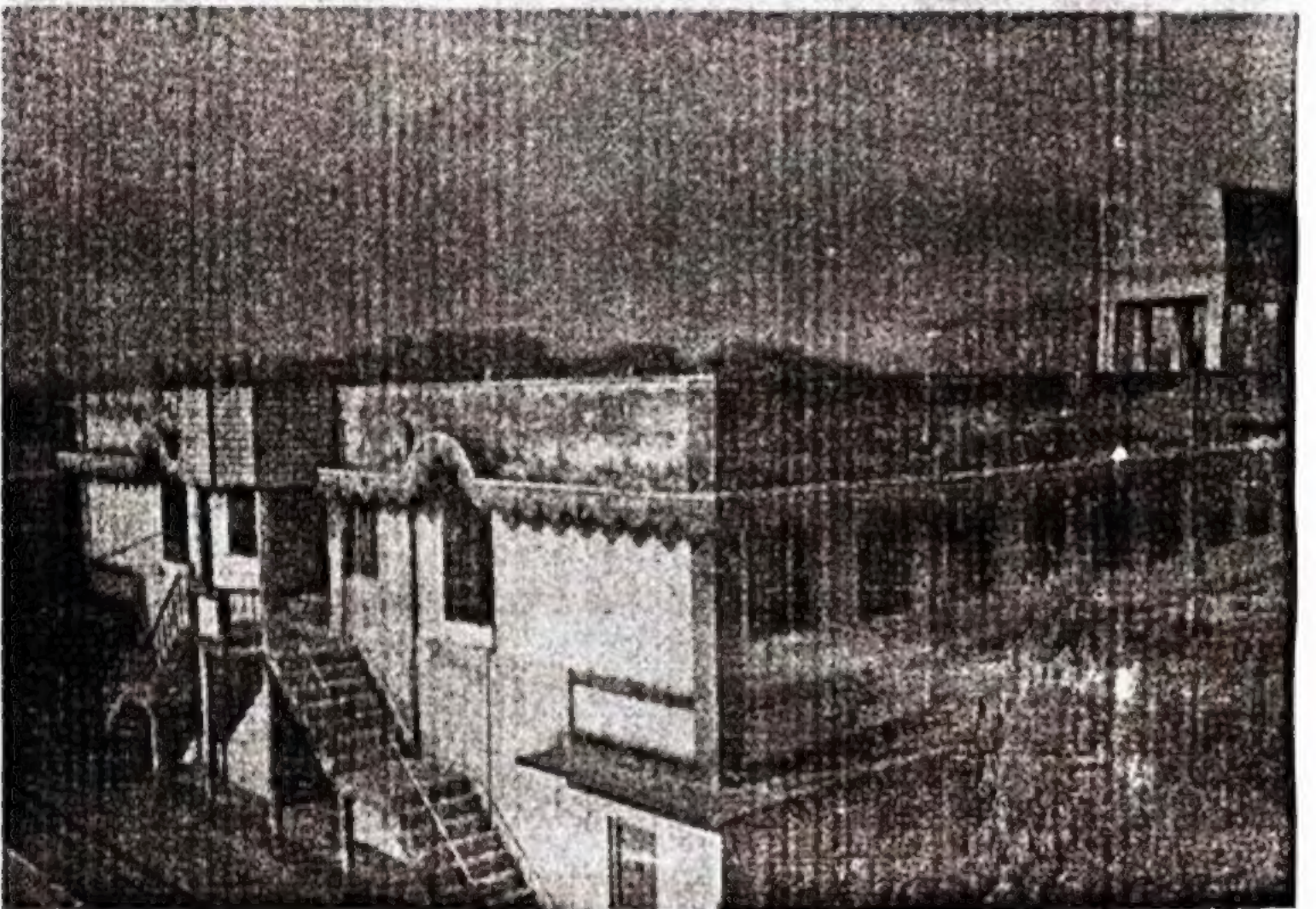
رواقِ خالد (خالد ہاسٹل) جس کی تعمیر مولانا وحید الزماں صاحب کی نگرانی میں انجام پذیر ہوئی۔
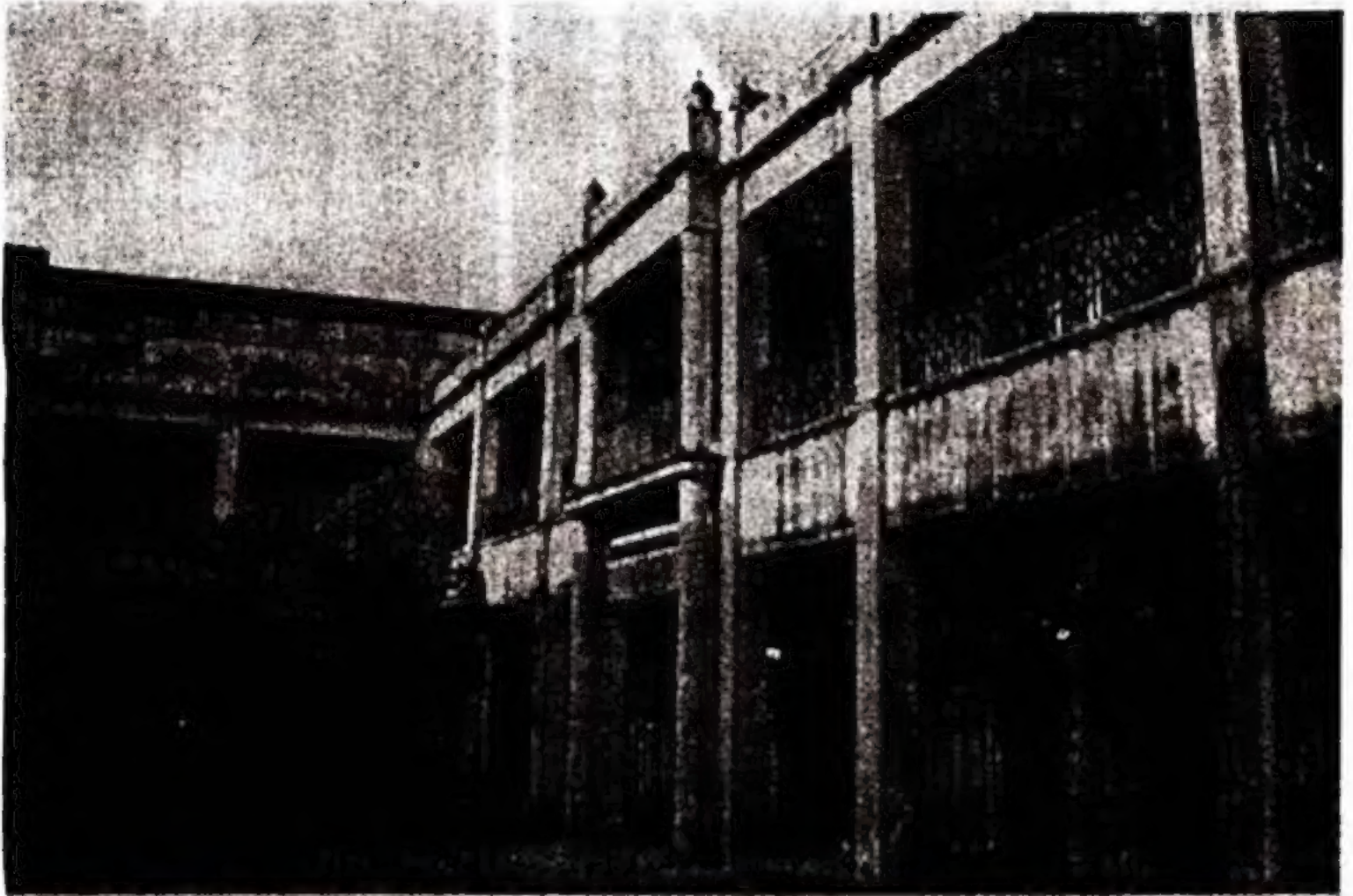
کتب خانہ دارالعلوم کا دو منزلہ برآمدہ جو اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا وحید الزماںؒ صاحب کی زیرِ نگرانی تعمیر ہوا۔

دفترِ تعلیمات کی جدید عمارت جو اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا وحید الزماںؒ صاحب کی زیرِ نگرانی تعمیر ہوئی۔

MOULANA WAHEEDUZ-ZAMA KEERANVI

LIFE AND WORK

DR. MEHJABEEN AKTHER

Osmania University